تخلیقی ادب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز
اسلام آباد

Scanned by CamScanner

تخلیقی ادب

شمارہ - ایک

مدیرِ اعلیٰ:

بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان

ریکٹر

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر رشید امجد

عابد سیال

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Scanned by CamScanner

مجلسِ مشاورت:

ڈاکٹر محمد آفتاب احمد

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

پروفیسر رفیق بیگ

مجلّہ	....	تخلیقی ادب
سرورق	....	منزہ جاوید
اشاعت	....	مارچ دو ہزار چار
پریس	....	نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Scanned by CamScanner

ترتیب

اداریہ — بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان — 7

نعت — عبدالعزیز ساحر — 9

□

قیدی سانس لیتا ہے — ڈاکٹر فرمان فتح پوری — 10

فراق شناسی اور تحقیق کے مسائل — ڈاکٹر نوازش علی — 14

خوشبو کی سفیر — ادیب سہیل — 37

سندھی ادب کے عہدِ جدید میں فکشن کے میلانات ور جحانات — سید مظہر جمیل — 60

میر افکری و تخلیقی عمل — جلیل عالی — 107

مشرق و مغرب کے ثقافتی روابط اور کلامِ اقبال میں ان کا عکس — ڈاکٹر سعید بزرگ بیگدلی

ڈاکٹر گوہر نوشاہی — 116

کھوار پر فارسی کا اثر — بادشاہ منیر بخاری — 122

میر کا نشاطیہ لب ولہجہ — عطاء الرحمٰن قاضی — 141

اردو زبان پر فارسی کے اثرات — محمد کیومرثی — 152

ذکرِ الٰہی کا مقصد — ڈاکٹر علی انور — 162

□

کیوں دکھ اوڑھ کے بیٹھے ہو — وزیر آغا — 185

ایک نااطاعت پسند کا نوحہ — آفتاب اقبال شمیم — 186

خیال، کبوتر اور چڑیا — تبسم کاشمیری — 188

عراق آشوب — احسان اکبر — 190

کیا اب میری باری ہے — نصیر احمد ناصر — 195

Scanned by CamScanner

راک وال	نصیر احمد ناصر	195
ایک نظم	علی محمد فرشی	196
بڑا چکر لگائیں	رفیق سندیلوی	198
ہم حیراں ہیں	انوار فطرت	200
انوالومنٹ	زاہد منیر عامر	202
انعکاس	پروین طاہر	206
بدگمان	سعید احمد	207
ناممکن کا ممکن	داؤد رضوان	208
رات خاموش ہے	ناہید قمر	209
خواب کی چتا پر ماتم کرتی تعبیر	ارشد معراج	211
پائی گدلا مت کرنا	ڈاکٹر سرفراز ظفر	212
بہاررت میں	الیاس بابر	214
اب کیا	سیدہ نوشین فاطمہ	215
تو مرے لیے کیا تھی	صائمہ نذیر	216
پچھلے پہر کی ہوا	فائزہ صادق	217
جیون صحرا میں اتری ایک شام	سیما کوثر	218
کاش!	تبسم ارشد	219
دو باتیں	شمائلہ ناز	220

□

نظمیں

□

گرما گرم	جلیل عالی	221
گم شدہ لمحوں کی تلاش	وقار بن الٰہی	223
	اعجاز راہی	231

تجلی	احمد جاوید	241
ٹوٹا ہوا ٹرک	انور زاہدی	248
بدن برزخ	محمد حمید شاہد	257
سفید پھولوں کے اس طرف	مبین مرزا	269
اندھا کنواں	امجد طفیل	293
سایہ کہانی	محمد عاصم بٹ	297
صحرا کی رات	ارشد چہال	306
پکے کوٹھے	بشریٰ پروین	392
مندری	حافظ محمد شفیق انجم	316
ڈھلتے سورج کا غم	میمونہ فاطمہ	320
بگل والا	رشید امجد	328

❑

انمٹ خواہش (ترکی افسانہ)	عمر سیف الدین/ عابدہ حنیف	335
قصیدہ دالیہ (سبع معلقات (عربی) سے)	طرفہ بن العبد البکری/ اکرام جمالی	342

❑

مسافرت تھی کسی دشتِ بے خیالی کی	توصیف تبسم	345
اک جبر کہ رستوں سے گزرنے نہیں دیتا	پرتو روہیلہ	346
کوئی سبب ہے جو تاریک شب ہوئی ہے میاں	افتخار عارف	347
تارِ شبنم کی طرح صورتِ خس ٹوٹتی ہے	افتخار عارف	348
نئے امکاں جگائے، اک ایسی راہ نکلے	جلیل عالی	349
اگرچہ دھیان ادھر سے ادھر پھراتا رہا	اکبر حمیدی	350
اور اب سوچتا ہوں کہ ایسا نہ ہوتا	خالد اقبال یاسر	351
غبارِ نور ہے یا کہکشاں ہے یا کچھ اور	علی اکبر عباس	352
کبھی زمیں، کبھی آسماں میں تیرتا ہوں	خاور نقوی	353

Scanned by CamScanner

مدام خود میں رواں سلسبیلِ وقت ہوں میں	سرور کامران	354
الفت کا ترجماں ہوں ذرا دیکھ تو سہی	آفتاب ثاقب	355
آنکھوں سے بے حساب پلاتا ہے آج کل	آفتاب ثاقب	357
ضبط کا مرحلہ اظہار تک آ پہنچا ہے	اختر عثمان	358
بہ روئے ہست و عدم سیلِ نور آیا ہے	اختر شاد	359
اتنی کھائی ٹھوکریں ہیں در بدر کی	ڈاکٹر ملک سکندر حیات خیل	360
شہر کچھ ایسے پرایا ہوا لگتا ہے مجھے	کرنل سید مقبول حسین	361
یہ وقفۂ بہار جواب کے برس میں ہے	ارشد ملک	362
اس قدر کیں جذبۂ الفت کی پردہ پوشیاں	نور فاطمہ نور	363
مکان دیکھے تھے کچھ خواب میں بکھرتے ہوئے	اشرف سلیم	364
عشق عہدِ بے وفا میں بے نوا ہو جائے گا	میجر غلام نبی اعوان	365
سائے اب شام سے بھی گہرے ہیں	ڈاکٹر نجمہ خان	366
آج تمھاری سوچ کا دھارا کیسا ہے	محمد ادریس چیمہ	367
بس اک میری بات نہیں تھی سب کا درد دسمبر تھا	محمد افضال بٹ	368
اندھیاروں کی بات الگ ہے، اندھیاروں میں سائے بہت	جاوید اقبال راجا	369
کہا گیا، ہیں زمان و مکان میرے لیے	عابد سیال	370

□

جمیل ملک، فن و شخصیت	سجاد حیدر ملک	371
چراغ حسن حسرت، احوال و آثار	خواجہ غلام ربانی مجال	379
کسی حیران ساعت میں	میجر غلام نبی اعوان	386

□

قلمی معاونین

Scanned by CamScanner

اداریہ

ادب کی پنیری درس گاہوں ہی میں لگتی ہے۔ اچھی درس گاہیں صرف نصابی تدریس کے ادارے نہیں بلکہ ان کے اساتذہ اپنے طلبہ میں ادبی ذوق بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں تمام سکولوں اور کالجوں میں ہفتہ میں ایک پیریڈ ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے مختص ہوتا تھا جس میں ادب وشعر کے تذکرے ہوتے۔ طلبہ اپنی تخلیقات پیش کرتے اور اساتذہ ان پر رائے دیتے، یوں درس گاہیں فنی تربیت گاہ کا کردار ادا کرتیں۔ زمانے کے ہاتھوں یہ سلسلہ نابود ہوا۔ اب جدید ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کی باتیں ہوتی ہیں لیکن کیا ادب کی حیثیت اور ضرورت ختم ہوگئی ہے۔ ادب ایک ایسا وظیفہ ہے جو کردار میں شائستگی اور نفاست پیدا کرتا ہے۔ کسی نے درست کہا تھا کہ اگر افلاطون اپنی مثالی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا جو شائستگی کی خوشبوؤں سے نا آشنا ہوتا، چنانچہ آج کے جدید عہد میں بھی ادب کی ضرورت واہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ اسی اہمیت کے احساس کے تحت نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز کے زیرِ اہتمام ''تخلیقی ادب'' کا اجراء کیا جارہا ہے۔ ہمارا تحقیقی مجلّہ ''دریافت'' جامعہ کے تحقیقی کاموں کی رفتار کا ترجمان ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جامعہ کی تخلیقی سرگرمیوں کے اظہار کے لیے بھی ایک پلیٹ فارم مہیا کیا جائے، سو ''تخلیقی ادب'' کی صورت میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کی

Scanned by CamScanner

تخلیقات کو اشاعت کا ایک وسیلہ میسر آ رہا ہے لیکن ہم اسے صرف جامعہ تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ ملک کے نامور اہلِ قلم کی نگارشات بھی شاملِ اشاعت ہوں گی۔ اس سے ایک طرف تو ہمارے طلبہ بڑے اہلِ قلم کی نگارشات سے استفادہ کریں گے اور ان کو اپنی تخلیقی کاوشوں کے اظہار کا موقع ملے گا جو ان کی حوصلہ افزائی اور تربیت کا باعث ہوگا اور دوسری طرف ہمارے نامور اہلِ قلم نئی نسل کے تخلیقی معیار اور مزاج سے بھی آشنا ہو سکیں گے۔

بریگیڈیر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان

ریکٹر

Scanned by CamScanner

عبدالعزیز ساحر

نعت

اگر میں ہوں تو تری چشم اعتبار میں ہوں
وگرنہ کون ہوں میں اور کس شمار میں ہوں

ترا خیال مری زندگی کا محور ہے
ترے خیال کے باعث تو میں بہار میں ہوں

کبھی کبھی تو میں ایسے بھی خواب دیکھتا ہوں
کہ خاک جسم پہ اوڑھے ترے دیار میں ہوں

کبھی تو خواب کے لمحوں میں آپ اتریں گے
ازل کے روز سے مولا اس انتظار میں ہوں

ترے سہارے زمانے سے جنگ کرتا ہوں
اداس شام کا منظر ہے میں حصار میں ہوں

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

"قیدی سانس لیتا ہے"............میری نظر میں

اردو افسانہ پریم چند، سلطان حیدر جوش، اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے ہاتھوں وجود میں آیا اور ان افسانہ نگاروں کے مخصوص ثقافتی مزاج اور تہذیبی ذہن کے سبب ایک عرصے تک عموماً خیالی و تصوراتی لذت یابی کا وسیلہ بنا رہا۔ پریم چند کے استثنا، کے ساتھ، سبھی نے زبان و بیان کی دلآویزی اور تخیل کی گلکاری کی مدد سے اردو افسانے کو خوش رنگ و لذت افروز بنائے رکھا۔ بعد ازاں ترقی پسند افسانہ نگاروں کا گروہ سامنے آ گیا اور اس میں سے بیشتر نے حقیقت نگاری و جرأت اظہار کے نام پر واقعاتی اور رپورتاژی بیانات ہی کو افسانے یا کہانی کا نام دے دیا۔

بایں ہمہ کہانی میں کہانی پن کا عنصر کسی نہ کسی شکل میں شامل رہا۔ یہ سلسلہ کم و بیش گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی تک چلا، پھر ایک نظریاتی بھونچال آیا اور اردو افسانہ حسیت و جدیدیت کے جال میں پھنس گیا اور اس طرح پھنسا کہ ایک عرصے تک ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا۔ اس تڑپ نے آخر کار اپنا رنگ دکھایا اور کہانی کو سہارا دینے کے لیے، مطالعے کی ثروت مندی اور مثبت انقلابی و سماجی سوچ کے ساتھ کچھ ایسے لکھنے والے سامنے آ گئے کہ ان کے سہارے اردو افسانہ، تاریک گلیوں سے نکل کر تازہ دہی اور تازہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر آ گیا۔

زاہدہ حنا، دراصل اسی شاہراہ کی ایک مسافر ہیں، اس راستے پر چلنے والوں میں بہت سے دوسرے بھی ہیں لیکن زاہدہ حنا کی روش، ان سب سے الگ ہے اس کی وجہ زاہدہ کی زندگی کے حسی تجربے، شخصیت کے ترکیبی عناصر اور مطالعے کے موضوعات اوروں سے بہت مختلف ہیں۔ ان کا بچپن اور لڑکپن جس دینی اور ثقافتی ماحول میں گزرا، ان کی

ازدواجی زندگی جس نوع کے طلسم الم ونشاط میں بسر ہوئی اور پھر جس معاشی و معاشرتی جبر کے تحت انھیں قلم کی مزدوری کرنی پڑی، وہ صرف اور صرف زاہدہ حنا کے تجربے کا حصہ ہیں۔ ان تجربوں نے زاہدہ حنا کے افسانوں میں طرح طرح سے جگہ پائی ہے اور ان کے افسانوں کی بنت میں اہم کردار ادا کیا ہے چنانچہ منصفانہ تفصیل میں جانے کے لیے زاہدہ حنا کے افسانوں کی ان جملہ تحریروں، یعنی افسانوں کے ساتھ ساتھ، ان کے کالموں اور ان کے ادبی وتنقیدی مقالوں، خصوصاً اس نوع کے فکر انگیز و جرأت مندانہ مقالوں کو جس کی ایک تازہ مثال بہ عنوان ''زبان کا زخم'' ''ارتقا'' کے تازہ ترین شمارے میں ملتی ہے، نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ لیکن میں اپنی دلی خواہش کے باوجود اس وقت اپنی کمزور صحت اور خام مطالعے کے سبب زاہدہ حنا اور ان پر عادلانہ تجزیے کے ساتھ کوئی مفصل مضمون لکھنے سے قاصر ہوں، ''قیدی سانس لیتا ہے'' کی روشنی میں کچھ عرض کر رہا ہوں۔

عرض بھی کیا کرنا ہے، ''قیدی سانس لیتا ہے'' میں جو کچھ ہے اور اس کچھ کے بارے میں مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ سب کچھ تو خود زاہدہ حنا نے کتاب کے آغاز ہی میں حد درجہ بلیغ انداز میں اس طور پر کہہ دیا ہے

'' عورت ہونا ''

'' کہانیاں لکھنا ''

'' اختلاف کرنا ''

یہ ہمارے معاشرے کی تین خرابیاں ہیں اور میں ان کا ہی مجموعہ ہوں۔

ان خرابیوں کو، ان کے جملہ سماجی و سیاسی محرکات، عوامل و عواقب اور ان کے اثرات ونتائج کو اپنے افسانوں میں جگہ دینے کی کارگر کوشش میں زاہدہ حنا نے کیسا خون تھوکا ہے اور ''قیدی'' کو سانس لینا کتنا دوبھر ہو گیا ہے کو سمجھنا سمجھانا، محسوس کرنا اور محسوس کرانا، زاہدہ کے ناقدوں کا کام ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کام آسان نہیں کم از کم میرے لیے تو بہت مشکل ہے لیکن اس مشکل کو مجھ جیسے اردو افسانہ کے قاری کے

Scanned by CamScanner

لیے زاہدہ حنا نے یوں آسان بنا دیا ہے کہ انھوں نے ان مسائل کے حوالے سے ہمیں پلاٹ، پلاٹ کے پس منظر، کرداروں کی غلام گردش، کردار نگاری کی صنعت گری اور مقصد و نظریے کی بھول بھلیوں میں نہیں پھنسایا بلکہ کہانی پن کو اپنے فن کی اساس بنا کر دل کش بیانیہ اسلوب کے ذریعے اپنی بات ہمارے دلوں میں اتار دی ہے۔

''قیدی سانس لیتا ہے'' زاہدہ حنا کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں کل تیرہ کہانیاں ہیں، یہ کہانیاں آج کے انسان کے گھمبیر مسائل کی ترجمان ہیں، یہ کہانیاں نہ تو کسی کا دل بہلانے والی رومانی فضا میں سانس لے رہی ہیں اور نہ معاملات حسن و عشق کے چونچلوں کی عکاسی کر رہی ہیں بلکہ ان کہانیوں میں کہانی نگار کی مرتی ہوئی زندگی کی بچی دھڑکنیں سنائی دے رہی ہیں۔ یہ دھڑکنیں خواب آور لوریاں بن کر قاری کو سلاتی نہیں ہیں بلکہ اسے خواب سے چونکا کر زندگی کی نئی راہ پر گامزن کر دیتی ہیں۔ کہانی سننے والا سوچتا ہوا چلتا رہتا ہے اور قدم کو تیز تیز یوں اٹھاتا ہے جیسے وہ واقعی کہانی کار کا ہم سفر بن گیا ہے۔

ان افسانوں کے مطالعے سے ایک خاص بات جو مجھ پر منکشف ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ زاہدہ حنا نے مذہب، تاریخ، اساطیر اور ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے بلکہ ان سے بھر پور استفادہ کیا ہے اور حسب ضرورت اسے اپنے فکر و فن کا حصہ بنایا ہے، تبھی تو ان کے افسانوں میں انسانی نفسیات اور مسائل حیات کے رموز و نکات تاک جھانک لگائے رہتے ہیں اور قاری کو اپنی گرفت میں بھرپور طور لیے رہتے ہیں۔ اب اس زاویہ سے قیدی سانس لیتا ہے پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ جن امور کا ذکر اوپر آیا ہے وہ

زیتون کی ایک شاخ
شیریں چشموں کی تلاش
جل ہے سارا جال
زرد ہوائیں زرد آوازیں
رنگ تمام خوں شدہ

افسانوں سے یہ بھی عیاں ہے کہ زاہدہ حنا نہ صرف یہ کہ اپنے افسانوں میں زندگی کے کسی خاص پہلو، خاص زاویے یا رخ کو کسی خاص واقعے یا کردار کے حوالے سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں بلکہ اپنے قاری کو بھی اس کے نتیجے یا انجام یا کسی چونکا دینے والی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہیں چنانچہ ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ زاہدہ حنا اپنے لطیف و دلکش انداز بیان، اور نرم لہجے میں وہ سب کچھ نہایت خوبصورتی سے کہہ دیتی ہیں جو وہ کہنا چاہتی ہیں اور پھر اس کمال فن کے ساتھ کہ ان کے یہاں زندگی اور معاشرے سے متعلق چھوٹے چھوٹے اور معمولی تجربات گہرے فکر و احساس کی تہذیبی رویوں میں عشق پیچاں کی بیل کی طرح لپٹے رہتے ہیں اور پھر یہ بیل زاہدہ حنا کے قاری کے دل و دماغ کے لیے توجہ کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر نوازش علی

فراق شناسی اور تحقیق کے مسائل

فراق گورکھپوری بعض اہم شعراء کی طرح متنازعہ ادبی شخصیت تھے۔ ان کی پرستش بھی ہوئی اور ان پر اعتراضات بھی ہوئے۔ ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے بہت سے مضمون نگار نالاں بھی رہے۔ ان کی شاعری کی مدح بھی ہوئی اور ان کی شاعری کے خلاف بھرپور ردعمل بھی ہوا۔ لیکن عام طور پر فراق کے نقادوں نے ان کے بارے میں وہی کچھ لکھا جو فراق چاہتے تھے۔ یہ نقاد، فراق کی اپنی شاعری کے بارے میں لکھی ہوئی تحریروں کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے۔ یہاں فراق کی کامیابی اور نقادوں کی ''تنقیدی صلاحیتوں کی نارسائی'' کھل کر سامنے آتی ہے۔ فراق کے اپنی شاعری اور شخصیت کے بارے میں تخلیق کردہ طلسم کو توڑ کر اور ان کی تحریروں کو بھلا کر، ان کی شخصیت و شاعری کا مطالعہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اکثر و بیشتر نقادوں سے مجھ سمیت یہ کام پورے طور پر نہیں ہو سکا۔ ہر قدم پر فراق کی اپنی شاعری اور شخصیت کے بارے میں ان کی تحریریں راستہ کاٹ کاٹ جاتی ہیں لیکن تحقیق کی مصیبت یہ ہے اور اس کی تنگ دامنی کا حال یہ ہے کہ بعض مقامات پر بنیادی ماخذ بھی بہ امر مجبوری فراق کی تحریروں کو ماننا پڑے گا۔ چنانچہ فراق کے اپنے گرد بنے ہوئے طلسم اور ان کے کئی ایک نقادوں کی اڑائی ہوئی گرد کی وجہ سے حقیقی فراق کی تلاش ایک مشکل مرحلہ ہے تاہم گرد اور حصار سے باہر نکل کر ان کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لینے کی اپنی سی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

فراق ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کو ان کی شخصیت سے علیحدہ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کی شاعری پر جب بھی بات ہوگی، لازماً راستے میں ان کی شخصیت بھی آن کھڑی ہوگی۔ جیسے میر تقی میر کے سلسلہ میں ان کے والد علی متقی کی تعلیمات اور ''عم بزرگوار''

Scanned by CamScanner

میر امان اللہ کی تربیت کو مدنظر رکھے بغیر، میر کے تصور عشق کی وسعتوں اور گہرائیوں کو پورے طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح فراق کی شخصیت کو سمجھے بغیر ان کی شاعری کے بارے میں گفتگو کو مکمل طور پر نہیں سمیٹا جا سکتا۔ لیکن ایک نشست میں شخصیت اور شاعری کے تمام مراحل اور تحقیقی مسائل پر سیر حاصل گفتگو ممکن نہیں۔ لہذا شخصیت کے سلسلہ میں جو تحقیقی مسائل سامنے آتے ہیں، محض ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی شخصیت کو سمجھنے اور کسی حد تک ان کی شاعری تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

فراق اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور اپنی شاعرانہ جہات کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے کا فن بخوبی جانتے تھے۔ شخصیت کے حوالے سے اپنی بڑائی کا ایک حصار قائم کرنے کی کوششوں کے سلسلہ میں ان کا پی۔سی۔ایس اور آئی۔سی۔ایس کا واقعہ بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نقادوں کے بے شمار بیانات اور بذات خود فراق کی ان گنت تحریروں سے گریز کرتے ہوئے مختصراً یہ کہ 1919ء میں بی۔اے کرنے کے بعد فراق کو پی۔سی۔ایس یعنی ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ مجنوں گورکھپوری نے لکھا اور اس کی تصدیق شری یتی سہائے (فراق کے چھوٹے بھائی) نے راقم سے لکھنؤ میں گفتگو کرتے ہوئے کی کہ پروفیسر ایس۔سی۔ڈن نے گورکھپور کے انگریز کلکٹر سے باہمی مشورہ کے ذریعے فراق کو پی۔سی۔ایس میں نامزد کروادیا لیکن فراق پی۔سی۔ایس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ آئی۔سی۔ایس میں بھی منتخب ہوگئے تھے بلکہ ان کی پہلی پوزیشن بھی تھی۔ انہوں نے جہاں بھی پی۔سی۔ایس کی بات تحریر کی ہے وہیں لازماً اپنے آئی۔سی۔ایس ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کا محض ایک بیان دیکھیے جس میں انہوں نے اپنی قابلیت، اپنے انگریزی لب ولہجہ اور اپنی ذہانت کو کس انداز سے مشتہر کیا ہے۔

> ''بی۔اے کا نتیجہ نکلتے ہی مجھے ڈپٹی کلکٹر کے لیے گورنمنٹ نے منتخب کیا اور کچھ مہینوں کے بعد آئی۔سی۔ایس کے لیے میرا انٹرویو ہوا جس میں ... انگریز افسران میرے ممتحن

Scanned by CamScanner

تھے۔ مجھ سے ایک سوال یہ بھی کیا گیا تھا کہ کیا میں پہلے انگلستان ہو آیا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ میں تو اپنے صوبے سے بھی باہر نہیں جا سکا۔ اس پر سب نے بیک آواز کہا

"we don't believe you"

شاید اس سوال کے پہلے کے سوالوں کے جوابات میں نے اتنے اچھے دیے تھے کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ لب ولہجہ اور ذہانت اسی نوجوان میں پائی جا سکتی ہے، جو انگلستان رہ چکا ہو اور انگلستان میں تعلیم حاصل کر چکا ہو۔ پھر طرہ یہ کہ میرے ایک انگریز پروفیسر نے مجھے تحریراً یہ سند دی تھی کہ اس قابلیت کا نوجوان اسے آکسفورڈ میں بھی نظر نہیں آیا تھا''۔

[فراق گورکھپوری۔ ''یادِ رفتگاں''۔ مطبوعہ ''الہ آباد یونیورسٹی اردو میگزین''۔ فراق نمبر ۱۹۸۳ء۔ ص ۱۱۳]۔

ایک عجیب بات یہ کہ فراق کو اتنی اہم سند دینے والے انگریز پروفیسر کا نام یاد نہیں رہا۔ بہر حال کسی بھی شاعر و ادیب کا آئی۔ سی۔ ایس ہونا اس کے ادبی مرتبے کو بڑھانے کے کام نہیں آ سکتا۔ لیکن فراق بار بار یہ ذکر کر کے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ نرے شاعر و نقاد نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے زمانے کے قابل ترین اور اہم ترین آدمی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ پی۔ سی۔ ایس بھی ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ذہین اور پڑھے لکھے شاعر و نقاد ہیں لیکن وہ خود اشتہاریت کے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی قائل تھے اور شہرت کے لیے ہر قسم کی حرکت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اپنے آپ کو آئی۔ سی۔ ایس کہنے میں تو انہیں کوئی ابنارمل حرکت کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی شخصیت کے حوالے سے خود اشتہاریت بھی فراق شناسی کے مسائل میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ دوسری طرف وہ نقاد اور محققین ہیں جو فراق کی کسی بات کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور فراق شناسی میں کئی

Scanned by CamScanner

طرح ئی رکاوٹیں کھڑی کرتے اور مسائل پیدا کرتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد ان کے آئی۔ سی۔ ایس میں منتخب ہونے کو بالکل بے بنیاد قصہ بتاتے ہیں۔ پہلے ان کا ایک بیان دیکھیے پھر بات کو آگے بڑھاتے ہیں:

''فراق اس راز کو پا گئے تھے کہ ایک ہی بات اگر بار بار کہی جائے تو سننے والے کے دل و دماغ پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑ جاتی ہے.............. مثلاً وہ اپنا آئی۔ سی۔ ایس والا بے بنیاد قصہ اس وقت تک بھی سناتے رہے جب پوری تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو چکا تھا اور کئی رسائل اور اخبارات میں چھپ چکا تھا کہ یہ واقعہ نہیں ہے گپ ہے.............. آئی۔ سی۔ ایس والی بات کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے''۔

[جگن ناتھ آزاد۔ ''کچھ فراق کے بارے میں''۔ مطبوعہ رسالہ ''اوراق''۔ نومبر، دسمبر ۱۹۸۳ء۔ ص ۱۴۱]

اب ذرا ''پوری تحقیق'' کا قصہ بھی سن لیجیے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے دفتر میں جگن ناتھ آزاد صاحب سے اچانک میری ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی موجودگی میں ان کے مضمون کا ذکر چھیڑ دیا کہ آپ نے لکھا ہے کہ فراق اپنا آئی۔ سی۔ ایس والا بے بنیاد قصہ اس وقت تک سناتے رہے جبکہ پوری تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو چکا تھا کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس نہیں تھے۔ یہ تحقیق کب، کہاں اور کس نے کی۔ کیونکہ آپ نے انتہائی وثوق سے یہ جملہ لکھا ہے اور حوالہ دینے کی زحمت بھی نہیں کی کہ کون محقق تھے جنہوں نے یہ تحقیق کی تھی۔ جگن ناتھ صاحب فرمانے لگے کہ فراق اس سلسلے میں جھوٹ سے کام لیتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس نہیں تھے اور انہوں نے کبھی تردید نہیں کی۔ میں نے عرض کی کہ آپ نے ''پوری تحقیق کے بعد'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مجھے دوسروں کی تحریروں

Scanned by CamScanner

سے غرض نہیں کیونکہ بہت سوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس وقت تو مجھے آپ کے جملے سے
غرض ہے اور کیا فراق کی طرف سے یہی تردید کافی نہیں کہ وہ بقول آپ کے ثابت
ہو جانے کے بعد بھی اپنے آپ کو آئی۔ سی۔ ایس کہتے رہے۔ میرے جواب پر کچھ سوچ
میں پڑ گئے اور پھر کہنے لگے کہ کیا واقعی میں نے ''پوری تحقیق'' کے الفاظ استعمال کیے
ہیں؟ میں نے پھر ان کا جملہ دہرایا تو کہنے لگے میں ایسے ہی روا روی میں ''پوری تحقیق'' کا
جملہ لکھ گیا ہوں گا............ میں نے یہ گفتگو اپنے مقالے میں لکھنے کی ان سے اجازت طلب
کی اور انہوں نے کمال مہربانی سے اجازت مرحمت فرمائی............ جب قاطع قسم کی
تحریروں کا یہ حال ہو تو پھر فراق شناسی کے بعض مراحل مشکلات کے بغیر کیسے طے کیے جا
سکتے ہیں؟............ بہرحال یہ مسئلہ ہمیشہ لاینحل رہے گا۔ اپنے اپنے ماخذات کی روشنی میں
ہر کوئی اپنا فیصلہ دے گا۔ البتہ فراق کے بھائی شری پتی سہائے نے راقم کو بتایا کہ آئی۔ سی
۔ ایس والی بات فراق کہا کرتے تھے، مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ بعد
ازاں فراق ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے مستعفی ہو کر تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں فراق یونیورسٹی میں لیکچرر ہو چکے تھے۔ اپنی چال ڈھال، شکل و
صورت وغیرہ کے باعث وہ جلد ہی لڑکوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ان کی پوری شخصیت
اپنے انوکھے پن اور انفرادیت کی وجہ سے بے پناہ کشش کی حامل تھی۔ طلباء انہیں نہایت
استعجاب اور تحیر سے دیکھتے۔ استعجاب اور تحیر ان کی شخصیت کے علاوہ ان واقعات کا بھی
پیدا کردہ تھا، جو ان کے بارے میں یونیورسٹی میں زبان زد خاص و عام تھے۔ طلباء ان سے
ڈرے سہمے رہتے۔ وہ یونیورسٹی میں جدھر سے بھی گزرتے طلباء ان کے بارے میں چہ
میگوئیاں کرتے۔ ان کی شخصیت کے گرد مختلف واقعات نے ایک پراسرار ہالہ سا بنا دیا تھا۔
وہ اپنی جوانی ہی میں ایک افسانہ بن گئے تھے۔ لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی
ہوائیاں چھوڑتے رہتے اور جھوٹی سچی کہانیوں کو رواج دیتے رہتے تھے۔ اگرچہ ان
کہانیوں کو پھیلانے میں خود فراق کا بھی ہاتھ رہا ہے کہ وہ خود بھی ایک افسانہ بن جانا

Scanned by CamScanner

چاہتے تھے۔ غلط اور جھوٹے واقعات گھڑنے میں جہاں دوسروں کا ہاتھ ہوتا وہاں خود فراق بھی اپنے بارے میں غلط سلط باتوں کو ہوا دیتے رہتے تھے۔ صرف اپنے بارے ہی میں نہیں بلکہ دوسروں کے بارے میں بھی انکے تخیل کی جولانیاں اپنا رنگ دکھاتیں۔ تاکہ ان کا ''ذکر خیر'' ہر محفل میں ہو، ہر جگہ ان کے چرچے ہوں۔ وہ خود ایک اسطور بن جانا چاہتے تھے۔ ہر وہ واقعہ جو انہیں موضوع گفتگو بنائے، انہیں مرغوب ہوتا، چاہے اس میں سچائی کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ اس موقع پر ایک کہانی کی تردید کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت امرناتھ جھا جو ایف اے میں فراق کے ہم جماعت اور دوست تھے، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

> ''ایم اے میں جب فراق صاحب اور جھا صاحب پڑھتے تھے تو صدر شعبہ نے بلا کر فراق صاحب سے کہا کہ تم اس سال امتحان نہ دو تاکہ امرناتھ جھا کو پہلی پوزیشن مل سکے۔ فراق نے جواب دیا میں کیوں نہ امتحان دوں۔ اگر جھا کو ڈر ہے کہ ان کی پہلی پوزیشن نہیں آسکتی تو ان سے کہیے کہ وہ اس سال ڈراپ (drop) کرجائیں''۔
>
> [مشتاق نقوی۔ ''فراق صاحب'' جلد اول۔ص ۶۶۔لکھنؤ ۱۹۸۴ء]

سالہا سال تک یونیورسٹی کے طلبہ اس افسانے کو آنے والے طلباء تک منتقل کرتے رہے۔ دونوں اصحاب یونیورسٹی میں برسوں تک اکٹھے تعلیم کے شعبہ سے منسلک رہے لیکن کسی بھی دوسرے صاحب نے ان دونوں سے اس کی تصدیق یا تردید نہ چاہی۔ چنانچہ یہ بھی مشہور کردیا گیا کہ پھر امرناتھ جھا نے فراق کے ساتھ امتحان ہی نہ دیا جیسا کہ فراق کے ایک شاگرد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے:

> ''سنی سنائی باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس سال امرناتھ جھا اور فراق ایم۔اے کے سال آخر کے طالب علم تھے، تو جھا

صاحب نے اس خیال سے امتحان نہیں دیا کہ انہیں یہ یقین نہ تھا کہ وہ فراق کی موجودگی میں سب پر سبقت لے جا سکیں گے''۔

[محمد اویس ''فراق گورکھپوری ایک استاد کی حیثیت سے''۔ مطبوعہ ماہنامہ ''پہچان''۔ کراچی، فروری ۱۹۸۶ء۔ ص ۵۲]

سنی سنائی باتوں سے بھی فراق شناسی کے سلسلہ میں بعض تحقیقی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور عجیب بات یہ کہ تقریباً بھی غیر مصدقہ بیانات میں فراق ہی کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ بہر حال اوپر بیان کردہ ساری کہانی ہی خود ساختہ اور جھوٹی ہے۔ امرناتھ جھا اور فراق میور سنٹرل کالج الہ آباد میں ایف اے اور بی اے میں کلاس فیلو تھے یعنی 1915 سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ۔ بی اے میں فراق کا ایک سال تنگدستی کی وجہ سے ضائع بھی ہوا۔ پھر کئی سال بعد ۱۹۳۰ء میں فراق نے ایم اے انگریزی آگرہ یونیورسٹی سے اس وقت کیا جب وہ سناتن دھرم کالج کانپور میں انگریزی اور اردو کے استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ گویا پرائیویٹ امیدوار کے طور پر۔ مزید برآں ۱۹۳۰ء میں ایم اے کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں جب فراق کا تقرر بطور لیکچرر ہوا، امرناتھ جھا اس وقت صدر شعبہ انگریزی تھے۔ لہذا ایم اے میں ہم جماعت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بار ڈاکٹر گیان چند نے مذکورہ بالا کہانی کا ذکر فراق سے کیا۔ (طلبہ تو ایک طرف رہے خود گیان چند بھی اس افسانے کو حقیقی سمجھتے رہے ہوں گے تبھی تو فراق سے پوچھنے کی نوبت آئی) اور فراق سے اس کی تصدیق یا تردید چاہی تو فراق نے کہا:

''...... یہ بالکل غلط ہے ...... میں ایم اے انگریزی میں ان کا ہم جماعت تھا ہی نہیں۔ میں نے کانپور میں رہ کر آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کیا ہے''۔

[بحوالہ ڈاکٹر گیان چند ''فراق سے میری ملاقاتیں''۔ مطبوعہ ''فراق گورکھپوری''۔ ص ۱۵۱۔ انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء]

Scanned by CamScanner

فراق نے ایک طویل عمر پائی۔ جس زمانہ میں کوئی نقاد یا ادیب ان سے ملا یا ان کے قریب رہا، اس زمانے میں فراق کا جیسا چلن ہوگا، جو ان کے حالات ہوں گے، جو ان کے اطوار ہوں گے، جن کیفیات اور رویوں کے زیر اثر ہونگے، اندرونی حالات و واقعات یا بعض باتوں کے پس منظر کو جانے بغیر، انہیں جتنا علم رہا ہوگا، انہوں نے اتنا ہی اور ویسا ہی لکھ ڈالا۔ فراق کے بارے میں محققین نے بے شمار متضاد باتیں بیان کی ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر نقاد اور محقق نے اپنے مشاہدے میں آئے ہوئے فراق ہی کو مکمل فراق سمجھ لیا ہے۔

فراق کی سوانح عمری کا سب سے پیچیدہ اور سب سے نازک باب ان کی ازدواجی زندگی ہے۔ ان کی شادی، انکی زندگی کا انتہائی اندوہناک حادثہ ہے، جس کا اظہار وہ ساری زندگی مسلسل کرتے رہے۔ فراق کی ازدواجی زندگی ان کے دوستوں اور ارباب ادب میں مستقل موضوع بحث رہی ہے۔ ایک طرف ان لوگوں کی آراء ہیں جنہوں نے فراق کو ظالم اور بیوی سے متعلق ان کے رویے کو ذلت آمیز اور انسانیت سے گرا ہوا قرار دیا ہے۔ دوسری طرف وہ نقاد ہیں جنہوں نے فراق کے نقطۂ نظر کا تجزیہ کرنے اور اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ متضاد و متخالف بیانات سے قطع نظر جب فراق نے حقیقت میں جاذبیت نہ پائی تو تخیل میں جنت آباد کر لی۔ ایک اعتبار سے ان کی شاعری اس تخیلی جنت کو کسی طور سے ایک ارضی حقیقت بنانے کی امنگ اور کوشش کا نام ہے۔

فراق کی ازدواجی زندگی کی تصویر گویا میر تقی میر نے اپنے اس شعر میں کھینچ دی ہے۔

میر کا طور یاد ہے ہم کو ۔ نامرادانہ زیست کرتا تھا

فراق اس نامرادی کو بامراد بنانے کے لیے عمر بھر پاپڑ بیلا کیے۔ کہیں انہوں نے ہم جنسی میں وہ آسودگی تلاش کی جو انہیں ازدواجی زندگی میں میسر نہ آسکی تھی۔ اور کہیں انہوں نے روح کائنات سے وصل جسمانی کی کوشش کی کہ وہ اپنے جی کو سیراب کر

Scanned by CamScanner

سکیں۔ ان کوششوں میں وہ کہاں تک کامیاب رہے۔ اس کا ذکر ذرا بعد کو آتا ہے۔ پہلے تو یہ طے کرنا ہوگا کہ شادی کی اس ناکامی نے ان کی شخصیت میں کیسی کیسی کجیاں پیدا کر دیں۔ ان کی شخصیت میں احساس عدم تحفظ اور ایک طرح کی انانیت پرستی نے ڈیرے جما لیے تھے۔ ان کے بارے میں انکی انتہائی نازک حساسیت ان کی شاعری میں وہ رنگ پیدا کرتی ہے، جس کا بہترین ظہور میرؔ کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ لیکن دونوں میں بہت فرق ہے۔ میر کی انا ذات کے حصار سے نکل کر حقیقت انسانی کو محیط ہے جبکہ فراق کے ہاں اس سمت میں ایک کوشش جری لیکن ناتمام، نظر آتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اکثر و بیشتر زندگی کی محرومیاں، زندگی کی رفعتوں کی امین بن جاتی ہیں۔ اگر کہیں فراق شعوری طور پر ایک تہذیب نفس کے نظام سے متعلق ہوتے تو شاید وہ ان بلندیوں کو چھو سکتے، جن کی پرچھائیں جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے، صرف میرؔ ہی میں ملتی ہیں۔

انسان کی گھریلو زندگی اس کے لیے احساس تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ایسا گھر (جیسا کہ فراق کا تھا) جس میں شفقتوں کا مرکز کوئی نہ ہو، محبتوں کا منبع کوئی نہ ہو، ہمدردیوں کا مرجع بھی عنقا ہو، انسان کو سخت غیر محفوظ ہونے کا احساس دلاتا ہے اور عدم تحفظ کا یہ احساس بعض اوقات زندگی میں ایک جارحانہ رویے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ رویہ فراق کی زندگی میں جابجا نظر آتا ہے۔ بیوی کو گالیوں سے نوازتے ہیں، نقادوں سے بھی الجھتے ہیں، دوستوں پر بھی برستے ہیں اور بعض اوقات کوئی ایسا کام کرنے کی تاک میں رہتے ہیں جس سے وہ دوسروں کو تاؤ دلا سکیں یا دوسروں کو کسی طور پر ذلیل کر سکیں۔ دوسروں کی تحقیر دراصل احساس عدم تحفظ اور احساس تنہائی کے مدافعانہ ہتھیار ہوتے ہیں جنھیں فراق مجبوراً استعمال کرتے ہیں۔ ایسے اشخاص اپنے نظام مدافعت کی بنیاد بھی زود حسی پر رکھتے ہیں۔ وہ اپنی عزت اور مقام کے بارے میں انتہائی نزاکت احساس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عدم تحفظ کا احساس بعض اوقات جارحانہ رویے اور بعض اوقات بیمار انانیت پرستی کے روپ میں سامنے آتا ہے اور فراق ایسے افعال پر اپنے آپ کو مجبور پاتے

Scanned by CamScanner

ہیں جنہیں محسن کشی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ واقعات سے قطع نظر یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے آپ سے باہر کسی ہم عصر کی بڑائی کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہے اور کسی پر بھرپور اعتماد زندگی بھر نہ کر سکے۔ اس سبب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تنہائی کے اس کرب میں جیئے جس کا کامل اظہار تو وجودیت کے کرب (existential anguish) ہی میں ہوتا ہے۔ فراق کی شخصیت کے یہ پہلو ان کی شاعری میں بھی جھلکتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ شاعرانہ تجربہ، انفرادی تجربے کی محض کاربن کاپی یا فوٹو سٹیٹ نہیں ہوتا۔ بڑا شاعر ہی وہ ہوتا ہے جو انفرادی تجربے کی شاعری میں یوں قلب ماہیت کر دے کہ وہ ایک مستقل بالذات حیثیت اختیار کر جائے۔ فراق بڑے شاعر تھے، اس میں تو کلام نہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنی شخصیت سے پورا کام لیا لیکن یہ الگ بات کہ ان کی شاعری دوسرے بڑے شعراء کی شاعری کے مقابلے میں اکثر و بیشتر کچی رہ گئی۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ قدرت نے ان کے ساتھ ایسا ہاتھ کیا کہ وہ ایک سرتاپا مصنوعی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کسی فرد کی کامیاب متاہلی زندگی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو پوری شخصیت کو ارتباط اور ہم آہنگی عطا کرتا ہے۔ فراق کے ہاں بدقسمتی سے یہ نہ ہو سکا۔ فراق ایک بڑے ذہن کے مالک تھے۔ وہ ذکی الحس ہونے کے ساتھ سریع الحس بھی تھے۔ لطافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن انہیں نباہ کرنا پڑا بلادت سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بکھر کر رہ گئے۔ اس بکھراؤ کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں فراق پر طرح طرح کے الزام رکھے جاتے ہیں اور یہ بات فراق شناسی کے مراحل طے کرنے میں مسائل پیدا کرتی ہے۔ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ سب کچھ نہ کیا جس کی اہلیت قدرت نے ان کے اندر رکھی تھی۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ وہ بڑے ذہن کے مالک ہوتے ہوئے طبعاً چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ کبھی وہ بڑے نقاد اور کمتر شاعر نظر آتے ہیں اور کبھی ایک ایسے بڑے شاعر دکھائی دیتے ہیں جو تنقید کو بھی اپنی شاعری کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور اکثر اوقات ان امکانات کو بروئے کار نہیں لا سکے جو انکے شعری افق پر مسلسل

Scanned by CamScanner

جھلاتے رہتے ہیں۔ یہ سب باتیں اور فراق شناسی کے یہ سب رویے اور مرحلے اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ بات صرف زاویہ نظر کو متعین کرنے کی ہے جس زاویے سے بھی دیکھا جائے گا، حقیقت کا کوئی نہ کوئی گوشہ ضرور اوجھل ہو جائے گا۔ بالخصوص جب زیر نظر حقیقت خود ہی عدم ارتکاز کا شکار ہو۔

فراق کی ناکام ازدواجی زندگی نے ان کی شاعری کو بھی یقیناً متاثر کیا۔ اگر بات کو ایک جملے میں سمیٹا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ فراق شاعر اسم بامسمّٰی تھے۔ ان کی شاعری میں وصال کی سیرابی کی بجائے ہجر کی وارفتگی ہی ملتی ہے۔ ان کا وسیع مطالعہ اور ان کا شاعرانہ تخیل اس وفور اور سیرابی کا احساس تو نہیں دلا سکتا ہے، جو وصل کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن اسے نہ تو ان کے لیے زندگی کی ایک محسوس حقیقت بنا سکا ہے اور نہ ہی ان کی شاعری میں وہ رس اور وہ گداز پیدا کر سکا ہے، جو کامیاب ازدواجی زندگی کا تجربہ ہی پیدا کر سکتا ہے۔

فراق کی ناکام ازدواجی زندگی ان کے شاعرانہ وژن ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ ان کے تنقیدی افق پر بھی عجیب رنگ بکھیرتی ہے۔ فراق نے اپنے مصحفی والے مضمون میں جرأت اور مصحفی دونوں کو کہاں سے کہاں لا کھڑا کیا۔ آخر ان شعراء میں انہیں کیا بات نظر آئی کہ وہ گویا ر بودہ ہو گئے۔ جرأت و مصحفی یقیناً اتنے بڑے شاعر نہیں ہیں، جتنے آئینۂ فراق میں نظر آتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟۔ جرأت تو معاملات حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں وصل کی وہ چہلیں ملتی ہیں جن سے فراق محروم رہے۔ فراق، جرأت کی شاعری میں اس چیز کو اکی شعری عظمت سمجھتے رہے اور اس کے حصول کے لیے کوشش کرتے رہے۔ درآنحالیکہ یہ چیز جرأت کے ذاتی تجربے کی دین تھی۔ مصحفی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ مصحفی میں ایک ایسا سرور گداز یا گداختگی سرور ملتی ہے جو صرف کامیاب ازدواجی زندگی ہی کی دین ہو سکتی ہے۔ فراق اس چیز کے پیاسے تھے اور یہ پیاس کبھی بجھ نہ سکی۔ لہذا وہ اس کے حصول کی ہمیشہ ناکام کوشش کرتے رہے اور جن شعراء میں یہ چیز انہیں نظر

Scanned by CamScanner

آئی، ان کی طرف وہ ایک پر مسرت استعجاب سے دیکھتے رہے۔

اس بات کا ایک پہلو فراق کی ان غزلوں میں نظر آتا ہے جو انہوں نے برنگ میر کہی ہیں۔ بادی النظر میں تو فراق کی غزلوں اور میر کی غزلوں میں فرق کے سبب تک رسائی نہیں حاصل کی جاسکتی اور بقول میر یہ کہا جاسکتا ہے۔

وجہ بیگانگی نہیں معلوم　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

ان غزلوں میں ڈکشن بھی میر کا ہے۔ بحریں بھی وہی ہیں۔ لہجہ بھی کم و بیش ویسا ہی اختیار کیا گیا ہے لیکن یہ غزلیں میر کی غزلوں کی محض بے تہہ نقالی لگتی ہیں، فرق آخر کیا ہے؟ فرق محض یہ ہے کہ یہ پھول (فراق کی برنگ میر غزلیں) تخیل نے کھلائے ہیں۔ یہاں ذہن اور ہاتھ (بمعنی فن) کی کارفرمائی بہت زیادہ ہے لیکن دل کے سوتے خشک ہیں۔ وہ سیرابی ہی فراق کے حصے میں نہیں آئی جس کا تجربہ میر کو ہو چکا تھا۔ فراق کے لیے بیوی سے تعلق دائرۂ حیوانیت سے نکل کر حیطۂ انسانیت میں کبھی آ ہی نہ سکا .... میر بنے تھے فراق، مگر بنا نہ گیا۔

فراق شناسی کا ایک پہلو ان کی ہم جنسیت بھی ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں انکی ہم جنسی کے قصے زباں زد خاص و عام تھے۔ مشتاق نقوی نے اپنی کتاب ''فراق صاحب'' جلد اول میں ان کی ہم جنسیت کے قصوں پر پورا ایک باب لکھا ہے اور بھی بہت سے ادیبوں نے واقعات بیان کئے ہیں۔ بہر حال واقعات سے قطع نظر، فراق شناسی کے سلسلہ میں اس رجحان کا نفسیاتی تجزیہ زیادہ موزوں رہے گا۔

فراق کی ہم جنسیت کو عام طور ان کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا نتیجہ سمجھا گیا ہے لیکن یہ بات صرف جزوی طور پر صحیح ہے۔ فراق کی ہم جنسیت میں ان کی مخصوص افتادِ طبع کو بھی بہت دخل ہے۔ وہ بچپن ہی سے شدید حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت کا خمیر ہی حسن پرستی سے اٹھا تھا۔ جدید نفسیات یہ بتاتی ہے کہ نارمل جنسی رویے کی تعمیر میں ایک لازمی مرحلہ ہم جنسیت کا بھی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ ہم

Scanned by CamScanner

جنسیت active بھی ہو۔ لیکن جذباتی سطح پر اس مرحلے سے گزرے بغیر نارمل حیثیت کی تعمیر ناممکن ہے۔ اس ہم جنسی رویے کا اظہار زمانہ بلوغت میں اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں سے شدید جذباتی تعلق میں بھی ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ تعلق صرف جذبہ اور احساس کی سطح پر رہتا ہے اور باقاعدہ ہم جنسی افعال میں ظاہر نہیں ہوتا۔ چاہے یہ تعلق محض جذباتی سطح پر ہو یا اس کا اظہار عملی طور پر ہم جنسیت میں ہو، اس مرحلے سے گزرے بغیر نارمل جنسیت کی صحیح تعمیر نہیں ہوتی۔

فراق کی بیوی خوش شکل نہ تھیں۔ ان کی سیرت میں بھی کوئی خاص کشش نہ تھی لیکن اس کے باوجود فراق کا اس کے ساتھ تعلق بہیمانہ سطح کے بھی سبھی تقاضوں کو پورا نہ کر سکا۔ اگرچہ فراق وظیفۂ زوجیت ادا کرتے رہے۔ اس بہیمانہ تعلق میں تواتر کی وجہ سے بھی لازماً ایک جبلی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن فراق کے ہاں وہ بھی نہ پیدا ہو سکی۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتی کہ ان کی شادی بلوغت کے اولیں دور (یعنی ایف اے کے امتحان سے بھی پہلے) ہی میں کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہم جنسی میلانات سے آزاد نہ ہو سکے۔ بلکہ وہ میلانات شدت پکڑ گئے اور وہ عملی امرد پرستی کا شکار ہو گئے۔

فراق کی شخصیت میں بغاوت کا عنصر بھی شروع ہی سے موجود رہا ہے، ازدواجی زندگی کی ناکامی، جنسی رویے کی ناپختگی اور شخصی بغاوت نے ہم جنسیت کے بارے میں ان کے مخصوص رویے کو جنم دیا۔ فراق اپنے اس رویے پر کبھی نادم نہیں ہوئے۔ ''من آنم'' میں بھی کئی ایک جگہوں پر انہوں نے ہم جنسیت کی حمایت کی ہے۔ دراصل فراق نے امرد پرستی کو اپنی شخصیت کی خامی سمجھنے کی بجائے اپنی شخصیت کی انفرادیت اور ہمہ گیری کا ایک لازمی اظہار سمجھنا شروع کر دیا اور اسکے لیے تاریخ سے شواہد ڈھونڈ کر بیان کرنے لگے۔

فراق کے اس سلسلہ میں بیانات سے قطع نظر اصل دیکھنے کی بات یہ ہے کہ فراق کی امرد پرستی کا ان کی شاعری پر کیا اثر پڑا؟ ایک بات تو بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ

فراق اپنی شخصیت کے سبھی امکانات کو تخلیقی قوت بخش سکنے کے اہل تھے۔ انہوں نے اپنی ہم جنسیت کو بھی ایک تخلیقی سمت دی۔ فراق کے تصورِ حسن میں اور ان کے محبوب کی مخصوص نفسیات میں فراق کی امرد پرستی کو بھی بہت دخل ہے۔ فراق کی شاعری میں عاشق ومعشوق میں جو مستقل کشاکش اور ناقابل عبور فصل اور ازلی دوئی نظر آئی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کے اکثر محبوبوں کا جنس موافق سے متعلق ہونا بھی ہے۔ یہ الگ بات کہ فراق اس حقیقت کو ایسی بلند سطح پر لے جاتے ہیں جہاں محبوب کا موافق یا متخالف صنف سے متعلق ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ فراق کے ہاں حسن وعشق میں ازلی کھینچا تانی کا پہلا اظہار ان کے ہم جنسی عشق ہی میں ہوا۔

ازل سے جو نہ مٹ سکی وہ بیکسی تھی عشق کی
تری نگاہ لطف نے ہزار آسرا دیا

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ واردات عشق میں انسانی سطحوں پر رہتے ہوئے جہاں ناقابل عبور فصل کا احساس ہوتا ہے وہاں بھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جہاں ایک مکمل یگانگت کا بھی تجربہ ہوتا ہے جس میں عاشق ومعشوق کی انفرادیت یکسر تحلیل ہو جاتی ہے لیکن یہ لمحات بہت عارضی اور ناپائیدار ہوتے ہیں اور یہ ناپائیداری ہی دوئی کے احساس کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔ اب دیکھیے فراق کے ہاں وصل وفراق میں جو گہری یگانگت ملتی ہے، اس کا تجربہ بھی انہیں یقیناً اپنے ہم جنس تعلقات ہی میں ہوا۔ فراق کی شاعری میں وصل وفراق ہی کا فرق نہیں مٹتا بلکہ عاشق ومعشوق کا فرق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں محبت کا اندازہ نیاز وناز سے نہیں ہو پاتا۔

حسن سرتاپا تمنا، عشق سرتاسر غرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

ان کی شاعری میں عاشق ومعشوق انسانی قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ انسانی قیود سے آزاد ہو کر جذبہ ہائے بے اختیار کے مختلف رنگ بن جاتے ہیں۔ یہ مرحلہ یعنی

Scanned by CamScanner

عاشق و معشوق کی یکجائی، نارمل متخالف جنسوں کے درمیان عشق سے بھی پیدا ہو سکتا ہے جیسا کہ فارسی کے مشہور مصرع میں اظہار ہوا ہے۔

من تو شدم تو من شدی ....

لیکن کون جانے اس مصرع میں بھی عجمی ذوق کا کس قدر دخل ہے لیکن بہر حال فراق کے ہاں تو عاشق و معشوق انتہائی refined ہم جنسیت کی پیداوار ہیں۔

فراق کی ہم جنسیت کی ایک سطح اور بھی ہے اور اس کا تعلق فراق کے جذبۂ خلاقیت سے ہے۔ فراق کائنات کو اپنی خلاقیت کے مظہر کے طور پر دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں۔ یہ جذبہ ان کے ہاں اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ انہیں عشق، سچا اور گہرا عشق صرف خلاقیت کے کسی بڑے اور عظیم مظہر ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

فراق کی شخصیت اپنے جذبۂ خلاقیت کی وجہ سے پوری کائنات پر چھا جانا چاہتی تھی۔ ان میں انا اس قدر بڑی تھی کہ بعض اوقات اس انا کے سامنے میرؔ کی انا بھی دبتی نظر آتی ہے اور بات صرف ایک انا ہی کی نہیں، شخصیت کے کئی ایک تقاضوں کی ہے۔ حسن عسکری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''...........فراق کے بعض مطالبات میرؔ سے بھی پورے نہیں ہوتے''۔

[''ستارہ یا بادبان'' ص ۲۴۶۔ کراچی ۱۹۶۳ء]

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی فراق کی شاعرانہ حیثیت ہی نہیں بلکہ ان کی شاعرانہ شخصیت بھی میرؔ کے مقابلہ میں بہت کمتر رہی۔ اس کی ایک بین وجہ تو یہ سمجھ میں آئی ہے کہ فراق نے اپنی ذات سے باقاعدہ مکالمے کی شعوری کوشش سے ہمیشہ گریز کیا جبکہ میر کے ہاں ذات کی یافت ہی حاصل زیست رہی۔ فراق کے ہاں ایسا کیوں ہوا؟ اس کی بنیادی وجہ فراق کی پرداخت اور ان کی مغربی تعلیم ہے۔ فراق ایک کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کائستھوں میں دانش وری کی روایت تسلیم شدہ امر ہے لیکن دانش وری کو اتنا صحیح

کے لیے مابعد الطبیعیاتی خوراک چاہیے۔ فراق ہندو مابعد الطبیعیات سے ایک دور میں تو کنارہ کش رہے اور ایک دور میں انہوں نے ہندو مابعد الطبیعیاتی تصورات سے محض حسی تعلق قائم کیا۔ فراق کا یہ معاملہ صرف ہندو مابعد الطبیعیات سے ہی نہیں تھا بلکہ ہر اس مابعد الطبیعیات سے تھا جو الہامی ہونے کا دعویٰ کرے یا جو پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرے۔ فراق نہ صرف رومانی مزاج کے آدمی تھے بلکہ وہ یورپ کی انتہائی گمبھیر اور کثیر الابعادی رومانوی تحریک سے بھی انتہائی متاثر تھے۔ ان کی شخصیت میں وہ سارا پھیلاؤ نظر آتا ہے جو پورے یورپ کی مختلف رومانوی تحریکوں میں جزواً جزواً ابھرا۔ اگر اس پھیلاؤ کو ایک کلیے میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ان کی شخصیت dynamic organicism یعنی متحرک نامیاتیت کا اظہار تھی۔ ایسی شخصیت کائنات کی تعبیر وتشریح کرنے پر اکتفا نہیں کرتی۔ وہ کائنات کو توڑ کر ایک نئی کائنات، ایک مکمل طور پر مربوط ارتقاء پذیر کائنات بنانا چاہتی ہے۔ فراق کے کردار میں ریختگی اور ان کی شاعری میں تنوع، سیمابیت، رمزیت اور خیرگی اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف تو فراق یہ کہتے نظر آتے ہیں:

پوچھ مت کیفیتیں ان کی، نہ پوچھ ان کا شمار
چلتی پھرتی ہیں مرے سینے میں جو پرچھائیاں

تو دوسری طرف یہ کہتے ہیں:

میں بھی کوئی ادا ہوں کیا تیری
مجھ کو اک رنگ پر قرار نہیں

فراق کی یہ بے کلی پیش آمدہ صورت حال کا معروضی اظہار ہی نہیں بلکہ اس کائنات کے تنوع کا رمزی اظہار بھی ہے جس کی تشکیل ان کی شخصیت کی وسعت سے موافقت کر سکے۔

گویا فراق اب ایک مابعد الطبیعیات کی تلاش میں ہیں۔ یہ پہلے عرض کیا جا چکا

Scanned by CamScanner

ہے کہ فراق نے مختلف وجوہ کی بنا پر ذات اور مابعد الطبیعیات سے تعلق توڑا لیکن شاعرانہ تجربہ بالآخر انہیں ایسے موڑ پر لے آیا جہاں انہیں مابعد الطبیعیاتی تصورات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جیسا کہ بیشتر یورپی رومانی ادیبوں کے ساتھ ہوا۔ فراق بھی اس سے نہ بچ سکے۔ پرانی مابعد الطبیعیات اور اس پر مبنی دیو مالائی اساطیر بیسویں صدی میں ذہنوں پر وہ گرفت نہیں رکھ سکتے تھے کہ ان کا استعمال قاری اور ادیب کو ایک سطح پر لا کھڑا کرتا۔ نتیجتاً فراق کو ایک نئی مابعد الطبیعیات کا سہارا لینا پڑا۔ فراق کے لیے یہ کام اس قدر آسان تھا کیونکہ فراق کی شخصیت اور ذات ہم آہنگ نہ تھیں اور فراق ذات کی جستجو کے لیے بیتاب نہ تھے۔ اس کے علاوہ فراق ایک نفسیاتی الجھن کی وجہ سے جوان کی شادی کی پیدا کردہ تھی، ماضی کی اقدار سے اپنے آپ کو بے نیاز کر چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نئی کائنات کی بنیاد اپنے حواس کی شہادت پر رکھی۔ ان کے ہاں نئی مابعد الطبیعیات کی تشکیل کی کوششیں ''ہنڈولہ'' اور ''آدھی رات'' جیسی نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ ان نظموں میں فراق اپنے گرد و پیش کے حسن کو ایک اسرار اور ایک معنویت اور ایک الوہی جہت دینے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جہاں ایک طرف وہ کائنات کو ایک تقدس عطا کر رہے ہیں، جس تقدس کے سوتے ان کے حسی تجربے سے پھوٹ رہے ہیں، وہیں ایسی نظمیں فراق کی اپنی شخصیت کی توسیع یا enlargement بھی نظر آتی ہیں یعنی فراق میں ایک خالق و مخلوق کے ربط کا احساس ہوتا ہے۔ قاری بھی یہ محسوس کرتا ہے اور فراق بھی یہ محسوس کرانا چاہتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں کہ جو بھی تقدس اس کائنات میں انہیں دکھائی دے رہا ہے، وہ خود انہی کا عطا کردہ ہے۔ اگر فراق نہ ہوتے تو نہ صرف یہ کائنات اس قدر مقدس اور حسین نہ ہوتی بلکہ شاید کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اس اعتبار سے فراق پر مغربی فلسفے کے اس شعبے کا بھی گہرا اثر معلوم ہوتا ہے جو اپنی انا (ایگو) کے حوالے سے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے کائنات ذاتی انا (پرسنل ایگو) ہی کی توسیع کا نام ہے۔ بہر حال فراق کے جذبۂ خلاقیت کا اظہار ان کی بہترین شاعری

Scanned by CamScanner

میں ہوتا ہے۔

جہان غنچۂ دل کا فقط چٹکنا تھا
اسی کی بوئے پریشان وجود دنیا تھا
اگر خدا بھی ملے تو نہ لے ارے ناداں
ہے تو ہی کعبۂ دیں ، تو ہی قبلۂ حاجات

....

اٹھ بندگی سے مالک تقدیر بن کے دیکھ
کیا وسوسہ عذاب کا کیا کاوش نجات

....

پیغمبر عشق ہوں سمجھ میرا مقام
صدیوں میں پھر سنائی دے گا یہ کلام
وہ دیکھ کہ آفتاب سجدے میں گرے
وہ دیکھ اٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

....

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
کس طرح اک نظر سے بدلتی ہیں ہستیاں

....

کچھ اشعار تو ایسے ہیں جہاں وہ زمین و آسمان سے پرے، اس سے الگ ایک نیا جہان آباد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش سستی رومانویت کا فرار نہیں اور نہ ہی یہ محض مبہم آرزوؤں کا اظہار ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئی کائنات کی تخلیق کے قابل سمجھتے ہیں اور اس کائنات کی تخلیق کا ذریعہ اپنی شاعری کو بناتے ہیں۔ نئی کائنات کا اظہار اس طرح کے اشعار میں ملتا ہے۔

Scanned by CamScanner

عشق کی آزمائشیں اور فضاؤں میں ہوئیں
پاؤں تلے زمیں نہ تھی، سر پہ یہ آسماں نہ تھا
پیدا کرے زمین نئی آسماں نیا
اتنا تو لے کوئی اثر دور کائنات
شاعر ہوں، گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں
چونکا رہے ہیں ان کو بھی میرے توہمات

فراق کی یہ کائنات ایسی کائنات ہے جس میں عشق کی حکمرانی ہے، عشق انہیں ایک ایسی نظر دیتا ہے جو سارے پرانے معیاروں اور قدروں کو ختم کر کے نئی قدروں کی تخلیق کرتا ہے۔ اس میں حسن بھی نیا ہے اور عشق بھی نیا۔ نہ تو ہم حسن کو روایتی اوصاف سے جان سکتے ہیں اور نہ ہی عشق کو پرانے پیمانوں سے ناپ سکتے ہیں۔ ان کا عشق، حسن ہے اور ان کا حسن، عشق ہے۔ وہ حسن و عشق کی خود ایک تصویر ہیں۔

وحدت عاشق و معشوق کی تصویر ہوں میں
دل کا ایثار تو اخلاص دمن مجھ کو دیا

فراق کا حسن اپنے اندر عشق کا گداز اور عشق کی سپردگی رکھتا ہے اور ان کا عشق، حسن کی آن بان اور سیمابیت کا مظہر ہے۔

بہت نہ بیکسی عشق پر کوئی روئے
کہ حسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں
نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرق ناز و نیاز بھی
کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا، وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

Scanned by CamScanner

ترے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا
میں سوچتا تھا مرا کوئی غمگسار نہیں
فریب ہجر وہی ہے، وہی فریب وصال
ابھی کہاں تجھے کھویا، ابھی کہاں پایا

انہیں وصل میں ہجر کا لطف ملتا ہے اور ہجر میں وہ وصل کی خوشی سے مسکرا اٹھتے ہیں۔ احساسات کا یہ جہان نو فراق کے جذبہ عشق کی تخلیق ہے اور اس تخلیق پر انہیں ناز ہے۔

میں نے اس آواز کو مر مر کے پالا ہے فراق
آج جس کی نرم لو ہے شمع محراب حیات

فراق کو اس کا احساس بھی ہے کہ وہ معنی کا ایک نیا جہان پیدا کر رہے ہیں اور یہ معنی آفرینی ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو الہام کے قریب تر ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

کار مرقع ساز نہیں فن شاعری
لیتا ہے لفظ لفظ غزل میں نیا جنم

لیکن جب شاعرانہ تخیل کی یہ بلند پرواز گرد و پیش کے حقائق سے ٹکراتی ہے تو ان کی شخصیت خود اپنے آپ سے خوف زدہ ہو جاتی ہے لیکن یہ خوف زدگی ان کی شاعری میں بہت کم اظہار پاتی ہے بلکہ اس کا اظہار ان کی روز مرہ زندگی میں ہوتا ہے اور وہ شدید عدم تحفظ کا شکار ہو کر دولت سمیٹنے کی خواہش کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں کیونکہ دولت بھی ایک طاقت ہے۔ چنانچہ دولت سمیٹنے کی خواہش انہیں در بدر پھراتی ہے۔ جوانی میں جب تک رگوں میں خون کی گردش تیز رہی، عدم تحفظ کے احساس نے انہیں جارح بنائے رکھا۔

Scanned by CamScanner

لیکن جب بڑھاپا آن پہنچا تو اسی احساس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آہنی سلاخوں اور قفلوں کے پیچھے پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

دراصل فراق کی پوری شخصیت ہی مجموعۂ اضداد تھی۔ یہ بات جس قدر آسانی سے کہہ دی گئی ہے، اتنی صحیح نہیں ہے۔ مجموعۂ اضداد ایک جامد شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔ فراق کے ہاں صرف اجتماعِ ضدین ہی نہیں بلکہ نزاع بین القطبین پایا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک dynamic اور متحرک شخصیت تھے۔ اس لیے ان کے اندر مختلف قوتیں باہم برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ایک محرک کے زیرِ اثر ہوں اور کبھی دوسرے کے، جیسا کہ عموماً جامد شخصیات کے ہاں ہوتا ہے بلکہ فراق کا ہر عمل بیک وقت دو یا دو سے زیادہ قوتوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز انہیں بیک وقت دلکش بھی لگتی ہے اور دل آزار بھی۔ جہاں وہ تہذیب کا رونا روتے دکھائی دیتے ہیں، وہیں وہ یہ رونا بھی گالیوں کی زبان میں روتے ہیں۔ فراق کی شخصیت میں ایک طرف بہیمانہ عناصر کارفرما تھے تو دوسری طرف انہیں انسانیت سے بڑی محبت تھی۔ ایک طرف ان میں نفرت کا جذبہ اپنی انتہائی شکل میں نظر آتا ہے تو دوسری طرف وہ دنیا بھر کو اپنی محبت سے نہلا دینا چاہتے تھے۔ ان کی شخصیت شدید اور انتہا پسند رویوں کے باہمی تعامل، کرب و اضطراب اور زندگی کے زہر کو خود ہی اپنے ہاتھوں تریاق بنانے کے عمل کی وجہ سے بہت پیچ در پیچ اور تہہ دار بن گئی تھی۔ بعض واقعات و تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فراق کا وہ روپ جو انہوں نے معاشرے میں اپنی حیثیت متعین کرنے کے لیے دھارا، کچھ زیادہ جاذبِ نظر نہیں۔ ان کا کردار مثبت رویوں کی عکاسی کرنے کی بجائے معاشرتی قوتوں سے انحراف یا ان قوتوں سے تصادم کے نتیجے میں بنا۔ فراق کبھی روایات کے ساتھ بندھ کر نہیں رہے۔ دراصل ان کی شخصیت اتنی بڑی تھی (یہ بات واضح رہے کہ بڑی اور عظیم دو الگ الگ چیزیں ہیں) یعنی اس میں پھیلاؤ اس قدر زیادہ تھا، اس کے امکانات اتنے وسیع تھے کہ اسے کسی ایک کردار کے تابع کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی شخصیت اپنے اندر ایک ایسا وفور رکھتی تھی جو ہر

Scanned by CamScanner

بند کو توڑ کر، اچھل کر بکھراں ہونے کے لیے بیتاب رہتا تھا۔ اس کا اظہار ان کے تمام افعال و حرکات سے بھی ہوتا تھا۔ وہ زندگی کی متضاد و متخالف راہوں پر بیک وقت سفر کرنے والے مسافر تھے۔ اسی لیے وہ عقل اور شعور کی گرفت میں بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ وہ ایک مضطرب اور سیال شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ہر جذبے میں انتہائی شدت ہوتی تھی۔ مزاج میں سوداویت کا بھی غلبہ تھا۔ اسی لیے شمیم حنفی نے لکھا ہے کہ ''ان میں کچھ نیم وحشیانہ صفات'' پیدا ہوگئی تھیں۔ مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ ان میں گنوار پن کی حد تک بڑھی ہوئی معصومیت موجود تھی۔ وہ ابتدا ہی سے ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ بدو پتی سہائے (فراق کے سب سے چھوٹے بھائی) اکثر کہا کرتے تھے کہ ''فراق صاحب کی زندگی شدید نفرت پر مبنی ہے''۔ فراق کو خود بھی تسلیم ہے کہ ''جب سے میری شادی ہوئی میرا وجود غصہ اور نفرت کا پکا پھوڑا بن کر رہ گیا ہے''۔ (من آنم۔ص ۵۳)

فراق کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دوسرے لمحے میں کیا کر ڈالیں گے۔ وہ صورت حال کی نزاکت کا احساس کیے بغیر اپنے غصے اور نفرت کے زیر اثر آجاتے تھے۔ فراق شناسی کے ضمن میں ان کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی شخصیت معصومیت و شیطنت، کھلی ہوا کی طلب اور آہنی سلاخوں کے پیچھے پناہ لینا، احساس تنہائی اور محفل آرائی، فیاضی و کنجوسی، برائی و بھلائی، صاحب و ملازم کی تفریق سے نفرت، رضائی لے کر پنکھے چلوانا، حسن پرستی اور غلاظت سے گھن بھی نہ آنا، انسانیت پر اٹل ایمان اور دوسرے معزز افراد کی تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا، توہم پرستی و عقل پسندی، غفلت و ہوشیاری، آگہی و خود فراموشی، بلندی و پستی، ارضیت و آفاقیت، مادیت و روحانیت، کثافت و لطافت، تنظیم و انتشار، دیوانگی و فرزانگی، روشنی و تاریکی اور خیر و شر کی ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ گویا ان کی شخصیت جنت و جہنم دونوں سے مل کر بنی تھی۔

Scanned by CamScanner

میرے دوستوں کو معمہ ہے مری نور و نار کی زندگی
جو ادھر چراغ حرم کی لو تو اُدھر بھی کفر ہے شعلہ زن
کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے راز عالم خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں شروع ہی سے گہے ایزد و گہے اہرمن

اس کشمکش نے ان کی اس مخصوص فکر کو جنم دیا جسے گناہ و ثواب، خیر و شر اور اخلاقیات کے مروجہ پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت کے نہاں خانوں سے ابھرنے والے طوفانوں سے خود کو بنانے، سنوارنے اور پانے کی بھرپور کوشش کی اور جس کے نتیجہ میں وہ اپنی شاعری کے منفرد شعلے کو مزید تابناک بنانے میں کامیاب رہے۔

Scanned by CamScanner

ادیب سہیل

خوشبو کی سفیر

پروین شاکر سے میری ملاقات روبرو نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میں سابق مشرقی پاکستان میں قیام کرتا تھا اور وہ کراچی میں مقیم تھی۔ لیکن مجلہ ''فنون'' کے ذریعے ایک تسلسل کے ساتھ اس کی تخلیقات سے ملاقات ہوتی رہتی تھی اور سقوط مشرقی پاکستان کے بعد جب ۱۹۷۴ء میں کراچی آیا تو ادبی جلسوں میں روبرو ملاقات کی صورت بار بار نکلی لیکن یہاں میری افتاد طبع درمیان میں آئی اور بات دور کے جلوے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ حالانکہ پروین شاکر کے خاندان سے ایسی اجنبیت بھی نہیں تھی۔ پروین شاکر سے ملنے کا ایک حوالہ اختر پیامی بھی تھے۔ ان کی پروین شاکر کے خاندان سے قرابت ہے۔ یہیں پیامی کی بچی کی شادی میں پروین شاکر کے والد شاکر صاحب سے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ ان کے توسط سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ دوسرا حوالہ چون، بچپن برس پرانا بھی کام میں لایا جا سکتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پروین شاکر کے والد شاکر صاحب اور میں، ایک میں ہی کیا قرب و جوار کے گاؤں کے تمام میری عمر کے مسلمان طالب علم اسلامیہ ہائی اسکول شیخ پورہ میں پڑھنے آتے تھے۔ چند ایک کا رخ ڈی۔ ایم۔ اچ۔ ای اسکول کی طرف بھی ہوتا تھا، اس مضافاتی شہر میں یہی دو ہائی اسکول تھے۔ شاکر صاحب اور میں اسی اسلامیہ اسکول میں آگے پیچھے کے درجوں میں طالب علم تھے۔

سب سے بڑا حوالہ ذوق شعری کی مطابقت ہو سکتا تھا۔ جس کے سبب ہم دونوں ایک دوسرے کے ملاقی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب تر تھے۔ اس کی تخلیق ''خوشبو'' سے ہر ذہن متاثر ہو رہا تھا۔ ایک نکلتا ہوا اور قد آوری کی طرف بڑھتا ہوا شعری قد اور نام۔ اس کا شعری مجموعہ ''خوشبو'' نئی نسل اور نئے ذہن کے لیے من بھاتا کھاجا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس کے پہلے شعری مجموعہ ''خوشبو'' کی پذیرائی بھی خوشبو

ی طرح ہی ہوئی۔ پرانی نسل کے اچھے اذہان اس بات پر خوش کہ چراغ سے چراغ جلنے کا خوشنما عمل آگے بڑھ رہا ہے چند اکے دل میں یہ کھٹک بھی کہ شہرت کی دیوی اس پر کیوں اتنی مہربان ہوگئی۔

پروین شاکر سے میرا ایک اور رشتہ مٹی کا بھی بنتا ہے۔ لیکن اب اس کا ذکر ''بعد محرم یا حسین'' ہے۔ صرف تاریخی ریکارڈ درست رکھنے کے لیے اس قدر سپردقلم کیے دیتا ہوں۔ شہر شیخ پورہ سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں حسین آباد ہے۔ جو پروین شاکر کا ددھیال ہے۔ اس کے جداامجد یہیں رہتے تھے۔ خود میرے پردادا حکیم سید علی حسین یہیں سے آکر چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ چوارہ میں آباد ہو گئے تھے لیکن یہ تو ماضی کی باتیں ہیں۔ اس خاکستر کو کریدنے کا اب کچھ حاصل نہیں۔ (اب تو چوارہ میں اپنی جائے پیدائش بھی مع کھڑکی دروازوں کے مکمل طور پر ذہن میں نہیں آتی) مبادا لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ لکھنے والا پروین شاکر سے اپنی قربت جتانا چاہتا ہے۔

پروین شاکر پچاس کی دہائی میں (۱۹۵۲، یا ۱۹۵۳ء) کراچی میں پیدا ہوئی تھی اس لیے وہ Krachite یا سندھی تھی، کبھی کبھی وہ جڑ کی تلاش میں اپنے آباواجداد کی سرزمین کو یاد کر لیتی تھی، یہ یاد کرنا کوئی عجب فعل نہیں، یہ فطری امر ہے۔ ابتدائے آفرینش سے، سب کچھ بھی ہو، ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں ہجرت کا سلسلہ جاری ہے۔ انفرادی اور اجتماعی ہر دو صورتوں میں انگریزی کا ایک عظیم شاعر لارڈ بائرن اپنے مہاجرت کے احساس کو یوں بیان کرتا ہے:

> ''ہجرت کرنے والی نسل نئی سرزمین میں دنیا بھر کی آسودگی بھی
> حاصل کر لے لیکن اپنی مٹی کی یاد اسے چین لینے نہیں دیتی''۔

جڑ کی تلاش ہجرت کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ یہ ایک بے اختیاری جذبہ ہے۔ ادب کا یہ بڑا دیرینہ موضوع ہے۔ ادیب و شاعر جب قلم اٹھاتا ہے تو اس کی تخلیقات میں یہ بے اختیاری

جذبہ رنگ رنگ سے ظاہر ہوتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب میں اس موضوع کے توسط سے یگانہ روزگار تخلیقات، ڈرامے، شاعری اور ناول معرض وجود میں آ چکے ہیں۔ ایسی ہی ایک تحریر کو ''Roots'' کے نام سے فلمایا بھی گیا ہے۔

پروین شاکر کی شاعری کی انفرادیت وخصوصیت ''چراغ سے چراغ جلنے'' سے قطع نظر یہ ہے کہ اس نے زبان و بیان اور لب ولہجہ کی ایک اپنی کائنات ترتیب دی ہے، لیکن اتنا کہہ دینے سے بات واضح نہیں ہوتی، اس طرح کا اظہار گھسے پٹے جملوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کرتا چلوں۔ شاعری میں جس جدت اور عورت پن کے اظہار کا آغاز ادا جعفری نے ۱۹۴۶ء کے آس پاس کیا تھا۔ پروین شاکر کی شاعری اس کی خوب صورت توسیع ہے۔ ادا جعفری نے عورت پن کے اظہار میں شائستگی کا لب ولہجہ رکھا۔ کشور ناہید نے اس کو مختلف اظہاری ڈائمنشن عطا کیے۔ ''عورت پن'' شعروں میں مکمل کر آ گیا۔ اظہار کے اعتبار سے اب یہ عورت آدھی نہیں ایک مکمل عورت تھی۔ کشور ناہید نے ''عورت پن'' کے اظہار میں، اپنے کلام کی رسائی کو اس دائرہ تک یقینی بنایا جو شجر ممنوعہ تصور ہوتا ہے۔ (آپ اسے عالمی عورت کی تحریکFeminism کے حوالے سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔) فہمیدہ ریاض کے ہاں عورت اور اس کا عورت پن کچھ اور جارح ہو گیا۔ شاعری میں ''عورت پن'' کے لحاظ سے فہمیدہ ریاض، کشور ناہید کے قریب ٹھہرتی ہیں اور پروین شاکر ادا جعفری کے قریب۔ ان چاروں خواتین شعرا کے ہاں ''عورت پن'' کی گوناگوں شکلیں، ان کے شعری کارناموں میں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ کارواں آگے بھی بڑھا ہے۔ جہاں مرد اب تک غزل کے قالب میں محبوبہ (عورت) کے لیے تذکیر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں وہاں شعروں میں ''عورت پن'' کو اس کی تمام سچائی اور تانیثیت کے ساتھ پیش کرنا، ان چاروں شعرا کے ضمن میں انقلابی اقدام کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی ان کی پہچان بھی بناتا ہے۔

پروین شاکر کے ایک کرم فرما نے اس پر لکھتے ہوئے اسے غزل کے حوالے سے

Scanned by CamScanner

میر و غالب کے بعد تیسرے نمبر پر رکھا اور اس درمیان کے تمام ادوار اور ان ادوار کے سارے اہم غزل گو شعرا کو روندتے ہوئے گزر گئے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے اگر پروین شاکر زندہ ہوتی اور اسے پڑھ لیتی تو اپنے کانوں پر ہاتھ دھرتی اور اپنے محسن کو خوش نگاہی سے نہ دیکھتی کہ متوازن ذہن اس طرح کی توصیف نہیں کیا کرتا یا اگر بر بنائے شائستہ ادھر نظر کرتی تو تبسم زیر لب کے ساتھ!

پھر انہیں صاحب نے اسی ذہن و زبان سے نظم کے معاملے میں پروین شاکر کو ایسا زمین پر لا کر پٹخا کہ اس کی خوب صورت نظموں کے بدن پر آرائشی لوازم، کلائیوں میں سُر جگاتی ہوئی چوڑیاں اور اس کے بصیرت کے آبگینے چکنا چور ہو گئے۔ میں تو پروین شاکر کے ان کرم فرما کے مضمون کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ صاحب باتونی بہت ہیں اور باتونی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی کہہ گئے جو انہیں نہیں کہنا چاہیے تھا اور وہ ایسا کہتے ہوئے وہ دروازے بھی بند کر گئے جو دانا لوگ واپس لوٹنے کے لیے کھلا رکھ چھوڑتے ہیں۔

ماہ تمام میں پروین شاکر کی شاعری کا بہت بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے اور ان نظموں میں جستہ جستہ وہ سب آ گیا ہے جسے عرف عام میں عصری آگہی کہا جاتا ہے۔ پروین شاکر کے ہاں غم ذات اور غم دنیا ایک سنگم میں بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ رشتہ ایک الگ تجزیے کا متقاضی ہے۔ اس پر چلتا پھرتا ریمارک یا اس سے سرسری گزرنا، اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ شاعر غم ذات کی بات کر رہا ہو یا غم زمانہ کی۔ اس کی تحریک دل زدگی کے بغیر ممکن نہیں۔ البتہ بعض وقت اظہار کسی خیال و فکر کو اس کے حسب دل خواہ قالب عطا نہیں کر پاتا۔ اس لیے بیان واقعہ کا سا انداز نظر آتا ہے۔ وہ واردات نہیں ہو پاتا۔ یہ خامی ایک پروین کے ہاں کیا دنیا کی کسی بھی زبان کے اہم شاعر کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے کہ بعض اوقات خیال و فکر مچھلی کی طرح گرفت سے پھسل پھسل جاتا ہے، اس سے قطع نظر باغ کے مجموعی حسن میں اس گھاس کی بھی اہمیت ہے جسے ہم غیر ضروری سمجھ کر اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

پروین شاکر کی نظموں کو ''آمد'' سے خالی اور اس کے محرک میں ''آورد'' (آورد مروجہ مفہوم میں) کی نشان دہی کرنا کچھ مناسب نہ ہوگا اور دو ایک کو چھوڑ کر اس کی تمام نظموں کو بھرتی کا کہنا تو ستم بالائے ستم کہا جائے گا۔ تخلیقی فن کے تجزیے کا یہ طریقہ صائب ہرگز نہیں ہو سکتا اور تخلیقی فن میں بھی منظوم کلام کا۔

بیدل عظیم آبادی نے اپنی نثری تصانیف (چہار عنصر، تذکرہ) میں کہیں لکھا ہے۔ بغیر جزوی یا کلی مشاہدے کے دل میں تصور کا ورود ممکن نہیں اور مشاہدے کا تعلق باہر سے ہے۔ اسی بات کو ذرا ''آمد'' اور ''آورد'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو آمد کا تعلق دل سے بتایا جاتا ہے اور آورد کا تعلق باہر سے ہے تو کیا آمد کی کسی صورت کی ''تجسیم'' آورد کے بغیر ممکن ہے؟ یہ ایک سوال ہے اس کا جواب قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

پروین شاکر کا ذکر کرتے ہوئے ایران کی اہم ترین شاعرہ فروغ فرخ زاد یاد آ رہی ہے۔ دونوں شاعرات میں حیران کن مماثلت ہے۔ فروغ فرخ زاد ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئیں، ۳۳ برس زندہ رہیں اور ۱۹۶۶ء میں کار کے ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئیں۔ پروین شاکر ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئیں، ۱۹۹۴ء میں دفتر جاتے ہوئے کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گئیں، ۴۲ برس زندہ رہیں۔

فروغ فرخ زاد کی سولہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ ایک سال بعد اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ''کام یار'' رکھا گیا۔ اس کی پیدائش کے بعد وہ ساعت آ گئی جب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ خاندانی زندگی اور شاعری میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ چنانچہ فروغ فرخ زاد نے شاعری کو منتخب کر لیا اور شوہر سے طلاق لے کر گھر سے نکل گئی۔ اس کا نوزائیدہ بچہ پیچھے چھوٹ گیا۔ اس پر وہ لکھتی ہے:

میں جانتی ہوں کہ اس دور افتادہ گھر سے
زندگی کی خوشیاں پرواز کر گئی ہیں
مجھے اس کا بھی علم ہے کہ ایک بچہ

Scanned by CamScanner

ماں کی جدائی میں غم سے بے حال ہو رہا ہے
لیکن میں نڈھال اور پریشان
اپنی راہ آرزو پر چل پڑی ہوں
شاعری میری عزیز ترین محبوب ہے
اسے میں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی ہوں

(حوالہ مشاہیر کراچی، ترجمہ ظہیر مشرقی)

پروین شاکر کی شادی کے بعد جب گود ہری ہوتی ہے تو اسے بھی اسی امتحان سے گزرنا پڑتا ہے جس سے فروغ فرخ زاد گزری تھی، شوہر کی جانب سے پروین شاکر کی شاعری اور شاعرانہ سرگرمیوں کے لیے شیفتگی پر قدغن شروع ہوا۔ گھر بار اور خاندانی مشاغل کو اس پر ترجیح دینے کا مطالبہ ہوتا ہے، کچھ دیر تو پروین شاکر دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی سعی کرتی ہے۔ لیکن شوہر اور اس کے اہل خاندان کی طرف سے کسی ایک طرف ہونے کے پیہم اصرار کی وجہ سے پروین کا فیصلہ شاعری کے حق میں ہوتا ہے اور پھر زن وشوہر میں ایک طرح کی Agreed علیحدگی ہو جاتی ہے اور معاملہ طلاق پر آ کر رکتا ہے فروغ فرخ زاد اور پروین شاکر کے غم میں جو فرق ہے وہ یہ کہ ایک کا جگر گوشہ پالنے پر سے چھین لیا گیا، دوسرے کا بچہ (مراد) اس کے ساتھ رہا۔ (اور اب پروین کی واحد نشانی یہ لڑکا ماشاءاللہ دس پندرہ برس کا ہے)۔

دونوں کی شاعری میں ''عورت پن'' پوری سچائی کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے، ان کا محبوب نہ خیالی ہے نہ فرضی ہے، ان کا تخاطب مرد سے ہے، ایک سچی عورت کے روپ میں۔ فروغ فرخ زاد کے لیے ناقدین کا کہنا ہے کہ اس کے ہاں جو شاعری میں عورت کی آواز دیکھی جاتی ہے وہ مدت دراز سے مقید عورت کی آواز ہے، فروغ فرخ زاد کا خیال ہے کہ ''اظہار ذات کے لیے آرٹ کے انتخاب کا یہ مطلب ہے کہ شاعرہ اپنی جنسیت کو اپنے آرٹ کی حد کے اندر رکھے''۔ پروین شاکر نے بھی کم وبیش یہی

کیا ہے۔ ''عورت پن'' کا ہر طرح اپنی شاعری میں اظہار کیا ہے لیکن نہایت شائستگی کے ساتھ۔

فروغ فرخ زاد کی شاعری کا ارتقا مرحلہ وار ہوا ہے یعنی آغاز رومانویت سے ہوتا ہے، بعد ازاں مسائل حیات اس دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ فروغ کے شعری مجموعے ''اسیر''، ''عصیان'' اور ''دیوار کے بعد'' جب ''تولد دیگر'' شائع ہوتا ہے تو شاعری کا لہجہ بدل جاتا ہے وہ کہتی ہے:

''میں سمجھتی ہوں کہ وہ تمام لوگ جو آرٹسٹ ہیں ان کی کم از کم ایک علت بلکہ ایک طرح نادانستہ حاجت ہے زوال کے سامنے ڈٹ جانے اور مقابلہ کرنے کی''۔

(بہروز جلالی رظہیر مشرقی)

پروین شاکر کی شاعری کا ارتقا بھی کچھ اسی طور سے ہوا ہے۔ ''خوشبو'' اور ''صد برگ'' کے بعد ''خود کلامی'' اور ''انکار'' میں افکار و مسائل روزگار اپنی تمام توانائی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

غرضکہ آرٹسٹ کی جبلت میں داخل ہے کہ زوال کے خلاف وہ خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا۔ وہ نہ اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے رہ سکتا ہے نہ اس کے سائے سے کترا کے چلنے کا وتیرہ اختیار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے اندر پرورش پاتی ہوئی نادانستہ حاجت کے دباؤ کے تحت اپنے افکار و قلم سے ہر بدصورتی کے خلاف نبرد آزما رہتا ہے، اور زہر کا پیالہ پینے سے لے سر دار مسکرانے تک کی منزلیں طے کرتا آیا ہے، فروغ فرخ زاد اور پروین شاکر اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ دونوں کے اپنے ذہنی ارتباط و مطابقت کی تفہیم کے لیے پروین شاکر کی یہ نظم پڑھیے:

فروغ فرخ زاد کے لیے ایک نظم:

مصاحب شاہ سے کہو کہ

فقیہ، اعظم بھی آج تصدیق کر گئے ہیں
کہ فصل، پھر سے گناہ گاروں کی پک گئی ہے
حضور کی جنبش نظر کے
تمام جلاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاری کریں
تو تعمیل بندگی ہو..........
کہاں پہ اسرار اور کہاں پہ دستار اتارنا احسن العمل ہے
کہاں پہ ہاتھوں، کہاں زبانوں کو قطع کیجیے
کہاں پہ دروازہ رزق کا بند کرنا ہوگا
کہاں پہ آسائشوں کی، بھوکوں کو مار دیجیے
کہاں بجے گی لعان کی چھوٹ
اور کہاں پہ
رجم کے احکام جاری ہوں گے
کہاں پہ نو سالہ بچیاں، چھپّن سالہ مردوں کے ساتھ
سنگین میں پرونے کا حکم ہوگا..........
کہاں پہ اقبالی ملزموں کو
کسی طرح شک کا فائدہ ہو
کہاں پہ معصوم دار پر کھینچنا پڑے گا
حضور احکام جو بھی جاری کریں
فقط التجا یہ ہوگی
کہ اپنے ارشاد عالیہ کو
زبانی رکھیں

Scanned by CamScanner

وگرنہ قانونی الجھنیں ہیں

(خودکلامی)

پروین شاکر کا فکر اجلا ہے اور نظریہ شفاف! اسی لیے جو باتیں شعر میں کہی گئی ہیں خواہ اس کا پیرایہ علامت کا ہو یا راست گوئی کا قارئین پر معاشرانداز ہوتی ہیں اور دل میں اتر جاتی ہیں۔ میں اس شاعرہ کے غم کے سیاق و سباق پر اکثر غور کرتا ہوں جو شعروں کی صورت میں منظر عام پر آئے ہیں تو ان میں مجھے پچھتاوے کی آنچ بھی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک اور منفرد اور فراخ دلانہ رخ یہ ہے کہ اس نے ناکردہ گناہ کا الزام بھی اپنے سر لے لیا ہے اور اس کا قصوروار اپنے شوہر کو کہیں نہیں ٹھہرایا ہے۔ جو اس کا مخاطب بھی اور محبوب بھی ہے۔ اس سے قطع تعلق کے باوجود۔ جبکہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں اور اس علیحدگی میں اس کا Counter Part اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ وسعت قلب اور محبت کے پاس کے تقاضے کے تحت کہیں شمہ برابر کو بھی اس شاعرہ کے لب و لہجے میں، جھلاہٹ، درشتی اور برہمی کا عنصر نہیں آتا۔ اس کی معراج یہ ہے کہ اس نے شکایت کے لہجے کا بھی اپنے بیٹے مراد کے باپ کو سزاوار نہیں کیا۔ اگر کبھی زیر لب شکایت بھی کی تو بڑی اپنائیت کے ساتھ۔ جس سے اس کا احساس غم چمک اٹھا اور شعر میں ترفع پیدا ہو گیا ہے۔

پروین شاکر کی شاعری میں ہر جگہ محبوب سے بچھڑنے کا غم ہے، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فروغ فرخ زاد اور پروین شاکر میں بڑی مماثلت ہے ایک ہی سبب کی بنا پر دونوں کی شوہر سے جدائی واقع ہوئی، دونوں کے درمیان ایک بچہ رابطے کا وسیلہ رہا۔ طلاق کے بعد ان دونوں کے شوہروں کی شوہریت تو ختم ہو گئی لیکن محبوبیت شاید قائم رہی۔ اس کی آنچ پروین کے ہاں تیز ہوتی ہے اس ادبی مفارقت کا ذمے دار کون ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ دو دل اسی طرح کچھ دیر کے لیے آپس میں ملتے ہیں، اور پھر جدا ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ نہ ملنے کے لیے۔ اپنے پیچھے دائمی فراق

Scanned by CamScanner

اور دائمی پچھتاوے چھوڑ کر!

پروین شاکر کی تمام غزلیہ شاعری میں علیحدگی کے اس وقوعہ پر غم کا احساس ملتا ہے، اور کوئی نہ کوئی شعر اس کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ پروین شاکر نے اپنے اسی غم کو شعر کے ذریعے ہزاروں رنگ عطا کر دیے ہیں، جو ان کے کلیات ''ماہ تمام'' میں جا بجا بکھرا ہے۔ پروین شاکر نے فراق ابد کا عذاب جو اپنی شاعری کے لیے قبول کیا ہے اور پھر بھی بدمزہ نہ ہوئی۔ اس کی گوناگوں صورت اس کے اشعار میں دیکھیے اور داد دیجیے:

کوئی سوال جو پوچھے تو کیا کہوں اس سے
بچھڑنے والے سبب تو بتا جدائی کا
نہ دے سکا مجھے تعبیر، خواب تو بخشے
میں احترام کروں گی، تری بڑائی کا

آلودۂ سخن بھی نہ ہونے دیا اسے
ایسا بھی دکھ ملا جو کسی سے نہیں کہا

تیرا خیال کر کے میں خاموش ہو گئی
ورنہ زبان خلق سے کیا کیا نہیں سنا

میں جانتی ہوں میری بھلائی اسی میں تھی
لیکن یہ فیصلہ بھی کچھ اچھا نہیں ہوا

''خوشبو کہیں نہ جائے'' یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

Scanned by CamScanner

ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

اس ترکِ رفاقت پہ پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی

میرے لہجے میں غرور آیا تھا
اس کو حق تھا کہ شکایت کرتا

کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
اس طرح ترکِ رفاقت کرتا

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

ہم نے خود سے بھی چھپایا اور سارے شہر کو
تیرے جانے کی خبر دیوار و در کرتے رہے

اسے پکارا تو ہونٹوں پہ کوئی نام نہ تھا
محبتوں کے سفر میں عجب فضا آئی

کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے
اٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی

Scanned by CamScanner

جو خواب دینے پہ قادر تھا میری نظروں میں
عذاب دیتے ہوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

اب اس کا فن تو کسی اور سے ہوا منسوب
میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی

وہ ایک رشتۂ بے نام بھی نہیں لیکن
میں اب بھی اس کے اشارے پہ سر جھکاؤں گی

اس کی حرمت کا مرے دل کو بھی ہے پاس بہت
چپ رہے گا میری ناموس کی خاطر وہ بھی

میں تو اڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لیے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیاد کا

اب تک وہی نشۂ پذیرائی
کل خواب میں اس کے گھر گئے تھے

Scanned by CamScanner

ملتا نہ تھا واپسی کا رستہ
کیا جانیے ہم کدھر گئے تھے

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اس کا ہی قصور سارا کب تھا

اور پروین شاکر کی وہ پوری غزل جس کا ایک مصرع ہے:

اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

پروین شاکر کی غزلیہ شاعری بھی اپنی مثال آپ ہے اور نظمیہ شاعری بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نظمیہ شاعری میں غم ذات کے ساتھ غم دوراں بہر عنوان اور بہ ہر جہت پھیل گیا ہے۔ اور غالب کی ''تنگنائے'' غزل والی شکایت کی تلافی کی ایک صورت پیدا ہوئی ہے۔ اس شکایت کی تلافی تو بہت پہلے علامہ اقبال نے کی اور اس طرح کی کہ نظم کا دامن ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا اور پھیلاؤ میں افقی وعمودی دونوں سمتیں سمٹ آئیں۔ اقبال کی حیثیت تو اس میدان میں سب سے بلند چوٹی کی ہے لیکن وہ ہزاروں چوٹیاں جو بلند چوٹی کو یہ شناخت عطا کرتی ہیں، انھیں ہمیشہ نظروں میں اور یادوں میں رکھنا ضروری ہے اور ایسی چھوٹی چوٹیاں لاتعداد ہیں، انھیں کی ایک منفرد اور نکلتی ہوئی چوٹی میں پروین شاکر کا شمار بھی ہوتا ہے۔

پروین شاکر کی نظمیہ شاعری کے ذکر کا آغاز کرتے ہوئے اس کی ایک مختصر نظم پیش کرتا ہوں جس میں شاعرہ نے دل و ذہن میں پرورش پانے والے خدشات کا اظہار کیا ہے:

تمھارا کہنا ہے
تم مجھے بے پناہ شدت سے چاہتے ہو

تمہاری چاہت
وصال کی آخری حدوں تک
میرے، فقط میرے نام ہوگی
مجھے یقیں ہے، مجھے یقیں ہے
مگر قسم کھانے والے لڑکے
تمہاری آنکھوں میں ایک تل ہے!

(شعری مجموعہ ''خوشبو'')

''آنکھوں میں تل ہونا'' ایک محاورہ ہے۔ لوگوں کی محفل میں اکثر موقع بہ موقع زبان زد ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم بے وفائی ہے۔ آنکھوں میں تل ہونا! بے وفا ہونے کی علامت ہے۔ اور پروین شاکر کی ازدواجی زندگی میں جو واقعہ رونما ہوا۔ وہ اس محاورہ کی تصدیق بھی کرتا ہے!

پروین شاکر کی شاعری کا ایک رخ اس نظم ''شام میں توری گیا چراؤں'' میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ پوری نظم گیت کے لب و لہجے میں سولہ شعروں پر مشتمل ہے۔ ردیف کا التزام غزل جیسا، پیکر تراشی نظم کی ہے، لیکن جذبات گیت کے عین مناسب ہیں، پروین شاکر کی نسل کے کتنے شاعر ہوں گے جو شام اور رادھا کے معاملات چھیڑ چھاڑ، اور رنگ رس اور بھرپور عاشقی کا ادراک رکھتے ہوں کہ ایسے موضوع کو اس کے تمام تر مبادیات و متعلقات کے ساتھ رقم کر سکتے ہوں، حسنِ بیان کی انتہا آخری شعر پہ ہوتی ہے:

آنکھ جب آئینے سے ہٹائی
شام سندر سے رادھا مل آئی
آئے سپنوں میں گوکل کے راجا
دیئے سکھیوں کو آئی بدھائی

پریم جل خوب گاگر میں بھر لوں
آج بادل نے مایا لٹائی
کس کو پنگھٹ پہ جانے کی ضد تھی
کس سے گاگر نے بنتی کرائی
اوک سے پانی بہنے لگا تو
پیاس گردھر کی کیسے بجھائی
اب تو جل کا ہی آنچل بنا لوں
پیڑ پر کیوں چڑیا سکھائی
اسی بالک سے نندیا ملے گی
جس نے ماتھے کی بندیا چرائی
رنگ ڈالی مری آتما تک
کیا منوہر کے من میں سمائی
میں نے سکھیوں کو کب کچھ بتایا
بیری پائل نے ہی جا لگائی
گوپیوں سے بھی کھیلیں کنہیا
اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی!
کوئی خوشبو تو اچھی لگے گی!
پھول بھر بھر کے آنچل میں لائی
شام! میں توری گیاں چراؤں
مول لے لے تو میری کمائی
کرشن گوپال رستہ ہی بھولے
رادھا پیاری تو سدھ بھول آئی

Scanned by CamScanner

سارے سر ایک مرلی کی دھن میں
ایسی رچنا بھلا کس نے گائی
کیسا بندھن بندھا شام مورے
بات تیری سمجھ میں نہ آئی
ہاتھ پھولوں سے پہلے بنے تھے
یا کہ گجرے سے پھوٹی کلائی!

(صد برگ)

نظم ''پروین قادر آغا'' پروین شاکر کی زندگی بھر کی چپتا، روداد سفر اور تجربوں کی نچوڑ ہے، اس کا فارم ''نثری نظم'' کا ہے۔

پروین قادر آغا، پروین شاکر کی محسن ہیں۔ وہ پروین کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئیں۔ انھوں نے پروین کو شاید ٹوٹ کر چاہا، پروین شاکر نے بھی چاہت کا جواب چاہت سے دیا، اسے اس چاہت پر ایک تفاخر محسوس ہوا۔ اپنے آخری شعری مجموعہ ''انکار'' کا انتساب انھیں خاتون کے نام کیا ہے۔ پروین قادر آغا اور پروین شاکر کے اس رشتے کے عمق کو سمجھنے کے لیے اس نظم کا اقتباس دیکھیے:

مجھ میں اور پاگل پن میں
بس ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا
خودکشی بھی میری تاک میں بیٹھی تھی
قریب تھا کہ میں اس کے ہاتھ آجاتی
کہ ایک سایہ میری طرف بڑھا
اور میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا
''ہمیں کسی کی پرواہ نہیں

تم جیسی بھی ہو، ہمیں عزیز ہو"

اس دن میں اتنا روئی کہ دنیا اگر ایک تال ہوتی

تو میرے آنسوؤں سے بھر جاتی

اور پروین قادر آغا جو پروین شاکر کی دلدادہ تھیں اسے My Flower Child کہتیں۔
انھوں نے "فنون" کے گوشہ پروین شاکر میں کہا ہے:

> She was likw a Flower Child a Melody a
> Fragrance in Fact Poetry itself.I did have Read Her
> Poetry as For me SHe was herself a poem.

پروین قادر آغا نے چند جملوں میں پروین شاکر کی شخصیت وفن کو وہ خراج عقیدت ومحبت پیش کر دیا ہے، جس کی خوشبوئیں تا دیر پڑھنے والوں کے دلوں میں قائم رہیں گی۔ آغا صاحبہ نے پورے مضمون کو جس شگفتگی کی روشنائی سے قلم بند کیا ہے۔ وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، جس کو ایسے پرستار مل جائیں وہ مر کے بھی زندہ رہتا ہے۔

اب سے چند سال پہلے سید عابد علی نے پروین شاکر سے ایک انٹرویو کیا تھا (مطبوعہ "ڈان" کراچی) سب سے پہلے انھوں نے پروین شاکر سے خاندانی پس منظر دریافت کیا۔ جواب میں پروین شاکر نے جو کچھ کہا وہ مختصراً یہ ہے کہ ان کے والد شاکر صاحب جون ۱۹۴۷ء میں بہار سے کراچی ہجرت کر کے آ گئے۔ قبل از وقت آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ آزادی کی صبح آزاد سرزمین پر دیکھیں۔ پروین شاکر کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد کے دوسرے تمام بھائی قم کے مجتہد تھے۔ پروین کے دادا نے ان کے والد شاکر صاحب کو بھی اس کار خیر کے لیے نامزد کیا۔ وہ آزاد منش تھے۔ ان سے اس طرح کی Regimentation ناقابل برداشت تھی۔

پروین شاکر کے والد نے کراچی میں ملازمت کر لی اور نہایت تحمل سے ابتدائی مصائب کو درخور اعتنا کیا جو ساری دنیا میں ہجرت کرنے والی پہلی نسل کو بھگتنے پڑتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

اور پروین شاکر اپنے ہی والد کے زیر سایہ پروان چڑھی ۔ جو سخت و درشت زمانے کے آزمائے ہوئے تھے ۔ اور اپنا ایک ردعمل اور ایک رائے رکھتے تھے اور جب قلم پکڑا تو صاحب وراثت فکر والد کے افکار و خیالات اس کی شخصی و شعری شخصیت کی تشکیل میں مدد گار ثابت ہوئے ۔

اور ایک سوال کے جواب میں کہ آپ اپنی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں ؟ پروین شاکر نے کہا کہ میں اپنے شعری مجموعے '' خوشبو '' کے بارے میں کوئی بڑا بول بولنے کے بجائے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر عوام الناس کی پسندیدگی کی کوئی اہمیت ہے تو میں کہوں گی کہ قارئین میں خوشبو کی پذیرائی بڑھ چڑھ کر ہوئی ۔ '' خوشبو '' محض محبت کی شاعری ہے جو دو دلوں کے درمیان وقوع پاتی ہے لیکن جب میں نے بلند خیالی کی طرف خود کو راغب کیا تو وہی نقاد جو میری Love Poetry سے زیادہ خوش نہ تھے اور اسے Adolescent شاعری سے زیادہ گردانتے کے حق میں نہ رہے ۔ انھوں نے میری اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا ۔ اس کے برعکس میرے وہ قارئین جو میری Love Poetry کے دلدادہ تھے انھیں مایوسی ہوئی ۔ بہر حال میری شاعری کا وہ ایسا تغیر تھا جس سے گزرنا ہی تھا ۔ لیکن '' خوشبو '' سے '' خود کلامی '' کی طرف آئی تو وہ زمانہ '' مارشل لاء '' کا تھا اور ایسے وقت دوسروں کو مخاطب کرنے یا ان سے کلام کرنے کے بدلے تخلیق کار اپنے آپ سے کلام کرنے لگے ۔ لیکن پروین شاکر نے '' خود کلامی '' کو '' کیموفلاج '' کے طور پر استعمال نہیں کیا ، وہ خود کلامی میں بھی زمانے کو مخاطب کرتی رہی ۔ اس کی عصری حسیت اس کے شعروں میں بیدار رہی اور اس کے مخاطب کی جان بر ملامت رہی ۔ اس کے شعری مجموعہ '' خود کلامی '' میں شامل نظمیں نئے سال کی پہلی نظم '' پھولوں کا کیا ہوگا '' ، '' دائرہ '' اور '' بشارت '' وغیرہ ایسے موقعوں کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ نظم '' بشارت '' ملاحظہ کیجیے :

بھیڑیے کے آنے سے

ایک دو گھڑی پہلے

ایک سنسناتی بو
بن میں پھیل جاتی ہے
آج میرے گھر میں بھی
میری تیسری حس نے
کوئی بات دیکھی ہے
اتنی دیر میں، میں نے
تیسری کہ چوتھی بار
گھر کے کونے کونے میں
پھر گلاب چھڑکا ہے
پر گلاب کی ڈھالیں
کیا مجھے بچالیں گی؟

پروین شاکر کی اس دور کی غزلیں بھی نظم کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی ہیں اور قارئین اور عامۃ الناس کو یہ باور کراتی جاتی ہیں کہ ہم غافل نہیں ہر لمحے تمھارا اظہار بن کر ظاہر ہو رہے ہیں۔ عصر ہمارے اندر اور ہم عصر کے درمیاں ہیں:

سکوت شہر تو پھر بھی سمجھ میں آ رہا ہے
پس دیوار بھی کیا گریہ و زاری نہیں ہے

سب اچھا کہتے ہوؤں کا ہر اس بھی دیکھا
امیر شہر، کبھی آس پاس بھی دیکھا

جو صبح سرمد و منصور تھے، انھیں سر شام
حضور شاہ سراپا سپاس بھی دیکھا

خاندانی پس منظر کے بارے میں جو باتیں محولہ انٹرویو کا حصہ بن سکیں اور پروین شاکر کے بیان میں نظرانداز ہو گئیں اس کی تکمیل شاید اب اس لیے ممکن نہیں کہ اب وہ ہم میں موجود نہیں میں تکملہ کے طور پر چند سطور رقم کرتا ہوں:

''پروین شاکر اگرچہ کراچی میں پیدا ہوئی تھی لیکن وہ اپنے بزرگوں کی سرزمین حسین آباد، ضلع مونگیر اور اس کی پس منظری ادبی و شعری روایات سے بے خبر نہ تھی۔ جس کا ڈانڈا ماضی بعید میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل سے جا ملتا ہے۔ ''تذکرۃ الانساب'' (مصنف سید عالم حسین) کے اوراق سے سراغ ملتا ہے کہ نواب ابراہیم خلیل کا جدی گھر حسین آباد تھا۔ وہ حسین آباد سے تقریباً دو تین میل کے فاصلے پر شہر شیخو پورہ میں ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت حسین آباد کے متمول لوگ اپنا ایک مکان شہر شیخو پورہ میں بھی تعمیر کرواتے تھے۔ اس طرح حسین آباد اور شہر شیخو پورہ جڑواں آبادی کی حیثیت رکھتے تھے''۔

نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے چھوٹے بھائی نواب قاسم خاں اور ان کی آل اولاد اسی گاؤں میں پلی بڑھی۔ ان میں سے اکثر جو شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے ان کے لاحقے کے طور پر ''حسین آبادی'' اب بھی ان کے کلام کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

نواب علی ابراہیم خلیل نے فارسی میں ایک تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' لکھا تھا اس تالیف کی مدت تالیف ۹۹۔۱۱۸۸ ہجری بتائی جاتی ہے۔ کلکتہ کے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں اردو میں منتقل کیا تھا۔ (اس کا شمار اردو کے اولین تذکروں میں ہوتا ہے)۔ اسی موضع حسین آباد کے ایک اور بزرگ شاہ محمد ہاشم بہار حسین آبادی تھے جن کا زمانہ پیدائش ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء ہے۔ یہ شاد عظیم آبادی، نواب امداد امام اثر اور فضل حق آزاد کے معاصرین میں تھے اور بہ قول ڈاکٹر ذیشان فاطمی

Scanned by CamScanner

اور ڈاکٹر وہاب اشرفی، شاہ محمد ہاشم بہاران بزرگوں سے کم پایہ نہ تھے۔

پروین شاکر انتقال سے قبل جب پٹنہ گئیں تو وہ اپنے رشتے کے ماموں جابر حسین سے ملی تھیں۔ جابر حسین، اختر پیامی اور ڈاکٹر ذی شان فاطمی کے سگے بھائی ہیں۔ اس طرح جابر حسین سے ہوتی ہوئی یہ قرابت ان کے پردادا شاہ محمد ہاشم تک پہنچتی ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر ذی شان کی ایک کتاب ''بہاریہ'' پٹنہ سے شائع ہوئی ہے یہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اپنے پردادا کے فن و شخصیت پر۔

پروین شاکر اب ہم میں نہیں، دسمبر ۱۹۹۴ء کے آخری دنوں میں اسلام آباد کے ایک کار ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہوا۔ اسلام آباد کی زمین آخری آرام گاہ بنی۔ پروین شاکر نے یادگار کے طور پر کل کائنات ایک فرزند مراد علی عرف گیتو اور چار شعری مجموعوں پر مشتمل ایک کلیات ''ماہ تمام'' چھوڑی۔ اس کے انتقال کی خبر سے ایک عالم سوگوار ہوا۔ پروین شاکر سے جو جتنا زیادہ قریب تھے۔ انھیں اس سانحے پر اسی شدت سے غم ہوا ہے۔

کوہاٹ کے ادیب شبیر و محقق احمد پراچہ جو پروین کی زندگی ہی میں ۱۹۹۰ء میں ایک کتاب ''پروین شاکر احوال و آثار'' لکھ کر پہل کر چکے تھے، نے انتقال کے بعد دوبارہ اسی عنوان سے ایک کتاب ۲۰۰۳ء میں چھاپی ہے۔ یہ کتاب بھی مرحومہ پر پہل کا درجہ رکھتی ہے۔

انتقال کے بعد انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ پروفیسر اوسمان بیلن اوز جان ترکی سے اسلام آباد سوگوار خاندان سے تعزیت کے لیے اسلام آباد تشریف لائیں۔ پروین شاکر کی قبر پر گئیں، عقیدت کے پھول چڑھائے اور یہ اطلاع دی کہ وہ ترکی میں پروین شاکر پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہی ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کی اپیل کی کہ میرے اس کام میں پاکستان کے اہل قلم پروین کے شخص و عکس کے حوالے سے معلومات فراہم کر کے معاونت فرمائیں۔ میں نے اپنی پہلی فرصت میں اس طرح کا کچھ ادبی مواد

Scanned by CamScanner

فراہم کر دیا جواب میں محترمہ اوز جان کا خط اردو میں لکھا ہوا تھا:

عادب صاحب (ادیب صاحب)

آپ کا خط اور مقالہ مجھے مل گئے ہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی آپ نے میری مدد کے بارے میں سوچا ہے۔ میں نے آپ کا مقالہ غور سے پڑھ لیا ہے میرے کام میں یقیناً آئے گا۔

پھر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

خدا حافظ

اوسمان بیلن اوز جان

میں نے حوالے دے کر یہ تو Locate کر دیا کہ پروین شاکر کے بزرگوں کی سرزمین اور اس کا شعری پس منظر کیا ہے؟ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان پرکھوں سے پروین شاکر کے بزرگوں کی براہ راست رشتہ داری کیا ہے، لیکن شرفاء کی دس بیس گھروں کی بستی میں غیر کہاں ہوتے ہیں۔ سب ایک دوسرے سے رشتہ و قرابت میں بندھے ہوتے ہیں۔

پروین شاکر کے ذکر میں چل کر بہت دور نکل آیا ہوں، نہ منزل قدم چومتی ہے، نہ قدم تھکتے ہیں۔ کچھ اور، کچھ اور کی صدا ہر طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری ہمیشہ اس بات کی متقاضی رہے گی کہ اس پر کسی نئے رخ سے مطالعے کا ڈول ڈالا جائے۔

گھبرائیے نہیں، میں پروین شاکر کو سیفو (قدیم) اور سلویا پلاتھ (جدید) سے مثال دینے کی زبردستی نہیں کروں گا۔ پروین شاکر اس طرح کے تقابل کے بغیر بھی ایک اہم ترین شاعرہ ہے۔ اس کی نظم ہو یا غزل ہر طرح تازہ کاری کا خوبصورت نمونہ، زمانہ آشنا و زمانہ آگاہ ہے۔ لیکن پھر وہی میرے اندر کا مطالبہ کچھ اور، کچھ اور تو جواب میں عرض

Scanned by CamScanner

ہے کہ سرِ دست میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ پروین شاکر کے حوالے سے میرا سرمایہ اس کا ایک خط ہے جو میرے نام پہلا اور آخری خط ہے۔ اس کو اپنے اس مضمون کا تکملہ بناتا ہوں اسے ریکارڈ پر آجانا چاہیے کیونکہ خطوط کسی شخصیت کی کھڑکیاں ہوتی ہیں۔

کپل صاحب

آداب

آپ کا ۴ فروری کا خط مجھے پرسوں پانچ ماہ بعد کالج کھلنے پر ملا۔ پڑھ کر ایک حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ حرف کے رشتے سے ہمارے درمیان اور کتنے رشتے نکل آئے۔ میرے والد اور آپ ہم وطن نکلے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے! پیامی صاحب سے ہمارے براہ راست تعلقات تو نہیں ہیں، لیکن کہیں نہ کہیں بزرگ آپس میں مل لیتے ہیں۔ ان کے علم و ہنر کی میں قدر دان ہوں۔ مارننگ نیوز پڑھتی ہوں لیکن کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

''ترانہ بی بی'' سے صورتاً میں واقف نہیں ان سے کہیے کہ کسی دن فری پریڈ میں آکر مجھ سے ضرور مل لیں۔

آپ میری شاعری سے خوش ہیں یہ آپ کی عنایت ہے اس لیے بھی کہ میرے دل میں آپ کی رائے اور شاعری ہر دو کا بڑا احترام ہے آپ کی نظمیں بے پناہ ہوتی ہیں۔ اتنی بڑی تاخیر قابل معافی تو نہیں لیکن حالات کی نوعیت جان کر آپ یقیناً مجھے معاف کر دیں گے۔

پروین شاکر

Scanned by CamScanner

سیّد مظہر جمیل

سندھی ادب کے عہدِ جدید میں فکشن کے میلانات و رجحانات☆

(افسانہ، ناول، ڈراما)

(۱۹۴۷ تا ۱۹۹۰ء)

مختصر افسانہ

قیامِ پاکستان کے وقت تک سندھی افسانہ کم و بیش نصف صدی کا سفر طے کر چکا تھا۔ خاص طور پر پہلی جنگِ عظیم کے بعد برپا ہونے والی اتھل پتھل اور ذہنی تناؤ سے جو صورتِ حال ابھری تھی، سندھی افسانہ نے اسے بہت حد تک اپنے آپ میں جذب کرلیا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں ان گنت ادارے، رسائل و جرائد، اخبارات و مخزن مصروفِ عمل تھے، جو جدید سندھی فکشن کی توسیع اور مقبولیت میں گوناگوں اضافہ کررہے تھے۔ بول چند راج پال کا رسالہ 'سندھو' جو ابتداً میں شکارپور سے اور بعد میں جیکب آباد سے نکل رہا تھا اور جس میں صفِ اول کے افسانے نگاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ 'سندھی ساہتہ' کے زیرِ اہتمام نکلنے والا رسالہ جو ۱۹۲۵ء سے قیامِ پاکستان تک باقاعدگی سے نکلتا رہا ہے، سندھی فکشن کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لیتا رہا ہے، اس کے علاوہ دوسرے اداروں کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے جرائد بھی سلسلہ وار ناولوں اور طویل افسانوں کی اشاعت کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان رسالوں نے طویل ناول قسط وار شائع کیے تھے۔ وہ غلیق مورائی کا رسالہ 'ترقی' اور قادر بخش نظامانی کا رسالہ 'خلافت' ہے (جس میں ابتداً جمال ابڑو اور ع ق شیخ کی کہانیاں شائع ہوئی تھیں) اس ضمن میں پیش پیش تھے۔ تھانور داس کا 'سستی کتاب سلسلہ' یا مسلم

☆ زیرِ اشاعت کتاب "جدید سندھی ادب... رجحانات و امکانات" کا ایک باب۔

Scanned by CamScanner

ادبی سوسائٹی کے اشاعتی سلسلے ہوں یا نئین سندھ لائبریری، سندھی کتاب گھر، باغی پبلی کیشن، آزاد پبلی کیشن، نئین دنیا، آشا ساہت منڈل، اور اگتی قدم پبلی کیشن وغیرہ اور نہ جانے کتنے ہی دوسرے ادارے، رسالے اور اشاعتی سلسلے تھے جو سندھ کے کم و بیش ہر شہر سے شائع ہو رہے تھے اور جن کی خصوصی توجہ سندھی افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کی اشاعت پر صرف ہو رہی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کراچی میں پچپن ادارے، حیدر آباد میں پینتیس، سکھر میں دس، شکار پور میں دس اور لاڑکانہ میں پانچ ادارے اس نوع کی سرگرمیوں میں مصروف عمل تھے۔ انگریزی، اردو، بنگلہ اور مرہٹی زبانوں سے کہانیوں کے تراجم کا دور ابتدائی عشروں میں مکمل ہو چکا تھا اور چوتھی دہائی تک طبع زاد افسانوں کا ذوق خاصا مستحکم ہو چلا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب لوگوں میں طویل ناول پڑھنے کا چسکہ پڑ گیا تھا جو قسط وار اخبارات و رسائل یا کتابی سلسلوں میں شائع ہوا کرتے تھے جیسے لعل چند امر ڈنومل کی چوبیس اقساط پر مشتمل 'ابھوت ناتھ کی جیوتی' اور کبھی میرومل ساگرانی کی ناول 'ہر دل عزیز' جو اٹھائیس قسطوں میں چھپی، یا عثمان ڈیپلائی کی نیم تاریخی، نیم رومانی ناول جو سال ہا سال قسط وار شائع ہوتے تھے۔ اس عہد میں موضوعاتی اعتبار سے بھی زیادہ وسیع تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ چناں چہ اس زمانے میں رومانی افسانے اور ناول بھی لکھے جا رہے تھے، دھارمک کہانیاں بھی چھپ رہی تھیں، سنسنی خیز جاسوسی و سستی جذباتیت سے لب ریز جنسی کتابیں بھی دھڑا دھڑ شائع ہو رہی تھیں لیکن یہی وہ دور بھی ہے جس میں چند باشعور اور ترقی پسند فکر رکھنے والے فن کاروں نے سندھی افسانے کو سوشل ریئلزم یعنی سماجی حقیقت نگاری کی طرف مائل کیا تھا اور سندھی فکشن کو بے سمتی کے صحرا میں بگولے کی طرح بھٹکتے رہنے کی بجائے سندھی معاشرے کی حقیقی صورت حال سے منسلک کر دیا تھا۔ حقیقت نگاری کے اس رجحان کے تحت ہی سندھی فکشن کی بے چہرگی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی اور اس کے اپنے نین نقش اور رنگ روپ ابھرنے لگے تھے۔ سماجی حقیقت نگاری کے حامل جدید افسانے کے ابتدائی خدمت گزاروں میں مرزا نادر بیگ، عثمان علی انصاری، امرلال ہنگورانی، آسانند مامتورائے، گوبند مالھی، تارا چند بھٹیلی، آنند گولانی، رام لعل پنجوانی، لچھمن راجپال، کیرت بابانی، پوپٹ پنجوانی جیسے لوگ شامل تھے۔ عثمان علی انصاری کے

افسانوں کا مجموعہ 'گنج' ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکا تھا اور اس میں شامل افسانے سماجی حقیقت نگاری کے ابتدائی عکس تھے، جن میں سندھی معاشرہ سانس لیتا اور سندھی کردار چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ مرزا نادر بیگ کی کہانیوں کا مجموعہ 'نادر بیگ مرزا جی کہانیوں' ان کی وفات (۱۹۴۰ء) کے بعد کم وبیش ساٹھ سال کی تاخیر سے شائع ہوا تھا لیکن سماجی حقیقت نگاری کے ابتدائی دور میں مرزا نادر بیگ کی کہانیوں سے صرف نظر ممکن ہی نہیں۔ مرزا نادر بیگ، مرزا قلیچ بیگ کے فرزندِ ارجمند تھے، وہ ایک پڑھے لکھے اور عالمی ادب سے روشناس شخص تھے اور جدید افسانہ نگاری کے فن پر گہری نگاہ رکھتے تھے، چناں چہ ان کی کہانیوں میں سماجی مسائل اور انسانی سرگزشت کا حال تمام تر دروبست کے ساتھ ملتا ہے۔ ان کا اسلوب اتنا سادہ، پُرکار اور زندگی سے قریب تر ہے کہ آج بھی دل کشی رکھتا ہے۔ اسی طرح امر لال ہنگورانی کے فنی کمال کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے صرف 'ادو عبدالرحمٰن' جیسی شاہکار کہانی کا نام لے لینا کافی ہوگا۔ جو پون صدی گزر جانے کے باوجود اب بھی اتنی ہی تازہ اور موثر ہے جتنی کہ اپنے زمانۂ تخلیق میں تھی۔ تیز پرواز وقت ہے کہ اڑا جاتا ہے مگر اس دور کی بعض کہانیوں کی مقبولیت اور دل کشی میں کمی نہیں آنے پاتی۔ امر لعل ہنگورانی کی کہانی 'ادو عبدالرحمٰن' (بھائی عبدالرحمٰن) اب تک جدید افسانہ نگاروں کے لیے ایک معیار اور چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں یہ کہانی نبل رام اڈوانی کے مرتب کردہ انتخاب Short sotries of Indian life میں انگریزی روپ میں شامل ہوئی اور اس وقت سے اب تک متعدد عالمی انتخابات اور انتھرولوجیز (Anthrologies) میں شامل ہوتی رہی ہے۔ اسے بین الاقوامی شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب پچاس کی دہائی میں اسے یونیسکو کے زیرِ اہتمام مرتب کردہ انتھالوجی 'دنیا کی بہترین کہانیوں' میں شامل کیا گیا۔ سندھی افسانے میں امر لعل ہنگورانی کی کہانی 'ادو عبدالرحمٰن' کو وہی اہمیت اور فضیلت حاصل ہے جو اردو میں پریم چند کی کہانی 'کفن' کو حاصل ہے۔ ہر چند دونوں کہانیوں کے موضوعات اور انداز نگارش ایک دوسرے سے قطعی جدا ہیں۔ لیکن جس طرح 'کفن' کے تذکرے کے بغیر اردو افسانے کا جائزہ مکمل نہیں ہوتا، اسی طرح سندھی افسانے کی تاریخ میں 'ادو عبدالرحمٰن' کا ذکر ضرور قرار پاتا ہے۔ مذکورہ بالا جائزے کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی

Scanned by CamScanner

کی چوتھی دہائی کے خاتمے تک جدید سندھی افسانہ اپنے خد وخال واضح کر چکا تھا اور اس کی ایک شناخت بھی قائم ہو چلی تھی۔

قیام پاکستان کے آس پاس شیخ عبدالرزاق راز کے افسانے بھی سندھ کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر عوامی توجہ مبذول کر چکے تھے۔ لطف اللہ بدوی کے افسانوں کا مجموعہ 'دستۂ گل' بھی شائع ہو چکا تھا۔ ہر چند مرزا نادر بیگ ۱۹۴۰ء میں انتقال کر چکے تھے لیکن ان کے منتخب افسانوں یعنی 'موہن جی ڈائری'، 'موہنی بے دل جی دھڑکن'، 'موہنی جی آہ'، 'پاک محبت'، 'عینک جو آواز' اور 'مس رستم جی' جیسے افسانوں کی گونج ابھی تک موجود تھی۔ پیر حسام الدین راشدی کا افسانہ 'انارکلی' اور عبداللہ عبد کا 'ماستریانی' ابھی تازہ تازہ تھے لیکن اصل دھما کا شیخ ایاز کے افسانوں کے مجموعہ 'سفید وحشی' نے کیا تھا جو ۱۹۴۷ء کے اوائل میں شائع ہوا تو حکومت وقت نے اسے فی الفور بحق سرکار ضبط کر لیا۔ اس اعتبار سے شاید شیخ ایاز پہلے ادیب تھے، جن کی تخلیقی کتاب 'بغاوت' کے الزام میں بحق سرکار ضبط ہوئی ہے۔ 'سفید وحشی' محض ایک افسانوی مجموعہ نہیں تھا بلکہ اس کی ادبی قدر و قیمت اور درجہ بندی سے قطع نظر اپنے انوکھے موضوعات اور نئے اسلوب کی بنا پر اس مجموعہ نے نئی نسل کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ لیکن اس دور میں شیخ ایاز تنہا نہ تھے بلکہ ترقی پسند لکھنے والوں کا ایک سلسلہ تھا جنھوں نے سندھی افسانے کو سماجی حقیقت نگاری کے متنوع رنگوں سے دیدہ زیب اور جاذب توجہ بنا رکھا تھا۔ ان میں گلی سدا رنگانی کی طویل کہانی (ناولٹ) 'اتحاد'، تارا میر چندانی کی کہانی 'کومل کلی'، جشو کیول رامانی کی 'پدما' شیخ عبدالستار کی 'رحیما'، آنند گولانی کی 'سنگ' اور سائیں داد سولنگی کی 'ملاقات' ایسی کہانیاں تھیں جنھوں نے سندھی افسانے کے دامن کو متعدد جان دار اور پرتاثر کہانیوں سے بھر دیا تھا... آنند گولانی، گوبند مالھی اور گوبند پنجابی اپنی اپنی جگہ نہایت اہم اور معتبر لکھنے والے تھے جن کی ادبی و تخلیقی تگ و تاز نے سندھی ادب کو بارونق بنا رکھا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان سب لوگوں کے ہجرت کر جانے کی بنا پر یہاں سے وہاں تک ایک سناٹا سا گونجنے لگا تھا۔

یوں بھی یہ زمانہ عجب افراتفری اور شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ سرحد کے دونوں طرف مذہب کے نام پر موت اور ہلاکت نے وہ بھیانک کھیل کھیلا تھا کہ خدا کی پناہ، لاکھوں انسان آزادی کی دیوی کے حضور بھینٹ چڑھا دیے گئے تھے اور ان گنت

شکستہ دل اور دریدہ بدن قافلے تھے جو آگ اور خون کے ابلتے ہوئے وحشت آثار طوفانی دھاروں میں دھکیل دیے گئے تھے کہ جو خوش قسمت اس جہنم سے زندہ سلامت نکل آئیں گے وہ ریزہ ریزہ بکھری ہوئی زندگی کو پھر پلکوں سے سمیٹنے پر مامور کر دیے جائیں گے۔ بے شک اس ماحول میں بھلا کہاں کا ادب؟ اور کیسی ثقافت! اور بقول شخصے:

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل   کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

سندھ سے ہجرت کر جانے والوں میں سندری اتم چندانی، پروفیسر رام پنجوانی، گوبند مالھی، گوبند پنجابی، آنند گولانی، کشور، جگدیش بچھانی، برج موہن، کلا پرکاش، لعل پشپ، سگھن آہوجا، کماری پوپٹی ہیرانندانی، امرلال ہنگورانی، نارائن شیام، جیے سنگھانی، کیرت بابانی وغیرہ جیسے ترقی پسند لوگ شامل تھے جن کے دم سے سندھ کا ادبی افق جگمگاتا تھا۔

سندھ کا شہری معاشرہ بالعموم ہندو آبادی پر مشتمل تھا اور ان لوگوں کے جاتے ہی شہر کے شہر سنسان اور خالی لگنے لگے تھے۔ تا آں کہ اس خلا کو ہندوستان سے آنے والے مہاجرین نے پُر کیا۔ شہروں میں مہاجروں کے مجتمع ہو جانے کا ایک بنیادی سبب بھی یہی رہا ہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ادبی محفل میں قدرے خاموشی طاری رہی تھی، جو تھوڑی بہت چہل پہل تھی بھی تو وہ شعری محفلوں تک محدود تھی جہاں فوری ردِعمل کے اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آتی ہے، اردو لکھنے اور بولنے والوں کی آمد اور اشتراکِ عمل سے مشترکہ سندھی اردو مشاعرے اور کانفرنسیں بھی منعقد ہو رہی تھیں اور ابتدا میں یوں لگتا تھا جیسے سندھ میں دو لسانی اور مخلوط تہذیبی معاشرہ وجود پانے لگا ہو لیکن آہستہ آہستہ اہلِ سیاست اور گروہی مفادات نے ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا اور شہری و دیہی معاشروں کے مابین معاملات بیگانگیت کی طرف پیش قدمی کرتے چلے گئے، جو یقیناً ایک افسوس ناک امر تھا۔ چناں چہ اس وقت بوئی گئی زہریلی فصل آنے والے عشروں میں کاٹی گئی بلکہ اہلِ سندھ اب تک اس کی زہرناکی کے صدمات جھیل رہے ہیں۔

اس عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ عبدالرزاق راز نے اپنے مضمون "

افسانے کا فنی جائزہ' میں لکھا تھا:

''مختصر افسانہ دراصل ترقی پسند تحریک ہی کی توسیع ہے۔ جس کے بانی گوبند مالھی، کیرت بابانی، سوبھو گیان چندانی، شیخ ایاز اور رام پنجوانی وغیرہ تھے اسی تحریک کے زیر اثر 'ریگستانی پھول'، 'سفید وحشی'، 'لہریں'، 'طلوع صبح'، 'آگتے قدم' جیسے افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے تھے جو سندھی مختصر افسانے کے سفر میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں...''

ہندوؤں کے ترک وطن کر جانے کے بعد اس صنف پر جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ جسے شیخ ایاز کے مجموعہ 'پنھل کھاں پوء' (پنھل کے بعد) نے توڑا۔ اس مجموعہ میں 'پنھل کھاں پوء' نامی کہانی کے علاوہ سب افسانے وہ تھے جو شیخ ایاز کے پہلے مجموعہ 'سفید وحشی' میں شامل تھے۔

'پنھل کھاں پوء' (پنھل کے بعد) کے ساتھ ہی شیخ عبدالرزاق راز کے افسانوں کا مجموعہ 'ڈاک بنگلو' شائع ہوا اور اسی زمانے میں مقبول صدیقی (مرحوم) کی مرتب کردہ انتھالوجی 'گل اور مکھڑیوں' (پھول اور کلیاں) منظر عام پر آئی جس میں متعدد نوجوان افسانہ نگاروں کی کہانیاں شامل تھیں۔ شیخ ایاز کی کہانی کے مجموعے 'سفید وحشی' اور 'پنھل کھاں پوء' کے تیس پینتیس سال کے بعد ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ 'جی تند برابر توریاں' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں بعض کہانیاں پہلے دو مجموعوں ہی سے لی گئی تھیں۔ گویا اس پورے دور میں شیخ ایاز افسانہ نگاری سے دامن گریزاں رہے ہیں۔

شیخ ایاز کے منتخب افسانوں میں 'سفید وحشی'، 'ٹھکلی'، 'مسافر کرانی'، 'رفیق'، 'چار ایکڑ زمین'، 'کارو رنگ' اور 'نوراں' وغیرہ عہد ساز کہانیاں تھیں۔ ان افسانوں میں زندگی کا ناظر وسیع ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ اس وقت جاری تحریک آزادی کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد اس دور کے فکشن کا ایک مرغوب موضوع تھا، چناں چہ شیخ ایاز کے افسانوں میں اس معاصرانہ رجحان کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ 'نوراں'، 'ٹھکلی'، 'کارو رنگ' وغیرہ ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں ہیں۔ یہی وہ دور تھا جب سندھی ادب میں طبقہ وارانہ جانب داری کا رجحان بھی پیدا ہو چلا تھا اور سندھ کے ترقی پسند تخلیق کار، محنت کش اور مظلوم طبقات کے ساتھ اپنی جانب داری کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ شیخ ایاز کے افسانے 'رفیق' میں مزدوروں اور

Scanned by CamScanner

محنت کشوں کے درمیان باہمی یک جہتی کا شعور اور مشترک احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔ لیکن ان کہانیوں میں شیخ ایاز کی کہانی 'چار ایکڑ زمین' سندھ کے دیہی معاشرت کی ناآسودہ فضا کو جس موثر انداز میں پینٹ (paint) کرتی ہے، اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اس کہانی میں غریب کسانوں اور ہاریوں کی زمین سے وابستگی اور ان کی زندگی میں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور کھیتی باڑی کے لیے پانی کی دستیابی کی جو اہمیت تھی ہے اور ان چیزوں کے حصول کے لیے اُن محروم لوگوں کے درمیان جیسی گھناؤنی کش مکش، دشمنیاں اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو شیخ ایاز نے نہایت فن کارانہ انداز سے دکھایا ہے۔ شیخ ایاز کے افسانوں نے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو جتنا متاثر کیا ہے، اتنا اثر نئی نسل کے لکھنے والوں نے کہیں اور سے قبول نہیں کیا ہے... اسی لیے شیخ عبدالرزاق راز اور آغا سلیم نے شیخ ایاز کو عہد ساز افسانہ نگار کہا ہے۔

اصل بات یہی ہے کہ ابتدائی برسوں کے بعد شیخ ایاز کی تخلیقی توجہ افسانے سے ہٹ کر شاعری کی گرویدہ ہو کر رہ گئی تھی اور اسی طرح عبدالرزاق راز بھی ابتدائی مجموعہ کے بعد کوئی غیر معمولی افسانہ نہ لکھ سکے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کہانیوں کے مجموعے 'ڈاک بنگلے' نے سندھی افسانے کے ٹھہرے ہوئے پانی کو متحرک کر دیا تھا۔ شیخ عبدالرزاق راز کے اہم افسانوں میں 'ڈاک بنگلو'، 'ناکام محبت' اور 'گریجویٹ' یادگار کہانیاں ہیں۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں کئی افسانہ نگار سامنے آئے ہیں اور سندھی رسائل و جرائد میں افسانے کے نام پر بہت کچھ شائع ہونے لگا تھا لیکن تخلیق کا جوہر قابلِ ذکر جن لوگوں کے ہاں جھلک دکھا سکا، ان میں جمال ابڑو، ایاز قادری، بشیر موریانی، ابن الیاس سومرو، دل دار حسین موسوی اور نجم عباسی کے نام اہم ہیں۔ ان میں نجم عباسی کے بعض افسانے قیامِ پاکستان سے قبل بھی شائع ہو چکے تھے۔

تقسیم سے قبل لکھنے والوں میں لطف اللہ بدوی اور محمد عثمان ڈیپلائی بھی شامل تھے۔ لطف اللہ بدوی اور عثمان ڈیپلائی خاصے زود نویس افسانہ نگار تھے، انھوں نے بہ اعتبارِ کمیت بہت زیادہ لکھا ہے۔ عثمان ڈیپلائی تو کمرشل ضرورتوں کے لیے یعنی اپنے ہی قائم کیے ہوئے اشاعتی سلسلے کے لیے بھی لکھتے تھے لہٰذا وہ معیار جو خود ان کی بعض

Scanned by CamScanner

تحریروں نے قائم کر دیا تھا، سب کہانیوں میں قائم نہیں رکھا جا سکا تھا۔ عثمان ڈیپلائی کی نمائندہ کہانیوں میں ''گاموں جا گنتا'' (گاموں کی باتیں)، ''جیکو ماں ڈٹھو'' (جو میں نے دیکھا)، ''نرالا نظارو'' اور ''جیل جو مشاہدو'' (جیل کا مشاہدہ) شامل ہیں۔

اسی دور میں ابراہیم خلیل شیخ (جو بنیادی طور پر شاعر تھے) کے نفسیاتی افسانوں کا مجموعہ ''عبرت کدہ'' کے نام سے بھی سامنے آتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر ابراہیم خلیل شیخ نے نفسیاتی معالج ہونے کی حیثیت سے اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہانیاں لکھی تھیں۔

اس دور کے سب سے اہم اور رجحان ساز افسانہ نگار جمال ابڑو، ایاز قادری، بشیر موریانی اور غلام ربانی آگرو ہیں کہ ان لوگوں نے نہ صرف اپنے عہد کے افسانوں کی صورت گری کی ہے بلکہ سندھی افسانے کو ایک خاص ڈگر پر ڈالا اور سماجی حقیقت نگاری کی اس روایت کو جو ان کے پیش رو ڈال گئے تھے، زیادہ بامعنی، وسیع اور متنوع بنایا ہے۔ جمال ابڑو کے افسانوں کا مجموعہ ''پشو پاشا''، ایاز قادری کا مجموعہ ''بلو دادا'' اور غلام ربانی آگرو کی کہانی کا مجموعہ ''آب حیات'' کے نام سے شائع ہو چکے تھے جب کہ بشیر موریانی کی کہانیاں 'چھری'، 'پریم'، 'ٹیکری'، 'زندگی جو روگ' وغیرہ قبولِ عام حاصل کر چکی تھیں۔ بشیر موریانی کا حال میں شائع شدہ ایک افسانہ ''کاہین جو کمال'' شائع ہوا تھا جو سندھی کے منتخب افسانوں میں شامل ہونے کے قابل ہے۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے 'اجنبی' اور 'زندگی جی راہ پر' بہت عرصے قبل شائع ہو چکے ہیں۔

اس دور کے نمائندہ افسانوں میں ایک خاص رجحان نمایاں طور پر دیکھنے میں آتا ہے جس کی طرف آغا سلیم نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ 'نئیں زندگی' کراچی (جنوری ۱۹۶۸ء) میں اشارہ کیا ہے اور وہ ہے سندھی معاشرے میں ایک نئے ابھرتے ہوئے کردار کی پیش کش۔ یہ ایک 'شریف بدمعاش' (Rouge Gentleman) کا کردار ہے جو شہری اور قصباتی معاشرے میں پیدا ہو رہا تھا اور جس کی جھلکیاں جمال ابڑو نے اپنی کہانیوں 'بدمعاش' اور 'پشو پاشا' میں، ایاز قادری نے 'بلو دادا' میں، غلام ربانی آگرو نے 'شیدو دھاڑیل' میں دکھائی ہیں۔

یوں تو اس دور نے کئی قد آور افسانہ نگار پیدا کیے ہیں، جن میں جمال ابڑو، ایاز قادری، غلام ربانی آگرو، حمید سندھی، بشیر موریانی، حفیظ شیخ، سراج الحق میمن، مرزا

Scanned by CamScanner

مراد علی، ح ق شیخ، بیگم زینت چنہ، کرور پتی، علی احمد بروہی، رشید بھٹی، ثمیرہ زریں، جمال رند، خواجہ سلیم وغیرہم شامل ہیں۔ مذکورہ صاحبانِ قلم آگے پیچھے ہی افسانے کی بزم میں شامل ہوئے تھے اور ان میں سے بیش تر نے بعض ایسی لافانی کہانیاں لکھی ہیں کہ ان سب کا جدا جدا تذکرہ کیے بغیر کوئی تجزیہ مکمل نہیں کہلا سکتا۔

ہر چند جمال ابڑو بھی بھی زود نویس فن کار نہیں رہے ہیں اور انھوں نے مقدار کے اعتبار سے بعض ہم عصروں کے مقابلے میں بہت کم لکھا ہے لیکن جتنی بھی کہانیاں انھوں نے لکھی ہیں، ان میں اکثر و بیش تر نہایت معیاری ہیں۔ ایک مدت تک نئے لکھنے والوں میں جمال ابڑو کی کہانی اور ان کے طرزِ ادائیگی کو مثالی سمجھا جاتا رہا ہے۔ جمال ابڑو کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہی ہے کہ انھوں نے سندھی افسانے کو موضوع کی کشادگی بھی دی اور تنوع بھی دیا ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے افسانے کے دامن کو سندھ کی معاشرتی معروضیت سے بھی باندھے رکھا۔ جس نے جمال ابڑو کے افسانے کو سندھی معاشرے کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ انھوں نے سندھی معاشرت کے تمام تر حسن، ساری خوبیوں اور سب محرومیوں، نا آسودگیوں اور الجھنوں کو اپنے افسانوں میں نہایت فن کارانہ طور پر گوندھ دیا ہے۔ چناں چہ سندھی معاشرت کے سب رنگ جمال ابڑو کی کہانیوں میں جھلکتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی دوسری خوبی کردار نگاری، فضا سازی اور زبان کا استعمال ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات بھی دیہی زندگی سے حاصل کیے ہیں۔ جمال ابڑو ایک ایسے حقیقت نگار ہیں جو حقیقت نگاری کو فنی در و بست کے تابع رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے مؤثر حسن کار ہیں جو اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ کون سی بات کب، کہاں اور کس طرح کہی جانی چاہیے... جمال ابڑو نے اپنی کہانیوں میں جتنے لازوال اور یادگار کردار پیش کیے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ 'پسو پاشا' اور 'بدمعاش' کے علاوہ 'خمیسو جو کوٹ' میں صرف خمیسو کا کردار ہی جان دار نہیں ہے بلکہ خمیسو کا گرم کوٹ بھی ایک زندہ کردار کے طور پر ابھرتا ہے۔ اسی طرح 'پیرانی' کا کردار سندھ کی فلاکت زدہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ کہانی 'بدتمیز' میں انسانی اقدار کی زبوں حالی کا ماتم کیا گیا ہے اور 'شاہ جو پھر' میں ذات پات اور جہالت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے معصوم لوگوں کی مجبوریوں کا احوال لکھا گیا ہے۔ 'ماں جی جھولی' میں عورت کی ممتا اور انسان سے پیار کی کہانی ہے۔ غرض ان سب

Scanned by CamScanner

کہانیوں میں جمال ابڑو زندگی کو بہت قریب سے پیش کرتے ہیں اور ان کی بنائی ہوئی تصویریں واضح اور روشن ہیں، بعض ناقدین کا خیال ہے کہ جمال ابڑو کی کہانیوں میں کرشن چندر کے اسلوب کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن یہ خیال بہت زیادہ درست نہیں ہے کہ جمال ابڑو کا منفرد طرزِ نگارش خاص مقامی فضا سے ابھرتا ہے۔

بشیر موریانی قیامِ پاکستان کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں اور شاعروں میں اپنی جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی بنا پر خاصی مدت تک تخلیقی سرگرمیوں کو زیادہ فعال نہیں رکھ سکے تھے لیکن انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری میں جو کچھ تخلیق کیا ہے وہ منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بات نہایت خوش گوار ہے کہ ایک طویل عرصے کے تعطل کے بعد ان کا قلم پھر رواں ہونے لگا ہے اور انھوں نے تلے اوپر کئی عمدہ کہانیاں لکھی ہیں۔ یوں تو ان کی کہانیاں 'کیکری' اور 'زندگی کا روگ' اپنے عہد کی نمائندہ کہانیاں تھیں اور ان میں سندھ کے فلاکت زدہ معاشرے کی معروضی صورت حال کی عکاسی ہوئی ہے۔ لیکن بشیر موریانی کی کہانی 'بریم' اپنے منفرد موضوع اور ٹریٹمنٹ کی وجہ سے نہایت مؤثر اور یاد رکھے جانے والی کہانی ہے۔ اس میں ایک ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے جسے شروع ہی سے محبت، یگانگت اور اپنائیت سے محروم کیا جاتا رہا ہے اور زندگی کا ہر دور اس کی نفسیاتی ناآسودگیوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ انسانوں کی بھری پُری زندگی سے مایوس ہوکر بلیوں سے جی لگا کے آسودہ خاطری حاصل کرتا ہے، یہ ایک ذہین اور صاحبِ صلاحیت کردار کے اخلاقی طور پر معدوم ہونے کی کہانی ہے۔ اس کہانی کی خوبی صرف اس کا موضوع ہی نہیں ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال اس کا مؤثر طریقِ اظہار ہے کہ بشیر موریانی نے ایک نازک موضوع کو نہایت مضبوط اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے اور کہانی کے ٹریٹمنٹ کو کہیں لاؤڈ (loud) نہیں ہونے دیا ہے۔

۱۹۶۰ء۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے افسانہ نگاروں میں ع۔ق۔ شیخ، ابنِ حیات پنھور، عبدالرحیم جونیجو، شیخ حفیظ، علی احمد بروہی، غلام علی کھوکھر، رشید بھٹی اور مقبول صدیقی، شمشیر الحیدری، حسینی محمد حافظ ٹھکرائی، عبدالجبار شام، نور عباسی، شیر علی خواجہ، قمر و زرینہ،

رشیدہ حجاب، بیگم زینت علی چنہ، امینہ بالیپوٹہ، رعنا حیدر آبادی، قاضی اختر موورائی، ساقی سجاولی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان لوگوں میں سے بیش تر نے اچھی کہانیاں لکھی تھیں اور اپنے عہد کی حقیقت پسندانہ عکاسی بھی کی تھیں اور سندھی افسانے کی تعمیر میں ان لوگوں کی عملی شراکت سے صرف نظر ممکن نہیں، لیکن ان میں سے بعض لکھنے والے افسانہ نگاری سے زیادہ نبھاؤ نہ کر سکے اور بالآخر شاعری کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے لگے جیسے شمشیر الحیدری اور بعض اصحاب ادب کی دنیا ہی سے کنارہ کش ہو گئے۔

اس عہد کی نمائندہ کہانیوں میں جمال ابڑو کے افسانے 'پشو پاشا'، 'شاہ جو چھر'، 'بدمعاش' وغیرہ منفرد افسانے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جمال ابڑو جیسا پُرفن افسانہ نگار اپنے ابتدائی دور ہی میں ادبی دنیا سے کنارہ کش ہو گیا اور سندھی افسانہ نگاری کی بساط کو ان جواہر پاروں سے محروم کر گیا جن کی اس سے بجاطور پر توقع کی جا رہی تھی۔ جمال کا کل ادبی اثاثہ درجن ڈیڑھ درجن افسانوں سے زائد نہیں ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی ہے اور بعد 'کاروکاری' کے مسئلے پر اس کی کہانی ''سینڈ'' سامنے آئی ہے جو اس کی پچھلی کہانیوں ہی کی طرح معیاری ہے۔

ایاز قادری کی نمائندہ کہانیوں میں 'بلو دادا'، 'ماں انسان آھیاں' اور 'جواب دار غیرت' وغیرہ اہم کہانیاں ہیں۔ غلام ربانی آگرو کی کہانی 'آب حیات'، 'شیرو دھاڑیل' (شیرو بدمعاش)، 'بری حسن بھنبھور' عہد ساز کہانیاں ہیں۔ اسی طرح ع ق شیخ کی کہانی 'حیدرآباد' اور 'پریشان انسان'، 'حکومت' وغیرہ اور حفیظ شیخ کی کہانی ''اماں ماں اسکول نہ ویندس'' (اماں میں اسکول نہ جاؤں گا) نہایت مؤثر اور حقیقت پسند کہانیاں ہیں۔ حفیظ شیخ کی کہانی میں اس نے تعلیمی نظام کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ اسی طرح ''فقیر رمندا رھیا'' (فقیر گھومتے رہے) بھی معرکہ کی کہانی ہے۔ اس کا مجموعہ ''ساگر جی لہرن تی'' (ساگر کی لہروں پے) بہت پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ افسوس حفیظ شیخ کی ناگہانی اور بے وقت موت سے جدید افسانہ بہتر امکانات سے محروم ہو گیا ہے۔

ابنِ حیات پنھور کی کہانی ''واہ وڈیرہ'' انسانی نفسیات کے ایک نہایت دلچسپ پہلو کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ اس میں دیہی ماحول کی

اس ماحول میں وڈیرے اور اس کے کارندوں کی ملی بھگت سیاست اور غریب ہاری کی کس پرسی کی تصویر اتاری گئی ہے۔ ابن الیاس سومرو کی کہانیوں میں 'نیوں شکار' (نیا شکار) اور 'اختیار' قابل ذکر کہانیاں ہیں۔ شمشیر الحیدری کی کہانیوں میں 'مہران کی بیٹی'، 'پورس کے ہاتھی' دلچسپ کہانیاں ہیں۔

بیگم زینت چنہ پہلی افسانہ نگار خاتون ہیں جو قیام پاکستان کے بعد ابھری ہیں ورنہ اس سے پہلے کے دور میں جو دو ایک ہندو خواتین کہانی کار تھیں، ہجرت کر کے ہندوستان جا چکی تھیں اور بزم افسانہ میں خواتین کی نمائندگی باقی نہ رہی تھی۔ اس کمی کو بیگم زینت چنہ نے نہایت خوش اسلوبی سے پر کیا ہے۔ وہ اپنے فن کی ایسی بلندی پر ہیں کہ ان کے افسانوں کو زنانہ اور مردانہ خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا کیوں کہ وہ اپنی قوت مشاہدہ اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے اس اعلیٰ درجے پر فائز ہیں جو کسی بھی باصلاحیت فن کار کی منزل ہوسکتی ہے۔ وہ بے شک زود نویس کہانی کار نہ تھیں لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں سے بیش تر کہانیاں اچھی اور قابل انتخاب رہی ہیں بلکہ ان کی کہانی 'منھی' (پیار، محبت)، 'اوندھی' (کالی آندھی) اور 'راند ریکو' (تماشا، کھیل) اپنے عہد کی نمائندہ کہانیوں میں شامل ہیں۔

اسی دور میں علی احمد بروہی، محمد حسین کروڑ پتی، رشید بھٹی اور عثمان ڈھلگری طنز و مزاح کے گل زار کھلاتے رہے ہیں۔ علی احمد بروہی بنیادی طور پر صحافی رہے ہیں، چناں چہ انھوں نے اپنی طنزیہ مزاحیہ تحریروں سے سندھ کے اخبارات و رسائل کو عام عمر ثروت مند بنائے رکھا تھا اس دوران انھوں نے بعض فرضی ناموں سے بھی لکھا ہے لیکن ان کی طنزیہ مزاحیہ تحریریں جو افسانہ کے ذیل میں رکھی جاسکتی ہوں بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن جو ہیں وہ منتخب ہیں۔ علی احمد بروہی کا افسانہ کردار سازی اور ماحول کی حقیقت پسندانہ عکاسی سے پیدا ہوتا ہے۔ ''چاچی جیونی'' کا کردار ایسے ہی کرداروں میں شامل ہے۔ ان کی کہانی ''عثمان حجام کا روزہ''... ایک بے مثال طنزیہ کہانی ہے جو ہمارے معاشرے کے تاریک گوشوں میں چھپی حقیقتوں کو آشکارا کرتی ہے۔

رشید بھٹی بھی اپنے عہد کے نہایت اہم اور بڑے طنز نگار تھے، وہ بھی اپنی بے وقت جوان مرگی سے سندھی افسانے کے امکانات کو ماند کر گئے ہیں۔ اگرچہ رشید بھٹی

نے قیامِ پاکستان کے بعد ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور پانچویں دہائی میں وہ ایک ذمہ دار اور اہم طنز نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، ان کے افسانے اس دور میں ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو کر اپنی داد بھی حاصل کر چکے تھے، ان کے افسانہ کا مجموعہ ''گھڑی گھڑی حک گھاؤ'' (گھڑی گھڑی ایک گھاؤ) انیس سو ساٹھ میں شائع ہوا تھا جس میں شامل کہانیاں ان کے بہتر مستقبل کی نشان دہی کر رہی تھیں لیکن زندگی نے مہلت ہی نہ دی کہ وہ سندھی افسانے کے دامن کو اپنی تخلیقات سے مزید سنوارتے۔ رشید بھٹی کی منتخب کہانیوں میں 'خداداؤ'، 'میرل'، 'پاچھوڑ' (جزرس)، 'حک رپے جو نوٹ' (ایک روپے کا نوٹ) اور 'اوسیڑو' (انتظار) وغیرہ شامل ہیں۔

پانچویں اور چھٹی دہائی کے دوران سندھی افسانے نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے تازہ دم لکھنے والوں کے گروہ در گروہ افسانہ نگاری کی محفل میں داخل ہوئے ہیں۔ افسانہ نگاری اس دور کی مقبول ترین صنف تھی۔ سندھی افسانے کی ترقی و توسیع میں ہر دور میں ادبی و نیم ادبی رسائل و جرائد اور کتابی سلسلوں نے اہم کردار ادا کیے ہیں، کیوں کہ یہی وہ ذرائع ہیں جن سے ترسیلِ ادب ممکن ہوتی ہے۔ یعنی ادبی تخلیقات کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہی تخلیق کی شمع کو روشن رکھتی ہے۔ ورنہ اس کے روشن رہنے کا جواز ہی نہیں رہتا، چناں چہ اس دور میں بھی کئی نئے اور تازہ ادبی و نیم ادبی اخبارات، رسالے اور کتابی سلسلے جاری ہوتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۴۱ء میں کراچی سے میر قادر بخش نظامانی نے ہفت روزہ رسالہ 'خلافت' نکالا تھا، جس میں جمال ابڑو اور ع۔ق شیخ وغیرہ کی اہم کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ ۱۹۵۱ء میں خان بہادر محمد صدیق میمن کی زیرِ نگرانی حیدرآباد سے 'سندھی ادبی رسالو' شائع ہوا تھا۔ کراچی سے 'نئیں زندگی' اور حیدرآباد سے سہ ماہی رسالہ 'مہران' اور ماہنامہ 'سوہنی' کی اشاعت جدید سندھی ادب کی تاریخ کے اہم واقعات تھے، ان رسالوں نے اپنی اپنی جگہ سندھی ادب کی نہایت گراں قدر خدمات ادا کی ہیں۔ خاص طور پر سہ ماہی رسالے ''مہران'' نے سندھی ادب کی ترقی و توسیع میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کا ذکر کیے بغیر جدید سندھی ادب کا کوئی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا کہ اس رسالے میں کسی ادبی تخلیق کا شائع ہو جانا ہی اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ تخلیق ادبی

Scanned by CamScanner

معیار پر پورا اترتی ہے۔ اس سلسلے میں جناب ابراہیم جویو کی خدمات سنہری الفاظ میں لکھی جاتی رہیں گی کہ انھوں نے نہ صرف سندھی ادب کی ترقی و ترویج میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں بلکہ نئی نسلوں میں ادب کا صحیح ذوق بھی پیدا کیا ہے اور تازہ واردانِ ادب میں چھپے ہوئے تخلیقی جوہر کو تلاش کیا ہے جو بجائے خود عہد ساز فریضہ تھا۔

اس زمانے میں حیدرآباد سے نکلنے والے رسالوں میں ماہوار 'روح ادب'، ماہنامہ 'فلمی دنیا'، سہ ماہی 'شاعر'، 'پرہ پھٹی'، 'ماروی' اور 'ہلال پاکستان' اور 'عبرت' کے ماہانہ ایڈیشنوں نے سندھی افسانے کی ترقی و توسیع میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔ اس ضمن میں سکھر سے جاری ہونے والے ماہوار تقاضا، اگنی قدم ہالا کے ماہنامہ فردوس، نواب شاہ کے ماہ وار رسالے 'ادا'، 'آئینہ' اور 'رہنما'، دادو کے 'اسان جی منزل' وغیرہ ایسے رسالے ہیں، جن کی بروقت اشاعت نے جدید سندھی ادب بالخصوص سندھی افسانے کے فروغ میں اہم کردار انجام دیے ہیں۔ ان رسائل و جرائد میں بہت معیاری، کم معیاری اور غیر معیاری کہانیاں بھی شائع ہوتی رہی ہیں لیکن کسی بھی عہد کی ادبی قدر و قیمت اس دور میں چھپنے والے رطب و یابس سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس ڈھیر میں چمکتے ہوئے جوہر پارے ہی اپنے عہد کی اقدار کا تعین کرتے ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ مذکورہ بالا سطور میں کیا جا چکا ہے۔

یہاں ایک لمحے کو رک کر قیامِ پاکستان کی ابتدائی دہائیوں میں لکھے گئے افسانوں پر ایک نگاہ ڈال لی جائے تو اس دور کی افسانوی تخلیقات میں ہمیں مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آئیں گی:

(۱) اس عہد کا افسانہ بتاتا ہے کہ وہ اب گھٹنے گھٹنے رینگنے کی بجائے ہمک کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا ہے اور ہمت کر کے اکا دکا قدم بھی بڑھانے لگا ہے۔ گویا اس کا عہد طفولیت رخصت ہوا اور اب وہ ایک ذمہ دار صنف کی خصائص اختیار کرنے لگا ہے۔

(۲) سندھی افسانہ زیادہ تر معاشی برائیوں، بری رسموں اور جاگیرداری نظام کی خرابیوں وغیرہ تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ وہ انسانی رشتوں کی کہانی بھی سنانے لگا تھا۔

(۳) سندھی افسانے نے اپنے رشتے سندھی معاشرے اور ماحول سے مکمل طور

Scanned by CamScanner

پر استوار کر لیے تھے اور اب وہ پوری طرح سماجی حقیقت نگاری کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں محض تخیلاتی کہانی جس کا رشتہ زمینی حقائق سے نہ جڑا ہو، لکھنے کا رجحان مقبول نہ رہا تھا۔

(۴) موضوعاتی تنوع سے سندھی افسانے میں رنگ برنگ دھنک پیدا ہو چلی تھی اور گنے چنے چند موضوعات جو تقسیم سے پہلے کے افسانے میں نظر آتے تھے۔ اب بہت سے نئے موضوعات میں دب کر رہ گئے تھے۔ جیسے جیسے افسانہ نگار نے اپنے مشاہدے اور وژن (Vision) کو وسعت دی۔ اسی تناسب سے سندھی افسانے میں موضوعاتی پھیلاؤ بھی پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔

(۵) افسانہ نگار معاشرتی واردات اور انسان کے انفرادی تجربے کو مختلف انداز، زاویے اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھنے لگا تھا۔ چناں چہ اس کی پیشکش نسبتاً زیادہ تہہ دار اور معنی آفریں ہو گئی تھی۔

(۵) سندھی قومی تحریک اور سندھی قومیت کے شعور کو عام کرنے کے لیے ایسی کہانیاں لکھی گئیں جس سے قومی افتخار اور قدیم سندھی ورثے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہو۔

(۶) سندھی ادب کے بعض سینئر افسانہ نگار افسانے کی دنیا سے عملاً دور ہو گئے، مثلاً شیخ ایاز، شیخ عبدالرزاق راز، جمال ابڑو، ایاز قادری وغیرہ۔ چناں چہ دوسری صف میں شامل بہت سے افسانہ نگاروں نے اس خلا کو پورا کیا اور اپنے کمالِ فن سے صفِ اوّل کو توقیر بخشی۔

(۷) اس زمانے کی بعض تخلیقات پر چند تنگ نظر ناقدین نے انگریزی اور اردو کی کہانیوں سے چربہ سازی کا الزام بھی لگایا ہے جو نہ صرف درست نہیں، بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس عہد کے لکھنے والے اپنے خول میں بند نہیں تھے بلکہ وہ عالمی تناظر کا مطالعہ بھی کرتے ہیں اور عالمی ادب سے بھی شناسائی رکھتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی اور اردو افسانے کا مطالعہ بھی ان کی شخصیت کی تعمیر میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کر رہا ہوگا اور اس مطالعے نے ان میں وسعتِ فکر اور اسلوب کی رنگا رنگی پیدا کی ہوگی، لہٰذا ایک زبان و ادب کا دوسری زبانوں کے ادب سے متاثر ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ متاثر ہونے اور چربہ سازی میں زمین و آسمان کا فرق ہوا

کرتا ہے۔

(۸) مغربی زبانوں کے افسانوی ادب کے نمایاں رجحانات اور لکھنے والوں مثلاً ایڈگر ایلن پو، گوگول، چیخوف، موپساں وغیرہ اور اردو کے افسانہ نگار پریم چند، سدرشن، کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، خواجہ احمد عباس وغیرہ کے تراجم بھی کثرت سے ہوئے اور ان کے اثرات بھی کسی نہ کسی حد تک قبول کیے گئے۔

قیام پاکستان کے بعد سندھی افسانے کا دوسرا دور انیس سو ساٹھ کے آس پاس شروع ہوتا ہے اور سن انیس سو بہتر تہتر تک جاری رہتا ہے۔ ادب میں تبدیلیاں اچانک پیدا نہیں ہوتی ہیں اور نہ اچانک ختم ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں دراصل رجحانات، تصورات اور خیالات کی تبدیلیوں میں ظہور پاتی ہیں اور رجحانات و خیالات نہ تو کلینڈر کے حساب سے شروع ہوتے ہیں اور ڈائری دیکھ کر ختم ہوا کرتے ہیں۔ چناں چہ سندھی افسانے کی تبدیلی بھی دراصل بعض ظاہر و باطنی تبدیلیوں کی صورت ہی میں اجاگر ہوئی ہیں۔ نئے لکھنے والے اپنے ساتھ نئے نئے اسٹائل اور نئے نئے انداز فکر بھی لے کر آئے تھے۔

یہ دور معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے نہایت پرشور اور ہنگامہ خیز دور تھا۔ ون یونٹ کے قیام کے بعد سندھی قومی تحریک شروع ہو چکی ہے، جس کے پیش نظر ایک طرف ون یونٹ کے ظالمانہ وجود سے نجات حاصل کر کے صوبہ سندھ کی جغرافیائی اور انتظامی حیثیت بحال کرانا تھا اور دوسری طرف سندھی قومیت کے تشخص کو درست تاریخی تناظر میں دریافت کرنا تھا۔ قدیم تاریخی و ثقافتی ورثے کو محفوظ بنانا اور سندھ کے ذرائع پیداوار اور بے بہا وسائل کو استحصالی قوتوں سے محفوظ کرنا بھی تھا، لیکن ان سب سے بڑھ کر سندھی قومی تحریک نے سندھی عوام میں تاریخی شعور پیدا کرنے اور انھیں اپنے جائز جمہوری و معاشی حقوق اور انصاف کے حصول کے لیے تیار کرنے کو اپنا اوّلین منصب قرار دیا تھا۔ ان میں سے بہت سے امور تو وہ تھے جن کا تعلق سیاسی سرگرمیوں سے تھا لہٰذا جیسے سندھ تحریک، سندھی عوامی تحریک اور سندھ محاذ جیسی سیاسی جماعتیں اور گروپ ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل تھے، سندھی ادیب کا کام ان سے ذرا مختلف اور کہیں زیادہ مشکل تھا کہ اس نے ادب کے دائرہ کار میں رہ کر اس قومی تحریک میں حصہ بٹانا تھا اور سندھی عوام کی ذہنی، اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ان کی تربیت

کرتی تھی۔ چناں چہ اس دور کے لکھنے والوں کی ذمہ داریاں اپنے پیش روؤں سے کہیں زیادہ تھیں۔

یہ دور سندھ کا انقلابی دور تھا اور سندھی قوم ایک ہمہ جہت انقلاب سے دوچار تھی۔ اس انقلاب میں سندھی ادب نے سندھی عوام کی ذہنی و جذباتی تعمیر و تہذیب میں نہایت گراں قدر حصہ بٹایا ہے اور سندھی ادب کو نہ صرف ارضی معروضیت سے ہم کنار کیے رکھا ہے بلکہ اسے زندگی کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا ہے۔

یوں تو سندھی ادبی سنگت ۱۹۵۶ء میں قائم ہو چکی تھی اور اس کے بنیادی اراکین میں ابراہیم جویو، سوبھوگیان چند، نور الدین سرکی، رشید بھٹی، تنویر عباسی، ایاز قادری، مقبول صدیقی، مقبول بھٹی وغیرہ شامل تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس ادبی و فکری تحریک نے پورے سندھ میں اپنا مضبوط حلقۂ اثر قائم کر لیا تھا۔ سندھی ادبی سنگت نے سندھی عوام میں سندھ کی تہذیب، سندھی ثقافت، سندھی ادب اور سندھی بولی سے والہانہ لگاؤ پیدا کرنے کی جس طرح سے کامیاب مہم چلائی ہے، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ بے شک سن انیس سو ساٹھ (۱۹۶۰ء) کے بعد کی دہائی میں جو حالات پیدا ہو رہے تھے اور اس دور میں جذبات کی جو تیز آندھی چل رہی تھی اسے قابو میں رکھنا اور سندھی ادب کو مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کا کام اگلے تمام کارناموں سے زیادہ مشکل بھی تھا اور اہم بھی۔

اس دور میں جو رسالے نکلے اور جو ادبی و اشاعتی ادارے وجود میں آئے ان میں سرفہرست حمید سندھی کا ''روح رہان'' تھا۔ جس نے اس عہد میں پیدا ہونے والی ادبی لہر کو اپنے آپ میں جذب کیا ہے اور ترقی پسندانہ فکر و نظر کی توسیع و استحکام میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ''مہران'' اور ''نئین زندگی'' پہلے ہی سے نکل رہے تھے۔ ''بادل'' غالباً اسی عہد میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ رسول بخش پلیجو کے رسالے ''تحریک'' کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ رسالے دراصل اپنی سرشت میں عہد ساز اور رجحان ساز تھے۔ چناں چہ رسول بخش پلیجو کے رسالے میں کئی ایسے نظریاتی مضامین شائع ہوئے اور کتنے ہی کے فکری مباحث قائم ہوئے جنھوں نے اس دور کی سمت متعین کرنے میں نہایت موثر

فعال کردار ادا کیا ہے

اس دور کے اہم لکھنے والوں میں سراج الحق میمن ، امر جلیل، حمید سندھی، آغا سلیم، طارق اشرف، نسیم کھرل، ثمیرہ زریں، مہتاب محبوب، غلام نبی مغل، عبدالحق عالمانی، عبدالقادر جونیجو، نجم عباسی، علی بابا، منیر احمد مانک، مشتاق باگائی، شوکت حسین شورو، رسول بخش پلیجو، عبدالرحیم جونیجو، نور الہدیٰ شاہ، رشیدہ حجاب ، بیدل سرور، عبدالجبار جونیجو، زیب بھٹی، نور عباسی، قمر شاہباز، ناصر مورائی، جمال رند، خواجہ سلیم، غالب لطیف، الطاف شیخ، عنایت جونیجو، اللہ حاجو لغاری، طارق عالم، ایاز بلوچ، نظیر شیخ، قاضی خادم، ذوالفقار، راشدی، ہدایت پریم، غلام علی جاریانی، نسیم تھیبو، قمر واحد، ظہور احمد، اقبال جتوئی، اور ظفر حسن وغیرہ تھے، ان میں سینئر نسل کے بھی بہت سے فن کار تھے۔ جو اس دور میں بھی مسلسل داد سخن دے رہے تھے۔ چناں چہ ان کے نام گنوانے سے عمداً احتراز کیا جارہا ہے۔ مذکورہ بالا لوگوں میں بعض افسانہ نگار ایسے بھی تھے جنھوں نے گزشتہ دہائی میں لکھنا شروع کردیا تھا لیکن ان کی شاہ کار کہانیاں اسی عہد میں سامنے آئی ہیں، اس عہد میں بعض یادگار ناول بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان کا تذکرہ مناسب مقام پر کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا دور میں افسانوں کے جو عہد ساز مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان میں سراج الحق میمن کا مجموعہ ''اے درد ہلے آ'' (اے درد چلے آ) ثمیرہ زریں کا 'گیت اجائل مورن جا' (پیاسے موروں کے گیت)، حمید سندھی کا مجموعہ 'اداس وادیوں (اداس وادیاں)، اور 'سِلی سِیمی'، آغا سلیم کا طویل افسانہ یا ناولٹ 'روشنی جی تلاش' طارق اشرف کا مجموعہ 'سوحسن پتھر و پیار'، 'زندگی جو تھکا مسافر'، نسیم مہتاب کا مجموعہ 'تلاش' نسیم کھرل کا مجموعہ 'شبنم شبنم کنول کنول' اور 'چوٹیہوان در'، امر جلیل کا مجموعہ 'دل جی دنیا'، 'جڈھیں ماں نہ ہوندس' (جب میں نہ رہوں گا)، عبدالقادر جونیجو کا 'وائیوں اور راتیوں' اور مہتاب محبوب، 'پرہ کھاں پھریں'، (صبح سے پہلے) غلام علی مغل کی کتاب 'نوں شہر'، 'رات جانی' اور 'رات منجھی روح میں' (رات میری روح میں)، عبدالحق عالمانی 'کارو کارو کارونیاں'، نجم عباسی کے مجموعے ''طوفاں جی تمنا''، 'پتھر تی لکھیئ' (پتھر پہ لکیر)، 'گاڑھو لاٹین' (سرخ قندیل) وغیرہ عہد ساز مجموعے ہیں۔ جو نہ صرف اپنے زمانے کے نمایاں رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ جنھوں نے اپنے عہد کے رجحانات کے رُخ متعین بھی کیے ہیں۔ چناں چہ ان میں سے بعض کو ٹرینڈ سیٹر (Trend Setter) قیاس کیا جائے گا۔

Scanned by CamScanner

اس دور کی یادگار تخلیقات میں سراج الحق میمن کی کہانی 'اِی ورد علی آ' (اے درد چلے آ)، جم عباسی کی 'باہر وارو' اور 'نہ نجروں' ثمیرہ زریں کی کہانیوں میں 'گیت اچائل مورن جا' (موروں کے فضول گیت)، 'رُلندا بادل' (آوارہ بادل)، 'مجبور جو وَن' (مجبور کا درخت)، 'شمع بارندی شب' (شمع جلاتی شب) وغیرہ یادگار کہانیاں ہیں۔ نسیم کھرل نے بہت کم لکھا کہ ان کی جواں مرگی سے سندھی افسانے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے لیکن نسیم کھرل کے ادبی ترکے میں بیش تر منتخب کہانیاں ہیں۔ جو ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ نسیم کھرل کی کہانیاں بلاشبہ جدید سندھی افسانے کا نہایت قابلِ فخر سرمایہ ہیں، اور سندھی افسانے کے تبدیل ہوتے ہوئے تناظر کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔

امر جلیل زود نویس مگر خلاق لکھاری ہیں اور اب تک ان کی کئی درجن کتابیں سامنے آچکی ہیں لیکن اس دور میں (۱۹۶۰ـ۷۵ء) ان کی یادگار تصنیف ''جڈھن مان نہ ہوندس'' (جب میں نہ رہوں گا) کئی اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس پر رائٹرز گلڈ کا انعام بھی حاصل ہو چکا ہے، اس سے قبل 'دل جی دنیا' بھی انعام یافتہ کتاب ہے۔ ''تیوں وجود'' (تیسرا وجود)، 'تاریخ جو کفن'، 'منھنجو ڈس آسمان سا پوچھو' (میرے دکھ آسمان سے پوچھو)، 'سندھ منھنجی ساہ میں' (سندھ میری روح میں)، 'رانی کوٹ جو خزانو'، 'توں جی موں جی گالھیوں' (تیری میری باتیں)، 'ھن جار میں' (اس حیات میں)، 'آدم جی ماں' وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو بعد کے عشرے میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن ان میں شامل بعض کہانیاں مذکورہ دور میں بھی چھپ چکی تھیں۔ ان کتابوں کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ امر جلیل سندھی کے bestseller ادیب ہیں۔

آغا سلیم کی کتاب ''چند جا تمنائی'' ۱۹۶۱ـ۶۲ء میں شائع ہو چکی تھی، اس کے بعد وہ طویل افسانوں، ناولٹ اور ناول نگاری میں زیادہ مصروف رہے ہیں اور بالآخر ناول نگاری ہی ان کی شناخت بن چکی ہے، آغا سلیم نے سندھی فکشن میں بعض نئے موضوعات بھی متعارف کیے ہیں۔ جیسے ٹوٹتے ہوئے معاشرے میں فرد کی کہانی کا ... انسان کا وجودی مسئلہ وغیرہ لیکن انھوں نے ان مسائل کو زمینی حقائق سے منسلک کر کے ان کی ڈائمنشن (Dimension) تبدیل کردی ہے۔ حقیقت نگاری کو رومانیت سے ... کر کے انھوں نے ایک زیادہ پرکشش اسلوب پیش کیا ہے۔ آغا سلیم سندھی قومی ...

Scanned by CamScanner

سندھ کی تہذیبی قدروں ہی کے حوالے سے نمایاں کرتے ہیں اور اس باب میں ان کے ہاں وہ سطحی پن اور جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا جو بعض پرجوش لکھنے والے قوم پرستوں کے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔

غلام نبی مغل کی معرکتہ الآرا کہانی ''شیشہ جو گھر'' سانحہ کی دہائی کی منتخب کہانی تھی، جس نے غلام نبی مغل کو راتوں رات شہرت عام دلوا دی تھی۔ اس کہانی کے علاوہ 'نوں شہر'، 'راز جا نیٹن' (رات کا کنوار پن) اور 'رات موں جی روح' (رات میری روح) میں وقتے وقتے سے شائع ہو کر وسیع حلقے سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ غلام نبی مغل صاحب طرز ادیب ہیں جنھوں نے بعض ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جو ان سے قبل ایک رجحان کی حیثیت سے نہ آسکے تھے۔ غلام نبی مغل نے جنس جیسے نازک مسئلے پر نہایت احتیاط اور فن کارانہ انداز میں بہت خوب صورت کہانیاں لکھی ہیں۔

عبدالرحیم جونیجو کی کہانیوں میں 'مائی مٹان'، 'اوائی بہار' (آدھی بہار)، 'خان بہادر خیر صلاح'، 'اھڑا بی آھن' (ایسے بھی ہیں)، 'بوڑ لائے بھیرو'، 'گالھ بے خوذ اور بے دم جی' (بے خود اور بے دم کی باتیں) نہایت مؤثر اور پسندیدہ کہانیاں تھیں۔

ماہتاب محبوب کا پہلا مجموعہ 'چاندنی جوں تارون' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جسے رائٹرز گلڈ کی طرف سے سال کی بہترین کتاب کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ دوسرا مجموعہ 'پرہ کھاں پھرین' (پو پھٹنے سے پہلے) کافی دنوں بعد شائع ہوا ہے۔ مہتاب محبوب ۱۹۶۰ء سے سرگرم رہی ہیں اور یکے بعد دیگرے متعدد اچھی کہانیاں لکھتی رہی ہیں۔ وہ سینئر صاحب طرز اور مستحکم لکھنے والی ادیبہ شمار ہوتی ہیں، وہ ابتدا میں ماہتاب منور عباسی کے نام سے بھی لکھتی رہی ہیں۔ ان کی منتخب کہانیوں میں 'جیئن کھان جدیون' (حیات گریزاں)، 'موتئی موکی'، 'مٹھو بھت' (میٹھے چاول)، 'بھوک جا چک' اور 'پون پھرندی' وغیرہ شامل ہیں۔

حمید سندھی اپنی نوع کے منفرد فن کار ہیں، ان کی کہانیوں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع ملتا ہے۔ ان کی پسندیدہ کہانیوں میں 'راند رکھ' (کھیل تماشا)، 'کارو رت' (کالا خون)، 'یادن جی جزیرہ میں' (یادوں کے جزیرے میں)، 'ھک خواب ھک حقیقت' اور 'واچوڑن میں لاٹ' (شعلہ گرداب) وغیرہ شامل ہیں۔ حمید سندھی بھی جدید افسانے کے

Scanned by CamScanner

صفِ اوّل کے تخلیق کار ہیں۔ ان کا ادبی سفر کم و بیش پچاس سال پہ محیط ہے۔ وہ دیہی و شہری معاشروں کی مختلف صورتِ حال کے افسانہ نگار ہیں۔ چناں چہ ان کے افسانوں میں نئے شہری معاشرے کے مسائل بھی ہیں اور اس دیہات کے قصے بھی جو شہری زندگی کے تیز رفتار دھارے کی زد میں آتا جا رہا ہے۔

رسول بخش پلیجو کی اصل شناخت ایک مفکر، انقلابی، دانش ور اور تنقید نگار کی ہے، وہ سیاست کے مردِ میداں بھی ہیں اور سندھی عوام کے انسانی و جمہوری حقوق کے حصول کی راہ میں ہمہ وقت مصروف جہاد بھی رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں لیکن ان کی ذات میں تخلیقی شعلہ بھی بھڑکتا رہا ہے، چناں چہ انھوں نے بعض نہایت پر تاثر کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں 'نپی گاڑھا گل' (کیکٹس کا لال پھول)، 'جتی باھ بھری ودیو جھنجین تہ ڈیھ' (جہاں آگ لگے وہیں داغ پڑے) اور 'اج آگو یا آیا' (آج لوہار آئے)، 'کارونجھر کوڑ' (کارونجھر کی لہر)، 'روکیل لوک' (روکتے آنسو) 'عبدالحق عالمانی کی لھندڑ سج جا پاچا' (ڈوبتے سورج کا سایہ)، 'کارو کارو نبھاڑ' (سیاہ ہی سیاہ) وغیرہ اہم کہانیاں ہیں۔ سندھی افسانہ اس ہونہار فن کار کی جواں مرگی پہ ماتم گسار رہا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں رشیدہ حجاب کی اہمیت بھی مسلمہ رہی ہے۔ وہ مہتاب محبوب اور ثمیرہ زرین کی ہم عصر ادیبہ ہیں اور انھیں کی طرح شہری معاشرے کے درمیانے طبقے کے گھر آنگن کی کہانی لکھتی ہیں۔ انھوں نے کم کم لکھا ہے لیکن وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھنے کی قائل ہیں، ان کی کہانیوں میں فکری سطح بلند رہتی ہے۔ ان کی لکھی ہوئی 'رہزن'، 'چاند، چور، تارا اور ٹھگ' عمدہ کہانیاں ہیں۔

اسی عہد میں قمر شاہباز کی کہانیاں بھی ایسی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قمر شاہباز ایک ایسے حقیقت نگار ادیب ہیں جو اردگرد گزرتے ہوئے روزمرہ واقعات میں چھپی ہوئی کہانیاں اور افسانے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ معاشرتی ڈھانچے میں مضحکہ خیز صورتِ حال comic situation اور ڈسٹارشن (Destortion) کو سلیقے سے اجاگر کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے اسلوب نگارش میں زہر خند کی چبھن محسوس کی جاتی ہے۔

ناصر مورائی کی کہانی 'موہن جو دڑو جو خزانو (موہن جو دڑو کا خزانہ) اور 'کارو چنڈ' (کالا چاند) بھی اپنے عہد کی یادگار کہانیاں ہیں۔ ناصر مورائی اپنے عہد کو تاریخ کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے اور دکھانے کے خواہش مند ہیں۔

اس عہد کا تذکرہ منیر احمد مانک سندھی کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ مانک اپنے ابتدائی دور میں حقیقت نگار اور ترقی پسندانہ رجحانات کے حامل ادیب تھے اور منطقی بیانیہ اسلوب میں ترقی پسندانہ افسانے کے رجحانات کو آگے بڑھاتے رہے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان پر جدیدیت کی تحریک کے اثرات نمایاں ہوتے چلے گئے اور انھوں نے علامتی و اشاراتی اندازِ نگارش اختیار کرنا شروع کیا۔ جہاں تک زندگی کے مسائل اور انسانی مصائب کا تعلق ہے، وہ اپنے آپ کو زمینی حقائق اور ارضی معروضیت سے مربوط رکھتے چلے آئے ہیں بلکہ انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ گہرائی کے ساتھ سندھی ماحول، مقامیت اور مسائل پر خوب صورت افسانے لکھے ہیں۔ علامتی اندازِ نگارش نے ان کے فن میں تہہ داری پیدا کی ہے۔ وہ سندھ میں جدیدیت کی تحریک کے سب سے کامیاب، مقبول اور ہنرمند فن کار تھے۔ انھوں نے براہِ راست معاشرتی مسائل کی بجائے زیادہ معاشرے میں شکست و ریخت سے ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے فرد کے مسائل پر توجہ دی تھی۔ سندھ کی قومی تحریک میں بھی انھوں نے نہایت اہم اور مؤثر کردار ادا کیا ہے اور قومی مسائل پر بھی خوب صورت کہانیاں لکھی ہیں۔ منیر احمد مانک نے بہت کم مدت میں سندھی افسانے کو ثروت مند بنانے میں غیر معمولی حصہ بٹایا ہے اور سندھی افسانے کو نئے نئے موضوعات اور اندازِ نگارش عطا کیے ہیں، لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ یہ ذہین، ہنرمند تخلیق کار عین عالمِ شباب میں خودکشی کر کے سندھی افسانے کو ویران کر گیا۔

عبدالقادر جونیجو کی کہانیاں 'کرڑیل تارا' (جگمگاتے تارے)، 'واٹون' (راستے) 'راتیوں اور رول' (رات اور سرگشت)، 'کانجھر کور' (کارنجھر کی لہر)، روئیل لڑک (روئے ہوئے آنسو)، 'زال ذات' (عورت ذات)، 'ہورڈ' وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو اپنی جداگانہ بو باس اور مختلف خدوخال رکھتی ہیں۔ عبدالقادر جونیجو ایک علاحدہ مزاج اور انداز کے فن کار ہیں۔ وہ معمولی معمولی باتوں سے غیر معمولی کہانیاں تراش لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں ارضی معروضیت اور زمینی وابستگی بہت گہری محسوس ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

طارق اشرف بھی جدید افسانے میں اپنی جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے "سوہنی" رسالے اور "ادب نو" جیسے اداروں کے ذریعے جدید سندھی ادب خصوصاً سندھی افسانے کی ترقی، توسیع اور ترویج کے لیے بہت کام کیا ہے لیکن ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے بھی وہ منفرد مقام رکھتے ہیں۔

طارق اشرف کی کہانیوں میں 'زندگی جو تنہا مسافر' (زندگی کا تنہا مسافر)، 'سوٹسن، پتھر اور پیار' (سونا، پتھر اور پیار)، 'سنہری شام'، 'موٹی آئی یاد' (یاد پلٹ آئی)، 'ہوا کے کیر روکے' (ہوا کو کون روکے)، 'پیار جی سرحد' (پیار کی سرحد)، 'جھری پی چنڈڑی' (تار تار چادر) وغیرہ ان کی ایسی کہانیاں ہیں جو سندھی افسانے کے نمائندہ انتخابات میں شریک ہوتی رہی ہیں۔ طارق اشرف سبک انداز میں لکھنے والے فن کار ہیں، ان کا اسلوب آہستہ رو اور دھیمے سُروں سے ابھرتا ہے۔ وہ گہرے مشاہدے اور عصری معروضیت سے مکمل وابستگی کے باوجود بلند آہنگ نہیں ہوتے، وہ کرداروں کو نفسیاتی اور محسوساتی سطح پر پیش کرتے ہیں اور واقعات کے اکہرے بیان کی بجائے ان کے پس منظر کو ابھارتے ہیں۔

اس عہد کے افسانوں کے اہم خصائص درج ذیل ہیں:

ا۔ اس عہد میں تخلیقی سطح پر تجربے کی رفتار خاصی تیز اور متنوع رہی ہے۔ یہ دور انتہائی پُرآشوب اور ہل چل سے لب ریز تھا اور پورا معاشرہ ایک انقلاب سے گزر رہا تھا۔ جس کی متحرک پرچھائیاں سندھی افسانے نے مؤثر انداز میں دکھائی ہیں۔

۲۔ زندگی کے تجربوں کی وسعت اور گہرائی نے تخلیق کاروں کے طرزِ احساس اور اظہار کو بھی پہلو دار بنا دیا ہے۔

۳۔ اس دور کا بنیادی اور غالب رجحان بھی سوشل ریلزم یعنی سماجی حقیقت نگاری ہی رہا ہے لیکن اب حقیقت نگاری میں بھی کئی کئی جہتیں اور تہہ داریاں پیدا ہوگئی تھیں اور سپاٹ حقیقت نگاری کی گنجائش کم رہ گئی تھی بلکہ زندگی کے تمام خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی دنیائیں بھی حقیقت نگاری کے دائرہ کار میں آ رہی تھیں۔ چناں چہ معاشرتی و معاشی حقیت نگاری کے ساتھ نفسیاتی الجھنیں اور جنسی معاملات بھی افسانوں کے موضوع بنے ہیں۔

Scanned by CamScanner

۴۔ مواد اور موضوع کے تنوع نے اسلوب اور طرز نگارش میں بھی رنگا رنگی پیدا کی ہے اور ایک ہی افسانہ نگار نے مواد اور موضوع کی مطابقت کے لحاظ سے کئی کئی طریقوں سے کہانیاں لکھی اور طرز نگارش میں ندرتیں پیدا کی ہیں۔

۵۔ جدیدیت کی عالمی تحریک نے سندھی زبان و ادب پر بھی اثر ڈالا ہے اور بعض لوگوں نے جدیدیت کے حامل موضوعات کو بھی اپنایا ہے۔ متعدد نوجوان ادیبوں نے محض فیشن کے طور پر "اینٹی کہانی" لکھنے کے تجربے کیے ہیں لیکن سینئر تنقید نگاروں مثلاً ابراہیم جویو، سوبھوگیان چندانی، رسول بخش پلیجو وغیرہ کی بروقت فہمائش نے اس بدعت کو پھیلنے سے روک دیا ہے جب کہ بعض پڑھے لکھے اور باشعور فن کاروں نے جدیدیت کو اپنے تجربے کا حصہ بنایا تو انھوں نے نئے اسلوب میں اچھی تخلیقات بھی پیش کی ہیں۔ ایسے لوگوں میں آغا سلیم اور منیر احمد مانک کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

۶۔ اس پورے دور میں تیز رفتار تخلیقی ہل چل اور سرگرمی جاری رہی ہے اور ہر دو تین سال کے بعد نئے لکھنے والوں کی تازہ کمک میدان میں اترتی رہی ہے جن میں سے بہت سوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا لوہا بھی منوایا ہے۔

۷۔ مقصدیت، قومی مقصدیت، قومی تحریک۔ اس عہد کے افسانوی ادب کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس دور میں اچھی کہانیوں کے ساتھ خراب اور پروپیگنڈا کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جن میں فنی اظہار کی بجائے نعرے بازی مقصود دکھائی دیتی ہے۔

افسانے میں جدیدیت کی تحریک

یوں تو قیامِ پاکستان کے بعد شروع ہی سے سندھی معاشرہ ایک قسم کی بے چینی، خلفشار اور ناآسودگی سے دوچار رہا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد ہی پے در پے بعض سیاسی اقدامات کی بنا پر سندھ کے رہنے والے محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے دستوری اور قانونی حقوق تک غیر محفوظ ہوتے جا رہے ہیں اور پاکستان کی مقتدر قوتیں شاید انھیں ان کے جائز سیاسی معاشی و معاشرتی حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہیں۔ سندھ سے کراچی کی علیحدگی جو آزادی کے دوسرے ہی سال وقوع پذیر ہوگئی تھی۔ اس بے اطمینانی کا جواز فراہم کرتی ہے۔ چناں چہ آزادی کے فوراً بعد ہی سے انھیں سندھ کے

Scanned by CamScanner

حقوق کے تحفظ کے بارے میں نہ صرف فکرمند ہونا پڑا بلکہ اس اقدام کے خلاف سیاسی جدوجہد کا آغاز بھی کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد دارالحکومت کی کراچی سے اسلام آباد منتقلی نے اس ناآسودگی کو مزید ہوا دی۔ ملک میں جمہوری روایت کے برعکس نوکر شاہی کی سازشیں اور جاگیردارانہ نظام کی دن بہ دن مضبوط ہوتی ہوئی گرفت نے پاکستان کی اقلیتی قومیتوں کو مسلسل فکرمند بنائے رکھا ہے اور بالآخر ملکی سطح پر جمہوریت کی ہلاکت اور فوجی حکومت کے قیام نے عوام دوست اور جمہوریت آشنا قوتوں کو مایوسی کی دلدل میں پھینک دیا تھا اور وہ مقتدرہ قوتوں کے خلاف عملی جدوجہد کرنے پر مجبور کردیے گئے تھے۔ رہی سہی کمی ون یونٹ کے قیام نے پوری کردی تھی جس کے نتیجے میں سندھ سمیت تمام صوبوں کی جداگانہ حیثیت ختم کر کے انھیں نام نہاد وحدت مغربی پاکستان میں ضم کردیا گیا تھا اور اس طرح سندھ، بلوچستان اور سرحد عملاً پنجاب کی اکثریت کے زیرنگیں آچکے تھے۔ اس صورتِ حال کو اقلیتی قومیتوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور ہر جگہ ون یونٹ کے خلاف زبردست جدوجہد جاری ہوگئی۔ سندھ کے عوام نے نہایت منظم اور منضبط طریقے سے ہمہ گیر مزاحمتی تحریک چلائی تھی۔ یہ مزاحمتی تحریک صرف ون یونٹ کے خاتمے کے خلاف نہ تھی بلکہ اسے سندھی قومیت کے تشخص کی تحریک کہنا زیادہ درست ہوگا۔ اس تحریک نے سندھ کے عوام کو تاریخ کے تناظر میں اپنے قومی تشخص کو تلاش کرنے کا شعور دیا اور زمینی حقائق کی روشنی میں تہذیبی خصائص کو جاننے کی خواہش بے دار کی اور ان میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارا۔ سندھیت کے جذباتی رویے کو ٹھوس حقیقی بنیادیں فراہم کیں۔ بے شک جیے سندھ تحریک کا سیاسی رخ کسی حد تک جذباتیت کا شکار بھی رہا ہے اور اس کے بعض گروہوں کی طرف سے محدود قوم پرستی، تنگ نظری اور ماضی پرستی جیسے غیر ترقی پسندانہ نعرے بھی بلند ہوئے ہیں لیکن اس تحریک کا ادبی اور ثقافتی رخ روشن خیالی کے نور سے دمکتا رہا ہے۔ دس پندرہ سالہ جدوجہد کے اس دور کو سندھ ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان کی تاریخ سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ مسلسل جاری تاریخی دھارے ہی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ یہ عہد اپنے بعض مثبت تصورات کی وجہ سے جاندار خصائص بھی رکھتا ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے سندھی ادب نے عالمی تناظر میں مقامی ماحول کو دیکھنا اور سمجھنا شروع کردیا تھا۔ سماجی حقیقت نگاری اپنے تمام تر توانا

جلوہ سامانیوں کے ساتھ اس دور کے ادب پر اپنی مہر ثبت کر چکی تھی اور سندھی شاعر و ادیب موضوعی خیال پسندیت کے غبار سے نکل کر ارضی معروضیت سے اپنے رشتے استوار کر چکے تھے اور زندگی آمیز اور زندگی آموز مسائل اور موضوعات سے ادب کی سرخیاں فراہم کر رہے تھے۔ یہ دور وہ تھا جس میں حب الوطنیت اور مثبت قوم پرستانہ جذبات کی تیز و تند لہر رواں تھی جس میں کوئی دوسری آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی، ہر جذبہ ہر شعور، ہر خیال، ہر آواز، ہر سخن اور ہر بات سندھیت ہی کے محور کے گرد گھومتی تھی اور کسی ایسے خیال، تصور اور آواز کی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی تھی، جس کا تعلق زمینی حقائق، مسائل اور موضوع سے نہ رہا ہو۔ اس اجتماعی طرزِ احساس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہر شخص ایک ہی لب و لہجہ اور ایک ہی انداز میں بات کر رہا تھا۔ نہیں یہ خیال درست نہیں ہے۔ بلکہ سندھی قومی تحریک کے زیرِ اثر پیدا ہونے والا ادب جہاں روشن خیالی، ترقی پسندیت اور جمہوریت نواز تھا وہیں اس میں ان گنت تجربات اور اسلوب و اظہار کے بے شمار جدا جدا نمونے بھی تخلیق ہو رہے تھے۔ جن کی وجہ سے سندھی ادب نہایت رنگا رنگ، متنوع، جاذبِ توجہ اور موثر ہو گیا تھا اور ایسا صرف اس لیے ہوا تھا کہ اس دور کا ادب بالعموم نعرہ بازیوں کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ہمہ جہت تجربوں کے سوتوں سے پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اس تحریک کے دوران بہت سا جذباتی ملغوبہ اور غیر تخلیقی رطب و یابس بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن وقت کی کسوٹی نے ایسے عام، غیر تخلیقی عناصر کو فراموش گاری کے کوڑے دان میں پھینک دیا ہے اور اس دور کا صرف وہی ادب باقی رہا ہے جس کی تخلیقی بنیاد سچے جذبے اور مضبوط جمالیاتی قدر پر استوار تھی۔

ون یونٹ کا خاتمہ صوبہ سندھ کی بحالی اور جمہوریت کے احیا نے عملاً سندھی قومیت کی تحریک کو ختم کر کے رکھ دیا اور کم و بیش دو عشروں پر محیط جدوجہد دیکھتے دیکھتے اس طرح بکھر کر رہ گئی جیسے اب اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہ رہ گیا ہو اور وہ فکری ہم آہنگی جو اس مزاحمتی تحریک کی بنیاد تھی، منتشر مزاجی اور بے سمتی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ سندھی ادیب، شاعر اور دانش ور اپنی عملی جدوجہد کو نسبتاً کامیاب بنا چکے تھے اور احساسِ کامرانی نے انھیں اضمحلال اور تھکن کا غلاف اوڑھا دیا تھا اور ان میں تخلیقی عمل کا جوش سرد ہو چلا تھا لیکن کامرانی کا یہ خواب بہت جلد ٹوٹ گیا اور سندھ کے تخلیق کاروں کو جدوجہد کے

Scanned by CamScanner

ایک دوسرے مرحلے میں قدم رکھنا پڑا۔ یہ جدوجہد سندھی تشخص کے حصول کی جدوجہد نہیں تھی بلکہ معاشی و معاشرتی ناہمواریوں سے نجات پانے کی جدوجہد تھی۔ اس پس منظر میں جو ادب اُنیس سو ستر (۱۹۷۰ء) کے بعد تخلیق ہوا ہے اس میں مختلف فکری دھارے اور نت نئے اسلوبیاتی چشمے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے باہمی اختلاط سے ایک فکری و اسلوبیاتی دھنک ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اس بات کو ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ نئے خیالات و تصورات نے سندھی ادب کے مخصوص کردار یعنی انسان دوستی، روشن خیالی، ترقی پسندیت اور جمہوری اقدار کی پاس داری کو مزید جلا بخشی ہے۔ اور وہ نئے نئے خیالات کے پس منظر میں زیادہ روشن اور جاذبِ توجہ ہوتا چلا گیا ہے اور اس کی معنوی تہہ داری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

سن ستر (۱۹۷۰ء) کی دہائی کے آس پاس سندھی ادب جن نئے تصورات و خیالات سے دوچار ہوا ہے۔ ان میں سرفہرست جدیدیت (Modernism) کی تحریک سے متاثر خیالات تھے۔ جدیدیت (Modernism) کی تحریک دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد یورپ کے مخصوص معروضی حالات اور احساسات کے تحت پیدا ہوئی تھی اور اس میں معاشرہ کے مقابلے میں "فرد" کے مسائل اور احساسات کو تخلیقی سرگرمیوں کا محور سمجھا گیا تھا۔ ویسے تو اس تحریک کی ابتدا پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی سے شروع ہو چکی تھی اور فلسفیانہ بنیادوں پر ایسے ادبی رویّوں کی پذیرائی ہونے لگی تھی، جن میں انسانی معاشرہ کی یک جہتی کے مقابلے میں "فرد" کی وجودیت پر اصرار کیا جا رہا تھا۔ خاص طور پر ژاں پال سارتر، سیمون ڈی بوار، البرٹ کامیو، فرانز کافکا، دوستوفسکی، ورجینیا وولف، رلکے، البرٹ موراویا وغیرہ جیسے صفِ اوّل کے لکھنے والے کسی نہ کسی انداز میں جدیدیت کی تحریک کے حامی رہے ہیں لیکن بغور دیکھیے تو یورپ کی ماڈرن ازم کا ایک معروضی جواز بھی موجود تھا نیز مغربی دانشور فلسفیانہ سطح پر زندگی کی معنویت اور انسانی معاشرہ کی اجتماعی بہبود اور فلاح سے قطعی بے بہرہ نہیں ہو گئے تھے۔ چناں چہ ژاں پال سارتر کا بار بار اپنے مارکسسٹ ہونے پر اصرار کرنا اور عالمی امن کی تحریکوں میں تواتر سے شرکت ان کے رویوں کو مثبت رُخ دیتا ہے۔ یورپ کی ماڈرن ازم کا زیادہ تر تعلق ادب میں اسلوبیاتی اظہار اور ادب کی خود مختیاری سے تھا اور وہ ادب کو ہر قسم کی جبریت سے آزادی دلانے

Scanned by CamScanner

پر اصرار کرتی تھی۔ یعنی وہ ادب کی مکمل خودمختیاری کے پرچارک تھے۔

سندھ کے معروضی حالات یقیناً ماڈرن ازم کے تصورات کے فروغ کا جواز فراہم نہیں کرتے تھے لیکن ایک طویل جدوجہد کے بعد مزاحمتی تحریک کے بکھر جانے اور ادب میں مقصدیت کے شدید اثرات اور سندھی نوجوانوں کے خوابوں کی شکستگی کے ردعمل نے جدیدیت کی تحریک کے لیے بظاہر جواز پیدا کردیا تھا۔ یوں بھی جدیدیت کے وکلا جدیدیت کی توجیہہ کرتے ہوئے اسے بالعموم رواں روایت، رسمیات اور رواج کے جابرانہ اثرات کے خلاف ردعمل کا اظہار ہی بتاتے ہیں تاکہ کائنات کے مظاہر میں فرد کی عملی حیثیت کو ممکنہ طور پر اجاگر کیا جاسکے۔ اس نکتۂ نظر سے جدیدیت کو بعض حلقوں نے ادب میں مقصدیت کے مقابلے میں نتائج خیزی (Pragmatism) بھی قرار دیا ہے۔

یہاں ہم جدیدیت کی فلسفیانہ بحث اور اس کی موشگافیوں میں الجھنے کی قطعی خواہش نہیں رکھتے بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیں گے کہ سندھی ادب میں جس جدیدیت کا اظہار ہوا ہے اس کے خدوخال کیا رہے ہیں۔ اور اس نے سندھی ادب کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ ہر معاشرتی انسان اپنی ذات میں ایک کائنات لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یعنی: ہر آدمی بجائے خود ہے محشر خیال، یہ داخلی کائنات انسان کے خوابوں، جذبوں، اندیشوں، خواہشوں اور واہموں سے وجود پاتی ہے، اور اس کے خیالات، تصورات، احساسات، منکرات سے عبارت ہوتی ہے۔ زندگی کا احساس، موت کے خوف سے آزاد نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح خوشی، مسرت اور آسودگی کی خواہشیں خوف دہشت، اور ناآسودگی کی سرحد سے لگی ہوتی ہیں۔ انسان کی داخلی دنیائیں دراصل خارجی دنیاؤں کے عکس ہیں۔ باہر کی محرومی اندرونی ناآسودگی کو جنم دیتی ہے اور معاشرہ کی جبریت فرد میں تنہائی، بوریت اور کراہت کے احساسات پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ادب کا مطالبہ اور خواہش کہ وہ انسان کی بیرونی دنیاؤں کے ساتھ ساتھ اس کے اندرونی خلفشار اور دروں خانۂ احساس کی عکاسی بھی کرے بھلا کیوں کرنا واجب ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا جدیدیت کے مثبت تصورات سندھی ادب میں پہلے بھی موجود رہے ہیں اور کوئی عہد انسان کی انفرادیت سے منکر نہیں ہوا کرتا۔

Scanned by CamScanner

جدیدیت کی عالمی تحریک کے تحت نئے خیالات کو جس فن کار نے سندھی ادب میں زیادہ تن دہی اور اصرار کے ساتھ پیش کیا ہے وہ منیر احمد مانک ہے۔ منیر احمد مانک نے جدیدیت کے اہم تصور 'وجودیت' کو سندھ میں جاری مزاحمتی تحریک سے وابستہ کر کے پیش کیا ہے، گویا اس نے سندھیت کی خودشناسی کی تحریک کو سندھی خود وجودیت کی تحریک کا درجہ دے دیا ہے۔ مانک خود اس دور کی پیدائش ہے جس میں سندھی ادب ایک زبردست ہل چل اور رست و خیز سے دوچار تھا۔

مانک سندھی کی کہانیوں کے مجموعہ ''حویلی کا راز'' میں شامل کہانیاں تخیلاتی کرتب بازی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کہانیوں کی بنیادیں زمینی حقائق میں پیوست ہیں۔ وہ سندھ کے جاگیردارانہ سماج کی فرسودہ رسم و رواج اور جبریت کے خلاف مؤثر اور کاری ضرب لگاتا ہے جس کا ارتعاش مستقل طور پر ادب میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔

مانک کی بالعموم دوسری کہانیوں میں بھی وجودی مسئلہ کسی نہ کسی رخ سے ظاہر ہوتا ہے اور زندگی کی اثباتی قدروں کو ان طاقتوں کے مقابل لاتا ہے جو زندگی کی فعالیت اور فطری اظہار کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ چناں چہ وہ حقیقت نگاری کے دائرے سے باہر نہیں جاتا کہ حقیقت کے ایک رُخ کے انکار سے وہ حقیقت کے دوسرے رخ کو نمایاں کر جاتا ہے اور اس طرح سیاہ کو سفید سے جدا کر دکھاتا ہے۔ چناں چہ اپنی کہانی ''باہر بھاپ نہ نکری'' میں وہ ایک ایسی جوان بیوہ کی روداد لکھتا ہے جو اپنے اُبلتے ہوئے فطری جذبات اور تقاضوں کو دبانے کے لیے ان پر نماز روزے کے ڈھکن رکھا کرتی ہے تاکہ اس کے جذبات کی بھاپ باہر نکل نہ پائے۔ لیکن اس کے باطن میں جو قیامت خیز خلفشار اور ہیجان برپا ہوتا ہے، اس کا اظہار مانک نے اتنے حقیقت پسندیت، اشارتی اور مؤثر انداز میں کیا ہے کہ مذکورہ کہانی نہ صرف اس عہد کی بلکہ سندھی ادب کی چند منتخب کہانیوں میں شمار کی جائے گی۔

مانک کے علاوہ اس عہد کے نمائندہ اور رجحان ساز افسانہ نگاروں میں ممتاز مرزا، مشتاق احمد شورو، نور گھلو، ممتاز مہر، قاضی خادم، خیر النسا جعفری، رسول میمن، نور الہدیٰ شاہ، بادل جمالی، افسر اعجاز، رزاق مہر، مدد علی سندھی، کیہر شوکت، شرجیل، افسر جانوری، بدر ڈامرو، شوکت حسین شورو، بیدل مسرور، عابد مظہر اور پیر محمد کیلاش، ڈاکٹر

در محمد پٹھان، وہاب سھتو، الہ داد بوہیو، عابد لغاری، ملک اگانی، ممتاز عباسی، رکن شاہ رضوی، بادام ناتواں وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں کا تعلق پیش رو نسل سے بھی رہا ہے اور وہ ستر کی دہائی سے پہلے ہی اپنی شناخت قائم کر چکے تھے لیکن جدید رجحان کے ساتھ بھی دو چار قدم ہم رکاب رہے ہیں اور انھوں نے نئے اظہاری وسیلوں اور تکنیکی ندرتوں سے سندھی افسانے کو ثروت مند بنایا ہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ جدیدیت کے اکثر موضوعات سندھی ادب کے لیے نئے نہیں ہیں اور جہاں جہاں انسانی جبلت، دروں خانہ احساس اور اندرونی دنیا سے شاعروں اور افسانہ نگاروں کا واسطہ پڑا ہے، انھوں نے ان موضوعات کو بھی تصویر کر دکھایا ہے۔ انسانی خیالات و احساسات کی ہزار صورتیں اور ہزار جلوے ہوا کرتے ہیں اور ان میں تبدیلیاں بھی اتنی ہی سرعت سے برپا ہوتی ہیں کہ ان کے بدلتے ہوئے موڈ کے درمیان حد فاصل کھینچنا اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ فرد تنہائی میں کیوں کر انجمن آرائی کرتا ہے، موت کا خیال کیسے کیسے تخیلات کو جنم دیتا ہے۔ خوشی، امید اور مسرت کے نام پر آدمی کیا کھل کھیلتا ہے۔ مایوسی (depression)، بیگانگیت (alienation)، بوریت (Boredom)، کراہت (Nausea)، خود فریبی اور احساس جرم وغیرہ ادب کے بنیادی موضوعات رہے ہیں اور ڈاکٹر غفور میمن نے اپنی کتاب "سندھی ادب جو فکری پس منظر" میں قدیم و جدید سندھی ادب سے مثالیں دے دے کر دکھایا ہے کہ ان موضوعات کو شاہ عبداللطیف بھٹائی سے لے کر جدید عہد کے لکھنے والوں نے کس کس طرح برتا ہے لیکن ان موضوعات کا کبھی کبھار بہ طور موضوع برتاؤ اور ان کا ایک مستقل رجحان اور طرز فکر کے طور پر اظہار میں فرق ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ اس اعتبار سے جدیدیت کے مذکورہ بالا مضامین ایک رجحان اور فکری رویے کے طور پر اسی عہد میں ظاہر ہوئے ہیں۔

مانک کے افسانوں میں وجودی مسئلہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، اس نے اپنی کہانیوں کا مواد آس پاس کی زندگی ہی سے حاصل کیا ہے اور یہی بات مانک کو بے ربط (Irrelevant)، نان کمیٹل (Non Commitel) اور غیر حقیقت پسندانہ (unrealisticc) ہونے سے بچالیتی ہے۔

ممتاز مہر کے دو مجموعے "حک زندگی جو وھکرو" (زندگی کی روانی) اور "منزل

شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں شامل اکثر افسانوں میں سادہ بیانیہ کے استعمال سے بھی خاصی پر تاثر کہانیاں وجود میں آئی ہیں۔ بعض کہانیاں علامتی طرزِ اظہار لیے ہوئے ہیں اور کہیں انجام کو پیچیدہ بنا دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والا لمحہ بھر رک کر کہانی کے کرداروں کو محسوس کرے اور واقعے کے تانے بانے سے اپنے نتائج خود اخذ کرے۔ ان کہانیوں کا ماحول اور طرزِ اظہار عام سیدھی سادھی بیانیہ کہانیوں سے مختلف ہے اور ان سے بجاطور پر حظ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان میں بیان کردہ علامتوں اور اشاروں کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔ ممتاز مہر بھی اپنی کہانیوں کا مواد آس پاس کے ماحول ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں سے بعض میں مایوسی، فراریت اور بے کسی سے دوچار ہوتے ہوئے انسانوں کی واردات بیان ہوتی ہے مثلاً 'یادن کھاں انتقام' (یادوں سے انتقام) میں ٹیکسی ڈرائیور ایک ایسی لڑکی کو جو اس کے اختیار اور قبضے میں رہی تھی، معاشرے میں اس لڑکی کی بدنامی کے خیال سے اس کے عزیزوں میں واپس چھوڑ آتا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کی یہ نیکی اور زندگی بھر اسے ڈستی رہتی ہے اور وہ زندگی کے عام چلن میں بار بار فراریت اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح ''اندھا کنواں'' میں دکھایا گیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی زندگی کی مسلسل شکستوں کے نتیجے میں بے کسی و بے بسی کے احساس سے کس طرح دوچار ہوتا ہے۔

مشتاق احمد شورو کی کہانی ''من جي مونجھ ، بوسات'' (دل کی گھٹن) میں ایک نچلے طبقے کے نوعمر لڑکے کی کہانی بیان کی گئی ہے، جو معمولی معمولی کام کر کے گزر بسر کرتا ہے، جس کی زندگی میں کوئی امید کوئی آس، کوئی خواہش اور کوئی لگن باقی نہیں رہی ہے۔ ماحول اور زمانہ اس سے جس طرح چاہتا سلوک کرتا ہے یا وہ اپنے اوپر گزرتی ہوئی افتاد کو بہ ظاہر جھیلتا رہتا ہے لیکن ہر واردات کے نتیجے میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کی زندگی میں کراہت کا احساس پیدا کردیتے ہیں اور کراہت کا یہ احساس اس حد تک بڑھتا ہے کہ اس کے لیے خود اس کا اپنا کردار اپنا جسم اپنا آپ کراہت زدہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ سے بھی کراہت محسوس کرنے لگتا ہے۔

خیر النسا جعفری کی کہانی ''حویلی کھاں ہاسٹل تئیں'' (حویلی سے ہاسٹل تک) نہایت دلچسپ اور حقیقت آشنا کہانی ہے کہ اس میں جاگیردارانہ معاشرے میں رہتی ہوئی

Scanned by CamScanner

عورت کی زندگی کے مختلف روپ سروپ دکھائے گئے ہیں، قدم قدم پر پابندیوں کے پھندے اور ان سے نبرد آزما ہوتی ہوئی انسانی فطرت، نتیجے میں بغاوت کے جذبات کا ابھرنا یہ بغاوت کبھی چالاکی سے کام لے کر کونے کھدرے تلاش کرتی ہے اور کبھی آمنے سامنے دو بدو مقابلے میں سماجی ریتوں اور رواجوں کو شکست دے دیتی ہے۔ خیر النسا جعفری انتہائی نازک موضوع پر بھی بہت ذمہ داری سے قلم اٹھاتی ہیں اور انسانی نفسیات کے ساتھ معاشرہ کی اجتماعی نفسیات کی باریکیوں کو بھی ملحوظ رکھا کرتی ہیں۔ عورتوں کے سماجی اور انسانی مسائل ان کے خاص موضوعات ہیں اور ان موضوعات پر وہ وقتی جذباتیت سے بلندتر ہو کر قلم اٹھاتی ہیں۔

اسی طرح نور الہدیٰ شاہ نے بھی سندھی معاشرے کے بوسیدہ رسم و رواج کی شکار اور جاگیردار سماج کی مکروہات میں گھری ہوئی عورت ذات کی کہانی لکھی ہے، لیکن ہم خیر النسا جعفری اور نور الہدیٰ شاہ کا ذکر محض خاتون افسانہ نگار کے طور پر نہیں کرنا چاہیں گے کہ ان کی تخلیقی سرگرمیاں کسی بھی اہم فن کار کے دائرہ کار سے جداگانہ نہیں ہیں۔ نور الہدیٰ شاہ کو اپنے ہم عصروں پر ایک فوقیت یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ماحول سازی اور فضا بندی میں درجۂ کمال پر فائز ہیں۔ اسی طرح کردار نگاری بھی ان کا شعبۂ خاص ہے۔ ان کے مجموعے 'کربلا'، 'جلاوطن'، 'رن اور رج جو اتھاس' (عورت اور آسودگی) میں شامل کہانیاں ان کی پختہ کاری کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

اس عہد کا سب سے روشن پہلو تکنیکی تجربات کی رنگا رنگی ہے، لکھنے والوں نے نئے موضوعات پر اظہار خیال بھی نئے نئے انداز سے کیے ہیں اور طرز نگارش کی نت نئی جھلکیاں دکھائی ہیں لیکن جہاں موضوع اور مواد اپنے ماحول اور زمینی حقائق سے باہر نکل گیا ہے، یعنی غیر فطری انداز اختیار کر گیا ہے۔ وہاں کہانی کا صرف ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے۔ تاثر اور ماجرائیت سے عاری۔ ایسی کہانیاں یقیناً کامیاب تجربے کی ذیل میں شمار نہیں کی جاسکتیں۔ اظہار و بیاں کے تجربے اور نئے نئے تکنیکی وسیلے ہر دور میں برتے گئے ہیں لیکن اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا گیا ہے کہ ہر تکنیکی تجربہ کہانی کی ماجرائیت، مواد اور موضوع سے باہم پیوست رہے اور محض بالائی سطح پر لفظوں کی کاری گری بن کر نہ رہ جائے، کیوں کہ کہانی کی اصل روح تو اس میں بیان کردہ موضوع اور مواد سے ہوا

Scanned by CamScanner

ہوتی ہے۔

چناں چہ تکنیک کو ذریعہ اظہار ہی رہنا چاہیے اور بجائے خود مقصد نہیں بننا چاہیے۔ جہاں لوگوں نے تکنیک کو مقصود بالذات قرار دیا ہے، وہیں وہ اپنی تخلیقی پیش کش میں ناکام رہے ہیں۔

افسانہ نگاروں میں خواتین افسانہ نگاروں کی بھی کثیر تعداد شامل ہے جنھوں نے معاشرتی مسائل خاص طور پر سندھی معاشرے میں خواتین کے مسائل اور عورتوں کی معاش، معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان خواتین افسانہ نگاروں نے سماجی رسومات اور بعض مذہبی تصورات کے ہاتھوں عورتوں اور بچوں کے استحصال کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں شامل چند نام درج ذیل ہیں:

بیگم زینت عبداللہ چنہ، رشیدہ حجاب، مہتاب محبوب، ثمیرہ زریں، زرینہ بلوچ، شمس نور الدین سرکی، روشن آرا مغل، ثریا یاسمین، جمیلہ تبسم، جمیلہ نرگس، مس جمانی، ذکیہ دریشانی، مس آفتاب اقبال شیخ، پروین سومرو، ارشاد قمر، بلقیس سید، ممتاز عارابی، نصرت بھٹو، آفتاب بانو عباسی، صحرا مارئی عالم، فریدہ مغل، ایس تبسم، مہتاب منور عباسی، زیب النسا مسرت، سکینہ میمن، نیلوفر جویو، نسیم تھیبو، فہمیدہ میمن، ثریا سوز ڈیپلائی، رعنا شفیق، نسرین جونیجو، سلمٰی صدیق، ج ع منگھانی، تبسم عروج قاضی، جہاں آرا سومرو، سعدیہ میمن، زبیدہ مہتلو، سجان گاد، صفورہ خانم راہوجا، خالدہ سومرو، جبین کاکی پوتہ، تہمینہ ناز جونیجو، الماس سندھو، حمیدہ مہتلو، عذرا چنہ وغیرہم۔

اس دور میں لکھنے والوں میں کم کم افسانہ نگار ہیں جو اپنے مجموعے شائع کرا سکے ہیں لیکن اس کے باوجود اس عہد میں چھپنے والے مجموعوں کی تعداد خاصی معقول کہی جا سکتی ہے۔

نئے تکنیکی اظہار کے ساتھ بعض نئے موضوعات پر بھی متواتر لکھا گیا ہے۔ جیسے انسان کے نفسیاتی و جنسی مسائل پر پہلے اگر ڈھکے چھپے اظہار خیال ہوتا تھا تو اس دور میں ان موضوعات پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ ایک اور موضوع انسان کی دبی ہوئی خواہشات کا اس کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کے اظہار میں ہوا ہے۔ یعنی انسان معاشرتی رسم و رواج اور اخلاقیات کے پیشِ نظر اپنی بعض فطری خواہشات کو دبا دیتا ہے تو اس کی

Scanned by CamScanner

خواہشات اصلاً ختم نہیں ہوتیں بلکہ کسی دوسرے رویے میں ظاہر ہو کر رہتی ہیں جس کے اثرات پہلے سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر کئی اہم افسانے لکھے جا چکے ہیں۔

ناول نگاری کا منظرنامہ

ہم گزشتہ صفحات☆ میں دیکھ چکے ہیں کہ سندھی ادب میں فکشن کی ابتدا ناول سے ہوئی تھی اور وہ ڈاکٹر جانسن کی ناول راسیلاس تھی جو ۱۸۷۰ء میں اسی نام سے سندھی میں منتقل کی گئی تھی، سب سے پہلی طبع زاد ناول مرزا قلیچ بیگ کی 'دل آرام' تھی، اس کے بعد ان کی شہرۂ آفاق ناول 'زینت' منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس پورے دور پر مرزا قلیچ بیگ کی ادبی شخصیت سندھی ادب پر سایہ فگن رہی ہے۔ دوسرے دور میں یعنی بیسویں صدی کے نصف اول میں قسط وار ناول لکھنے کا رواج تھا جو اخبارات و رسائل کی زینت بنا کرتے تھے یعنی ان کا مقصد قصے کو طول دے کر رسائل و جرائد کو مقبول عام بنانا تھا۔ چناں چہ اسی دور میں ''چندر کانتا باتتی''... نامی ناول کی پینتالیس قسطیں شائع ہوئی ہیں۔

تقسیم کے آس پاس ترجموں کی بہار تھی اور مختلف اشاعتی اداروں اور ادبی و سماجی انجمنوں کی طرف سے انگریزی، بنگالی، مرہٹی اور اردو کی مقبول ناولوں کو سندھی ماحول میں adopt کرنے کا چلن حسب معمول جاری تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ایم آر مائیداسانی نے ٹیگور کے ناول 'بغاوت' کا ترجمہ شائع کیا۔ اس سے قبل گلی کرپلانی ٹیگور کے ناول 'گورا' کو سندھی قالب دے چکی تھیں اور پروفیسر رام پنجوانی ایک دلچسپ انگریزی ناول کو 'پدما' کے نام سے ترجمہ کر چکے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں نارائن داس ملکانی نے روسی ناول کا ترجمہ 'بھوک' کے نام سے پیش کیا تھا۔ اسی زمانے میں گوبند مالھی نے متعدد ناولوں کو جن میں جنگ آزادی کی کہانی بیان کی گئی تھی سندھی میں ترجمہ کر کے پیش کیا۔

اردو سے متعدد تاریخی ناولوں کے ترجمے ہوئے جن میں سے 'حور دمشق'، 'خنجر ہلال'، 'منصور موہنا' وغیرہ خاں بہادر محمد صدیق میمن نے کیے، خاں بہادر محمد صدیق میمن نے علامہ راشد الخیری کی 'صبحِ زندگی' اور 'شامِ زندگی' کو 'زندگی جو پھریوں دور' اور 'زندگی

☆ کتاب کے جداگانہ باب میں ناول نگاری کے جائزے لے گئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

جو پیو دوز کے نام سے پیش کیے اور شیخ محمد قریشی کی 'دُر یتیم' وغیرہ بھی اسی زمانے میں پیش ہوئی اسی عہد میں محمد عثمان ڈیپلائی نے تاریخی ناولوں کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا تھا ان کی زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ وہ سال میں دو تین ناول شائع کر دیتے تھے۔ ان کی بیش تر ناول قسط وار چھپتی تھیں۔ محمد عثمان ڈیپلائی نے سو سے زائد ناولیں لکھی ہیں جن میں طبع زاد ناول بھی تھیں اور ترجمہ و تلخیص بھی۔

طبع زاد ناولوں میں آسانند ماموترائے کا ناول ''شاعر'' خاصا مقبول ہوا۔ جو سندھی زبان میں پہلا نفسیاتی ناول تھا۔ ۱۹۴۲ء میں سندر ساہت منڈل کی طرف سے پیتامبر کشنانی کا ناول 'پریم بندھن'۔ ۱۹۴۳ء میں پروفیسر پنجوانی کا 'قیدی'، 'شرمیلا' اور ۱۹۴۴ء میں 'لطیفا'۔ ۱۹۴۶ء میں 'اساں جو گھر' (ہمارا گھر) اور 'چاندی کی چمک' وغیرہ شائع ہوئی ہیں۔

نارائن داس بھمبھانی کی مشہور عالم ناولیں 'مالن' (۱۹۴۲ء)، 'ودھوا' (۱۹۴۳ء) اور 'غریبن جو ورثو' (۱۹۴۶ء) میں شائع ہوئی تھیں ان ناولوں میں دیہی سندھ کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ یہی وہ ناول ہیں جن سے سماجی حقیقت نگاری کو سندھی ناول کے باب میں استحکام حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۴۶ء ہی میں نانک رام دھرم داس کی سماجی ناول آرام محل اور ۱۹۴۷ء میں ج۔ و۔ آھوجا کی ناول 'رانی' شائع ہوئی تھیں۔

تقسیم کے بعد سندھی ادب جس صورت حال سے دوچار ہوا اس کا اظہار کیا جا چکا ہے، ناول نگاری پر نسبتاً زیادہ کٹھن وقت پڑا تھا کہ ہندو ناول نگار ترک وطن کر کے ہندوستان چلے گئے تھے۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ لے دے کے محمد عثمان ڈیپلائی کا دم غنیمت تھا کہ کچھ وقفے کے بعد انھوں نے ناول نگاری کے کام کو دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

پرانے اداروں کی جگہ نئے ادارے وجود میں آنے لگے تھے مثلاً فردوس پبلی کیشن ہالا، سندھی ادب ٹنڈو محمد خان، ادبی ادارہ حیدرآباد، پروگریسو حیدرآباد اور آواز ادب حیدرآباد، جیسے اداروں نے سندھی ناولوں کی اشاعت کی بطور خاص حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس دور میں جو اہم ناول شائع ہوئے ہیں ان میں انجم ہالائی کی ناول 'کاروان زندگی' حسینی محمد حافظ کی ناول 'تباہی'، سید حیدر شاہ کی 'زمیں راز'، رسول بخش تمار کی 'حسن'، حافظ

حیات شاہ کی 'سلطانہ'، قاضی عبدالکریم کی 'نوراں'، فضل احمد بچائی کی 'نازیہ'، لطف اللہ بدوی کی 'ایلا'، خواجہ غلام علی الانہ کی 'لاش'، ڈاکٹر منظور احمد عرسانی کی 'کلب گھر'، ناصر نورائی کی 'راتیوں جاگن جی' (راتیں جاگنے کی)، اللہ بخش تالپر کی 'پردیسی جو پیار'، راز بلوچائی کی 'گلبدن'، 'بھوک' اور 'بے روزگاری' اور 'شرابی' وغیرہ انور ہالائی کی ناول 'آوارہ'، 'ساز نو، آبادی کا شکستہ ساز'، گل نصیر پوری کا 'دریا کی کپت تی'، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو کی 'سوری آسینگار' اور شیخ محمد حسن کی ناول 'بولی' وغیرہ۔

یہ تمام ناول وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے چند ناول سماجی حقیقت نگاری کے تحت معاشرے کی سچائیوں کی آئینہ دار تھیں لیکن بعض محض روایتی انداز کی تھیں جو وقت گزاری کے لیے لکھی جاتی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ناول نگاری کے جمود کو سب سے پہلے محمد عثمان ڈیپلائی نے توڑا تھا، انھوں نے پے در پے تاریخی و نیم تاریخی نوعیت کی ناولیں لکھیں۔ ان میں 'انور پاشا'، 'آزادی کی جنگ'، 'دکن جا مجاہد'، 'نازنین سمرنا'، 'گم راہ مسافر'، 'فتح اسپین'، 'فتح یرموک'، 'قسطنطنیہ کی شہزادی'، 'سومنات جی سُندری'، 'شیر ایران'، 'جاپانی گڈی'، 'کارا کافر'، 'مسلمان عورت'، 'شیش محل'، 'کوریائی کنوار'، 'مصطفیٰ کمال'، 'ڈاہر جو رنگ محل'، 'نورِ توحید'، 'گلستانِ حسن' وغیرہ شامل ہیں لیکن جو شہرت ان کے ناول 'سانگھڑ' کو ہوئی وہ شہرت کسی دوسری ناول کو نہ ملی تھی۔ 'سانگھڑ' اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی ایک اہم ناول ہے کہ اس کا موضوع سندھ میں 'حُر تحریک' پر انگریزوں کے مظالم کی داستان ہے۔ کسی بڑے سیاسی و معاشرتی اور حساس موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی تخلیق ہے۔ 'سانگھڑ' میں دکھائے گئے ماحول اور اس سے پیدا ہونے والے تاثر نے اس ناول کو سندھ میں جاری قومی تحریک کا بھی حصہ بنا دیا ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے اعتبار سے بھی اس کی اپنی اہمیت ہے کہ کسی عوامی تحریک پر براہ راست لکھی جانے والی یہ پہلی ناول ہے۔

اس عہد کے فوراً بعد نہایت اہم ناول سراج الحق میمن کی 'پڑاڈو سوئی سڈ' (بازگشت) منظرِ عام پے آئی ہے۔ مذکورہ ناول ترخان اور مغل دور کی تاریخ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یوں تو یہ ایک سیدھی سادھی محبت کی کہانی ہے لیکن بہ غور دیکھیے تو تہ در تہ معنویت سے ہم کنار ہے۔ چوں کہ کہانی ترخان اور مغلیہ عہد سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا

اس کا تمام ماحول اور لوکیل تاریخ کے اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں سراج الحق میمن نے اس عہد کی جزئیات کو اس طرح اپنے تصور میں ترتیب دیا ہے کہ مغلیہ عہد میں سندھ کی صورت حال زندہ اور متحرک ہو جاتی ہے۔ تاریخی ناولوں کے باب میں ایک غلط فہمی بالعموم یہ پائی جاتی ہے کہ کسی گزرے ہوئے عہد کے بارے میں محض بیانیہ انداز میں منظر کشی کر دینے سے تاریخی ناول لکھنے کا منصب پورا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ادب میں تاریخی ناول بالعموم اسی سطحی نکتہ نظر سے لکھی جاتی ہیں لیکن اصل معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ ادب تاریخی ناول لکھنے والے سے اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ اس عہد کے بارے میں ایک مبصر کی طرح تبصرہ یا کمنٹری نہ کرے بلکہ اس عہد کو اپنے تمام رنگوں کے ساتھ دوبارہ تخلیق کر کے دکھائے۔ اس معیار پر بہت کم تاریخی ناول پوری اترتی ہیں۔ سراج الحق میمن کی ناول ''پڑاد و سوئی سڈ'' اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ چناں چہ تاریخی ناول نگاری کے باب میں بھی اسے سنگ میل کی حیثیت حاصل رہے گی۔

اس ناول کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں جو واقعات و حالات بیان کیے گئے ہیں جو منظر کشی کی گئی ہے، کرداروں نے جو خواب دیکھے ہیں اور جس طرح ان خوابوں کی شکست و ریخت ہوئی ہے، ان سب کا اطلاق آج کے عہد میں پائے جانے والی حقیقتوں پر بھی ہو رہا ہے۔ یعنی سراج الحق میمن ماضی کے آئینے میں لمحہ موجود کی بھی صورت گری بھی کر رہے ہیں اور اس کے باوجود فنی دائرہ سے باہر قدم نہیں نکالتے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ تاریخی ناول ہونے کے باوجود آج کی معروضی صورت حال اور اس سے پیدا ہونے والے احساسات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ مغلوں نے سندھ پر ترخانوں کے ذریعے جو مظالم ڈھائے ہیں اور سندھ کو بیرونی حملہ آوروں اور قسمت آزماؤں نے جس طرح لوٹا کھسوٹا ہے، سراج ان سب کا نقشہ اس عمدگی سے کھینچتا ہے کہ ہر صفحہ پہ آج کی سرگزشت نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ چناں چہ اس ناول کی ایک اہمیت اس کا علامتی طرز اظہار بھی ہے۔ بظاہر سراج صدیوں پرانی حکایت لکھ رہا ہے لیکن حقیقتاً اس کا مقصد و مدعا آج کی معروضی صورت حال کی عکاسی بھی رہی ہے، علامت اور استعارے کا اس انداز میں استعمال جداگانہ ندرت رکھتا ہے۔

سراج الحق میمن کی ناول ''پڑادو سوئی سڈ'' سندھ کے مزاحمتی ادب میں نمایاں

Scanned by CamScanner

اعلیٰ مقام کی حامل ہے کہ اس میں سندھ میں ابلتی ہوئی سندھیت اور حب الوطنیت کی لہریں موجزن ہیں۔ ماضی کو حال کے آئینہ میں دیکھنا اور کل کی سرگزشت میں آج کی صورت حال کا عکس دکھانا یقیناً غیر معمولی بات ہے۔ جوفنی بالیدگی کے بغیر ممکن نہ تھا۔

ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے۔

''سندھ... سندھ... سندھ...'' سوڈھل نے تقریباً روتی ہوئی آواز میں کہا...
''کہاں ہے سندھ؟ کیا یہ سندھ ہے؟ زخم زخم سسکتا ہوا، جس پر مردہ خور گدھوں کے غول کے غول جھپٹ پڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ہی دودو کا سندھ تھا؟ کیا یہی تماچی کا سندھ تھا؟ کیا یہی دولھہ دریا خاں کا سندھ تھا؟ وہ دیکھو لو سندھ کی لاش سڑ رہی ہے، وہ دیکھ لو تھٹھہ دھڑ دھڑ جل رہا ہے۔''

ایک جگہ ناول کا کردار کہتا ہے، ''کوئی اخوند اگر اپنے مدرسے میں فارسی نہ پڑھاتا تو اس کا حشر ویسا ہی ہوتا جیسا آخوند صالح کا ہوا ہے، کوئی شاگرد اگر فارسی پڑھنے سے انکار کرتا تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی اور جو کوئی عزیز فارسی کی تعلیم سے بچنے کے لیے بچوں کو اٹھا لیتا، اس کا سب مال و متاع، ضبط کرلیا جاتا تھا۔''

سندھی زبان کے ساتھ جو سلوک ون یونٹ کے زمانے میں ہو رہا تھا اور جس طرح سندھی عوام پر مادری زبان کی بجائے اردو تھوپی جارہی تھی کچھ ویسا ہی سلوک ترخانوں کے دور میں بھی ہوا تھا۔ چناں چہ صدیوں پرانی یہ تصویر اس منظر نامہ سے مختلف دکھائی نہیں دیتی ہے جس میں ماضی قریب کا سندھ سانسیں لے رہا تھا؟ اس میں کہیں کہیں جس بلند آہنگی کا احساس ہوتا ہے، وہ بھی دراصل عصری حالات کے پرتو کا نتیجہ تھی۔

سراج الحق میمن کی ناول ''پڑادو سوئی سنڈ'' کے ساتھ ہی جس دوسری ناول کا خیال ذہن میں آتا ہے وہ آغا سلیم کا ناول ''اونداھی دھرتی روشن ہتھ'' ہے۔ اس ناول میں آغا سلیم نے 'سارنگ' کا جو کردار تخلیق کیا ہے وہ دراصل سندھ کی دھرتی پر زندگی جھوجھتا ہوا آج کا انسان ہے، بے کس و مجبور لیکن پرعزم اور حوصلہ مند۔ ناول میں سارنگ بار بار شکست، ناکامی اور ہزیمت سے دوچار ہوتا ہے لیکن ہر بار ایک نئے عزم اور حوصلے سے زندگی کے عمل میں شریک ہوتا ہے اور ہر بار وہ ایک تاریخی شعور کی روشنی

Scanned by CamScanner

میں اپنی راہ تلاش کرتا ہے۔ ایک جگہ اس کا کردار کہتا ہے ''ساری دھرتی میرا دیس ہے، لیکن سندھ سے تو میری سانس کی ڈور بندھی ہے، سندھ تو وہ سرزمین ہے جس نے ہمیشہ پھول ہی پھول نچھاور کیے ہیں۔ خواہ اس کے بدلے میں اسے گالیوں اور گولیوں ہی سے کیوں نہ نوازا گیا ہو.... '' آغا سلیم کا مذکورہ ناول بھی سندھیت کے اُبلتے ہوئے جذبے اور سندھی تشخص کے احساس سے سرشار ہے۔

یہاں آغا سلیم کے ناول 'ہمہ اوست' کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے، کہ یہ ناول آغا سلیم نے سندھ کے فکری پس منظر میں لکھا ہے اور سندھی معاشرہ میں تصوف کی کارفرمائی کو اجاگر کیا ہے۔ آغا سلیم کا یہ ناول موضوع اور پیشکش کے لحاظ سے نہایت سبک انداز اور نرم آثار ناول ہے۔ جس کے اثرات انتہائی گہرے اور وسیع ہیں ۔ اس میں سندھی ثقافت کے دھاروں کو انسانی رشتوں اور سلوک میں کارفرما ہوتے دکھایا گیا ہے۔ آغا سلیم کا ایک اور مختصر ناول (ناولٹ) 'روشنی کی تلاش' ہے۔ جو زبان و بیان اور اظہار کی بنا پر سندھی کے منتخب ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں شہری معاشرے کا حال بیان کیا گیا ہے بلکہ شہروں میں چھوٹے فلیٹوں میں گزرتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کا کردار نعیم اپنی یادداشت سے گزرے زمانوں اور لوگوں کا حال بیان کرتا ہے لیکن ایسے انداز میں کہ سب کچھ رواں تصویر کی صورت گزرتا چلا جاتا ہے، فلیش بیک تکنیک کو آغا سلیم نے نہایت خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ آغا سلیم کی ایک اور ناول ''ان پورو انسان'' (نامکمل انسان) ہے۔ اس میں سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات کے رہن سہن، افتادِ زندگی، طور طریقوں اور ذہنی و جذباتی رویوں کی صورت کشی کی گئی ہے مراعات یافتہ طبقات کی زندگی کے کھوکھلے پن اور خاندان کے درمیان باہمی تضادات اور تصادم کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ آغا سلیم کی مذکورہ بالا تینوں ناولوں یعنی 'روشنی جی تلاش'، 'تاریک دھرتی اور روشن ہاتھ' اور 'نامکمل انسان' گو جداگانہ ناول ہیں لیکن تینوں ناولوں کے درمیان ایک محسوس کن ربط وموجود ہے۔ ان میں بعض تلازم خیال اور واقعاتی مشابہتیں بھی موجود ہیں جن کی بنا پر تینوں کتابوں سے ایک قسم کی تاثراتی وحدت پیدا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تینوں کتابوں میں 'خیال کی رو' (stream of consciousness) کی کارفرمائی بھی نمایاں ہے۔

Scanned by CamScanner

۱۹۷۶ء میں عبدالرزاق راز کا ناول جو پہلے 'مسافر' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ 'نواں آدمی' کے نام سے دوبارہ چھپا۔ اس ناول میں بھی سندھیت کے جذبے کو ابھارا گیا ہے۔ دراصل عصر رواں ہی ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس میں سندھ پر حملہ آور ہونے والے ڈاکوؤں اور لٹیروں کا تذکرہ کیا گیا ہے، آریاؤں، عربوں، نادر شاہ، مغل لشکر اور پھر انگریز، یہ سب بیرونی لٹیرے باری باری موقع ملتے ہی سندھ پر چڑھ دوڑتے رہے ہیں اور سندھی عوام کو لوٹ مار اور بربریت سے بار بار تاراج کرتے رہے ہیں۔ ان حملہ آوروں کے مقابلے میں صف آرا ہونے والے سندھی بہادروں اور سورماؤں کے ذکر اذکار بھی ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں سندھی فکر، سندھی تہذیب، سندھی مفاد اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو تحفظ فراہم کیے تھے اور جن کے نام سندھ کی تاریخ میں سدا روشن رہیں گے۔ ان ہی سورماؤں میں شاہ عنایت شہید بھی تھے اور ہوش محمد شیدی بھی۔ اس ناول میں ایک کردار 'ساجن' بھی ہے جو ہر دور اور ہر عہد میں بار بار ظاہر ہوتا ہے۔ جو گویا روح عصر کا نمائندہ کردار ہے۔ جیسے قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا میں گوتم نیلمبر بار بار ہر زمانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ عبدالرزاق راز کا یہ ناول پانچ ہزار برسوں کے تہذیبی سفر کی روداد بھی ہے۔ مذکورہ ناول ایک اہم ڈائجسٹ میں بھی قسط وار شائع ہو چکا ہے اور اپنے دور میں قارئین کے وسیع حلقے میں مقبول رہا ہے۔

غلام نبی مغل کے ناول ''اوڑاہ'' (اوتھلا پانی) کا موضوع بھی سندھی قومیت اور سندھی تشخص کی تلاش ہے۔ اس ناول میں بھی تاریخی پس منظر میں سندھ پر ہونے والے مظالم کی تصویریں دکھائی گئی ہیں، خاص طور پر سندھی معاشرے کے درمیانی طبقے کی کس مپرسی کی داستان بیان کی گئی ہے اور ناول نگار اس بات کو بطور خاص دکھاتا ہے کہ ہر حملہ آور کس طرح درمیانے طبقے ہی کو اپنا نشانہ بناتا رہا ہے اور کس طرح سندھ کے شہروں کو تباہ و برباد کیا جاتا رہا ہے اور سندھی تہذیب کی علامات کس طرح مسمار ہوتی رہی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ون یونٹ کی صورت میں سندھ کے شہروں پر ہونے والے استحصال کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اس طرح غلام نبی مغل کا مذکورہ ناول بھی مزاحمتی/احتجاجی ادب میں اہم مقام کا حامل ٹھہرتا ہے۔

امر جلیل کا معروف ناول 'نیٹ گونگی گالھ ئی' (آخر گونگی بول پڑی) نہایت

Scanned by CamScanner

دلچسپ ناول ہے جس میں امر جلیل اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں معاشرتی حالات کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ امر جلیل اپنی طرز کے مختلف فن کار ہیں اور ان کے ادب میں معاشرتی صورت حال اور معروضی مناظر کی کارفرمائی نمایاں رہی ہے۔ سندھی ادب کی مزاحمتی تحریک میں امر جلیل کا حصہ نمایاں رہا ہے جن پر تفصیلی اظہار خیال مناسب مقام پر ہوگا۔

موہن جو دڑو کے آثار قدیمہ کی دریافت نے سندھی قومیت کو ایک نئے احساس تفخر سے سرفراز کیا ہے۔ چناں چہ موہن جو دڑو کی تہذیب تخلیقی ادب کا سرچشمہ بھی ثابت ہوئی ہے اور اس کے پس منظر میں متعدد نظمیں، افسانے، ناول اور ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ علی بابا کا ناول ''موئن جو دڑو'' جو ماہنامہ ''نئین زندگی'' میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس طرح عابد لغاری کا ناول ''زندہ لاش کا سفر'' بھی موہنجو دڑو کے ثقافتی پس منظر میں لکھا گیا ہے'' اور سندھ کی تہذیبی شناخت کے موضوع کو ابھارتا ہے۔

قاضی فیض محمد کی دلچسپ فن تاسی Fantasy باونھ سو باونھ (۲۲۲۲) سندھی فکشن میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اس میں قاضی فیض محمد نے دو ڈھائی سو سال بعد پیش ہونے والی زندگی کا پیرایہ اظہار اور اردگرد ماحول کا تصوراتی نقشہ کھینچ دکھایا ہے فن تاسی لکھنے کا فن تاریخی ناول لکھنے کے فن سے کہیں زیادہ مشکل اور نازک ہوا کرتا ہے کہ تاریخی ناول لکھنے والے کے پاؤں ٹھوس زمین پر ٹکے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی گرفت عموماً مضبوط مادی شواہد پر ہوا کرتی ہے لیکن فن تاسی لکھنے والا امکانات کی اندھی سرنگ میں سفر کر رہا ہوتا ہے اور اس کا سارا دار و مدار تخیل کے بہتے دھاروں پر ہوا کرتا ہے۔ اس نوع کی فن تاسی انگریزی میں مشہور مصنف جارج آرویل نے انیس سو چوراسی (۱۹۸۴ء) کے نام سے کم وبیش پچاس سال قبل یعنی ۱۹۴۸ء میں لکھی تھی اور اردو میں محمد خالد اختر نے بیس سو گیارہ، سن انیس سو ساٹھ (۱۹۶۰ء) کی دہائی میں تحریر کی تھی۔ قاضی فیض محمد نے اپنے تخیل کے زور پر آنے والے وقت کے خاکے دکھائے ہیں جو سندھی ادب میں ایک ندرت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

منیر احمد مانک کے ناول ''رج ء پڑاڈ'' (سراب اور بازگشت)، ''پاتال مں

بغاوت'' ، ''اڑھنڈ نسل'' (بھٹکتی نسل) اور ''ساھ ماٹ میں'' جداگانہ مزاج اور تناظر کی ناول ہیں، منیر احمد مانک جدیدیت کی تحریک میں صفِ اوّل کا لکھنے والا تھا۔ اس نے سندھی معاشرے میں فرد کی بے بسی کی تصویریں کھینچی ہیں لیکن اپنے آپ کو سندھ کی معروضی صورت حال سے بھی وابستہ رکھا ہے، اسی لیے اس کی تخلیقات ان عیوب سے محفوظ رہی ہیں جو بالعموم جدیدیت کے لکھنے والوں کی تحریروں میں آجاتی ہے یعنی مغائرت اور شکست خوردگی، بے شک منیر احمد مانک بے جا خوش فہمی کا بھی شکار نہیں ہے اور عام طور پر تصویر کے تاریک پہلو بھی اس کی نظر میں رہتے ہیں۔ وہ حقیقی تصویر کی بجائے محض اپنی تخیل کی فضا میں پرواز نہیں کرتا۔ منیر احمد مانک کی ناول ''ساھ ماٹ میں'' ایسی حقیقت پسندانہ ناول ہے جس میں مانک نے مارشل لا کے دور میں سندھی عوام کی بے بسی اور لاچارگی کی تصویر کھینچ دکھائی ہے۔ پی این اے کی تحریک، مارشل لا اور عام لوگوں کی مایوسی اور محرومی کا احساسِ شدید اس ناول کے موضوع ہیں۔ یہ ناول اپنی تلخ نوائی اور حقیقت پسندی کی وجہ سے مارشل لا کے دور میں پاکستان میں نہیں چھپ سکا تھا۔ چناں چہ اس کا پہلا ایڈیشن بھارت ہی میں چھپا تھا اور دوسرا ایڈیشن پاکستان کے جمہوری دور میں چھپ سکا تھا۔

ادھر جدید ٹیکنالوجی کے اثرات بھی ادبی تخلیق کے عمل پر اثرانداز ہو رہے ہیں چناں چہ یاسمین بروہی نے ''نارنجی کیلا ۲۰۳۰ء'' کے نام سے جو ناولٹ لکھا ہے اسے بھی نئے انداز کی فن تاسی کہنا چاہیے۔ ان کے علاوہ بلال مسرور بدوی کی ناول ''رانی'' تسلیم ممتاز کی ناول ''روشنی جو گولا''، طارق عالم کی ناول ''رہجی ویل منظر'' (باقی رہ جانے والا منظر) بھی اہم ناول ہیں جو اس جدید دور میں لکھے گئے ہیں۔ اور جن میں جدید طرزِ احساس اور نئے رجحانات کا اظہار ملتا ہے۔

ڈراما نگاری کا منظر نامہ

قیامِ پاکستان سے قبل سندھ کے معاشرتی ماحول میں ڈرامہ نگاری نسبتاً عروج پر رہی ہے۔ ڈرامہ نگاری کا فروغ دراصل مشروط ہوتا ہے، اسٹیج، تھیٹرز اور ڈرامیٹک سرگرمیوں سے، وہ دور ایسا تھا کہ اس میں جگہ جگہ ڈرامیٹک کلب، سوسائٹیاں، ناٹک منڈل،

Scanned by CamScanner

ناٹک ساجیہ اور ایسی جماعتیں قائم تھیں جو ڈرامے سننے، ڈرامے دیکھنے اور ڈرامے کھیلنے میں بطور خاص دلچسپی لیتی تھیں، چناں چہ اس دور میں تمثیل نگاری بھی اپنے عروج پر تھی۔ لوگ ڈرامے لکھتے اور رسائل و جرائد میں ان کی اشاعت بھی ہوتی تھی۔ انگریزی، بنگالی، مرہٹی اور اردو ڈراموں اور تمثیلوں کے تراجم کا سرسبز دور بھی گزر چکا ہے۔ اس وقت مرزا قلیچ بیگ، ایم یو ملکانی، خان چند دریانی، جیٹھمل پرسرام، بھیرومل مہر چند، مرزا نادر بیگ، لیکھ راج عزیز، عثمان علی انصاری، آسوند ماموترائے، کشن چند بیوس، محمد عثمان ڈیپلائی، آغا غلام نبی صوفی، محمد اسماعیل عرسانی، احمد چھاگلہ وغیرہ کے لکھے ہوئے ڈرامے اور تھیٹر بالعموم پسند کیے جاتے تھے۔ ان میں طبع زاد تمثیلیں بھی تھیں اور ترجمہ کیے ہوئے ڈرامے بھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ تمثیل آشنا ماحول ہی ختم ہو گیا۔ ہندوؤں کے نزدیک ڈرامے کا ایک مذہبی اور معاشرتی تصور بھی تھا۔ جب کہ مسلمان بالعموم تھیٹر کو زیادہ پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور نام نہاد اخلاق پسندیت کے نام پہ محراب و منبر اور خود ساختہ سماج کے ٹھیکیدار اسٹیج اور ناٹک کے خلاف زہر اگلنے پر ہمیشہ مامور رہتے آئے ہیں۔ چناں چہ ہندوؤں کی ہجرت نے جہاں ادب کی دیگر اصناف کو نقصان پہنچایا وہیں سندھی ڈرامہ نگاری کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اور مدتوں سندھ میں ڈرامہ، تھیٹر اور تمثیل نگاری کا کام شجرِ ممنوعہ ہو کر رہ گیا اور وہ فضا دوبارہ بحال ہی نہ ہو پائی جو قیامِ پاکستان سے قبل یہاں موجود تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد محمد عثمان ڈیپلائی کا دم غنیمت تھا جنھوں نے سندھی ڈرامہ نگاری کے کام کو جاری رکھا۔ ان کے مشہور ڈراموں میں ''نور جہاں جو پٹ''، ''سچائی موڑی''، ''کانگریسی جاز''، ''شاھدی نجومی اور کورٹ'' وغیرہ شامل رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد محمد اسماعیل عرسانی کے ڈراموں کا مجموعہ ''ڈزن ڈائیلاگ'' اور ''حسن پروین'' شائع ہوئے تھے۔

لطف اللہ بدوی کا لکھا ہوا ڈرامہ ''دودو چنیسر'' جو شاہ لطیف بھٹائی کی داستان پر مبنی ہے، خاص طور پر مقبول تھا۔ شیخ ایاز نے ''دودو کی موت'' کے عنوان سے منظوم ڈراما لکھا تھا جو اپنے دور میں کالجوں کے ڈرامیٹک کلب اور سوسائٹیوں میں مقبول تھا اور اسے جگہ جگہ اسٹیج کیا جاتا رہا ہے۔ عبدالرزاق راز نے محمد بن قاسم پر ''فاتح سندھ'' کے نام

Scanned by CamScanner

سے ڈرامہ لکھا جو ایک خاص حلقے میں مقبول ہوا۔

ابتدائی دور میں چند شہرناز کے دو مکمل ڈرامے ''سیکا سیج پلنگ'' اور ''دریا خان'' عموماً پسند کیے گئے۔ مرزا علی مرزا نے عربی زبان میں لکھے ہوئے ڈرامے کو سندھی میں ''موئجھارو'' کے نام سے پیش کیا۔ اس کے بعد علی بابا کا لکھا ہوا ڈرامہ ڈگی مجھ دریا، رشید بھٹی کا ڈرامہ ''عاشق زہر پیاک'' محمد ہاشم رہبر کا ''سندباد سیلانی'' شمشیر الحیدری کا ''کاک محل'' ایاز عالم ابڑو کا ''ذات جی ذہن میں''، اللہ بخش تالپور کا ''عجیب شادی''، جی این قاضی کا ''شہنشاہ اکبر'' حبیب بخاری کا ''قلوپطرہ'' تھے، اس کے علاوہ حبیب اللہ مرزا نے شیکسپیر کے ڈرامے ''میکبیتھ'' کا ترجمہ پیش کیا۔ رسول بخش خمار کا ڈرامہ پاچا چھرلاء۔ ادھر رشید احمد لاشاری نے ہندی کے مشہور ڈرامے ''شکنتلا'' اور ''مل دمیتی'' کے ترجمے کیے۔ ظہور انصاری نے ''جن جوناگڑھ جلایو'' (جنھوں نے جوناگڑھ کو آگ لگائی) وغیرہ شائع کیے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد تمثیل نگاری کا ماحول دوبارہ میسر نہ آسکا۔ اسٹیج اور تھیٹر کی سہولتیں دن بہ دن معدوم ہوتی چلی گئیں۔ ڈرامہ، تھیٹر اور اسٹیج دیکھنے والے شائقین ناپید ہوتے گئے۔ چناں چہ ڈرامہ لکھنے اور چھاپنے والے بھی کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ لیکن ظاہر ہے جب ایک راستہ بند ہوتا ہے تو زندگی اپنے اظہار کے لیے کسی اور راستے کا انتخاب کر لیتی ہے۔ چناں چہ اسٹیج کے زوال نے ریڈیو تمثیل اور ریڈیو ڈرامے کو ترقی دی جو سندھی زبان میں بالکل نئی چیز تھی۔

۱۹۵۰ء میں ریڈیو پاکستان کراچی سے سندھی زبان کے پروگرام شروع ہوئے تو اس میں سندھی تقریروں، فیچر اور سندھی موسیقی کے ساتھ ساتھ سندھی ڈرامے اور تمثیل پیش کرنے کی گنجائش بھی نکالی گئی۔ ابتدائی دور میں امام بخش نیاز، حبیب اللہ فکری، اور عبدالکریم شاد، خدیجہ چھاگلہ اور عبداللطیف عباسی نے سندھی میں ریڈیائی تمثیلیں لکھیں، اسی دور میں خدیجہ چھاگلہ اور حبیب اللہ فکری نے قدیم لوک داستانوں کو بھی ڈرامائی تشکیل دیں جن میں عمر ماروی اور نوری جام تماچی بطورِ خاص مقبول ہوئیں۔ لیکن سندھی میں ریڈیائی ڈراموں اور صداکاری کی بنیاد ڈالنے کا سہرا علی احمد چھاگلہ اور ایم بی انصاری کے سر رہا ہے۔ ابتدا میں سندھی ڈراموں کا دورانیہ صرف آدھ گھنٹے کا ہوا کرتا تھا۔

Scanned by CamScanner

۱۹۵۰ء ہی میں جب حیدرآباد اسٹیشن کا افتتاح ہوا تو وہاں سے طویل دورانیے کے سندھی ڈرامے بھی نشر کیے گئے۔ اس سلسلے میں منظور نقوی نے پہلا سندھی ڈرامہ ''روئی'' لکھا جو اردو سے ماخوذ تھا۔ منظور نقوی سندھی ریڈیو ڈرامہ نگاری میں ایک اہم نام کے طور پر ابھرے تھے۔ جس نے کئی طویل اور مختصر دورانیے کے ڈرامے، تمثیلیں اور فیچر حیدرآباد ریڈیو کے لیے لکھے۔ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ''جیارو بت'' (زندہ بت) بہت مقبول ہوا تھا۔

منظور نقوی کے علاوہ زیب ماتلی کے ڈرامے مہندی رتا ہتھ (مہندی لگے ہاتھ) اور ''ستارہ'' ایسے ڈرامے ہیں جو بار بار نشر کیے گئے۔ ان میں ''ستارہ'' پہلا سندھی ڈرامہ تھا جو نظم معریٰ میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد کے دور میں ابن الیاس سومرو، مراد علی مرزا، ممتاز مرزا، آغا سلیم، امر جلیل، علی بابا، شمشیر الحیدری، شوکت شورو، شمر چند، قاضی خادم، ڈاکٹر محمود یوسف پھلپوٹو وغیرہ کے نام شامل ہیں جنھوں نے سندھی معاشرت، تاریخ، ثقافت اور روزمرہ کے واقعات پر بہت پُر اثر ڈرامے لکھے تھے۔ ممتاز مرزا کی ڈرامائی تمثیل ''سورج مکھی'' اور ''آخری رات'' آغا سلیم کے ڈرامے ''روپ سروپ'' قاضی خادم کے ڈرامے ''لڑک لڑک زنجیر'' بطور خاص مقبول ہوئے۔

سندھ میں ٹیلی وژن کے آغاز کے بعد سندھی زبان میں ٹیلی وژن کے لیے بھی ڈرامے لکھے گئے جو سندھی و غیر سندھی ناظرین میں بھی مقبول ہوئے۔ اس سلسلے میں عبدالکریم بلوچ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جانا چاہیے کہ ٹیلی وژن سے نشر ہونے والے ڈراموں میں سب سے پہلے شمشیر الحیدری نے مرزا قلیچ بیگ کے مشہور ناول ''زینت'' کو بنیاد بنا کر سندھی کھیل لکھا جو تین قسطوں میں پیش کیا گیا۔ دوسرا کھیل علی بابا نے ''ھی جیوں ھی سپنا'' (یہ جیون یہ سپنے) پیش کیا۔

امر جلیل کا ڈرامہ ''اوندھہ ء روشنی'' (اندھیرا اور روشنی) اور ''مٹی جا ماڻھو'' (مٹی کے آدمی) آغا سلیم کا ڈرامہ ''خواب جو سورج'' (خواب کا سورج)، ''پرہ جا مسافر'' (پو پھٹے کے مسافر)، پوہاڑی جا پاچا (پچھلے پہر کی پرچھائیاں) وغیرہ مقبول ہوئے۔

ٹی وی ڈرامہ نگاری ایک مختلف میدان ہے اور اس ڈرامے کی مقبولیت میں لکھنے والے کی کاوش کے علاوہ اداکاری، صداکاری، گلیمر اور پروڈکشن کے مختلف عناصر

Scanned by CamScanner

ہیں جو کامیابی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ ان ڈراموں کی ادبی حیثیت غالباً ابھی متعین ہوئی ہے کیوں کہ ان ڈراموں کی عام طور پر کتابی صورت میں اشاعت نہیں ہوا کرتی اس لیے انہیں ادبی ڈرامے کی صنف میں شامل کرنے میں شاید تامل کیا جائے گا۔

ٹیلی وژن کے ڈرامہ نگاروں میں علی بابا، آغا سلیم، عبدالکریم بلوچ، شمشیر الحیدری، عبدالقادر جونیجو، مراد علی مرزا، نور الہدیٰ شاہ، ابن حیات، امر جلیل، قاضی خادم، منظور قریشی، امداد حسینی، زرینہ بلوچ، عبدالحق ابڑو، ممتاز مرزا، رزاق مہر، عنایت میمن، بیدل مسرور، آغا رفیق، طارق عالم ابڑو، محمد خان جمانی، غالب لطیف وغیرہ کے نام بطور خاص لیے جاتے ہیں۔ علی بابا کے معروف ڈرامے "ڈگی مچھ دریا" کو پاکستان کی جملہ زبانوں کے منتخب ڈراموں میں اول نمبر مل چکا ہے اور اسے بین الاقوامی ثقافتی میلے کے مقابلے میں بھی شریک کیا گیا ہے۔ عبدالقادر جونیجو کی تمثیل "رانی جی کہانی" اتنی مقبول ہوئی کہ اسے اردو میں "دیواریں" کے نام سے قومی رابطے پر متعدد بار پیش کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح نور الہدیٰ شاہ کا مقبولِ عام ڈراما "جنگل" اردو میں جنگل کے نام سے اپنی مقبولیت قائم کر چکا ہے۔ آج سندھی ٹی وی ڈرامے اپنی حقیقت نگاری اور عام دیہی منظر نگاری کی وجہ سے بلاتخصیصِ زبان پاکستان کے ٹی وی ناظرین میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔

کتابیات

۱۔ Dr. Ghulam Ali Alana، An Introduction of Sindhi Literature

Sindhi Adabi Board. Jamshoro

۲۔ Prof. (Miss) Popat. R. Hiranandani، History of Sindhi Literature

۳۔ سندھی نثر کی تاریخ (سندھی) پروفیسر منگھا رام ملکانی، روشنی پبلی کیشن، حیدرآباد

۴۔ سندھی زبان و ادب کی مختصر تاریخ (اردو)، پروفیسر ڈاکٹر حیدر سندھی، مقتدرہ قومی زبان

۵۔ آزادی کے بعد سندھی افسانے کی رفتار (سندھی) شمس الدین عرسانی، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، جام شورو

٦۔ سندھی ناول جی ارتقائی تاریخ (سندھی) ڈاکٹر غلام حسین پٹھان، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، جام شورو
۷۔ سندھی ادب کا فکر پس منظر (سندھی) ڈاکٹر غفور میمن، شاہ لطیف چیئر، کراچی یونی ورسٹی
۸۔ سندھی کہانی کی رفتار... مختصر جائزہ (سندھی) ممتاز مہر
۹۔ سندھی ڈرامے کی صدی، آغا خالد سلیم، ادارۂ ثقافتِ پاکستان، کراچی
۱۰۔ چہار مقالہ (سندھی) محمد اسماعیل عرسانی
۱۱۔ رسالہ 'مہران'، رسالہ 'روح رہان'، رسالہ 'سوہنی'، رسالہ 'سوجھرو' کے فائل۔
۱۲۔ متعدد اہم افسانوی مجموعے، ناول، ڈرامے جن کا تذکرہ ہوا۔

Scanned by CamScanner

جلیل عالی

میرا فکری و تخلیقی عمل

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ بنیادی سوال میرے اندر کلبلاتا رہتا ہے کہ مجھے ہونے کے اس عذاب میں کیوں ڈالا گیا ہے؟'' ایک اعلانیہ جواب ملتا ہے کہ یہ ایک امتحان ہے اس میں کامیابی دائمی نشاط و انبساط کا پروانہ ہوگی۔ وجودی کرب چپٹ پڑتا ہے۔ ''میں نے اس امتحان میں بیٹھنے کی کب درخواست دی تھی؟ کیا یہ امتحان میرا آزادانہ انتخاب ہے؟ ہرگز نہیں!'' اس بنیادی سوال کے جواب کی تلاش اور اس اذیت سے نجات کی کوشش مجھے اکثر معلوم و موجود سے آگے کے علاقوں میں سرگرداں کر دیتی ہے۔ اس سرگردانی کے دوران مجھے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور موجود و معلوم کو ایک ایسے جمالیاتی فاصلے سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ جس سے موضوع و معروض کی تفہیم کے کئی نئے گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ میرا یہ شعر کچھ ایسے ہی لمحات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نثار ان ساعتوں پہ صدیوں کے سحر عالی
بنے ہیں جن کے جلو میں شام و سحر سے آگے

میرے طرزِ فکر و احساس کی تشکیل کے اہم ترین مراحل کی اجمالی مختصر روداد یہ ہے کہ انٹر کی سطح پر منطق، نفسیات اور معاشیات کے مضامین سے میری سوچ میں بہتری پیدا ہوئی۔ گریجویشن کے درجے پر اخلاقیات و نفسیات اور اردو ادب کے مطالعے نے حسن و قبح اور خیر و شر کے حوالے سے فکری گہرائی عطا کی۔ اس مرحلے پر فلسفے کے استاد گرامی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے میری شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مجھے ایک صوفی مجاہد کے تصور سے آشنا کیا۔ ایم اے اردو کے زمانۂ طالب علمی میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید

سجاد باقر رضوی، خواجہ محمد زکریا اور سید معین الرحمٰن سے کسب فیض نے میرے ادبی ذوق کو نکھارا۔ اور ایم اے سوشیالوجی سے جہاں ادب کو سماجی وتہذیبی پس منظر میں سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی وہاں تجریدی فکریات اور معروضی اطلاق میں ایک توازن کی اہمیت کا شعور بھی حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں اقبال کے سنجیدہ مطالعے نے میری ڈانواں ڈول مذہبیت کو سہارا دیا۔ کلام اقبال سے نصب العینی سطح پر جینے کی تحریک ملی اور فکری اعتبار سے اس کے لیکچرز کا یہ جملہ میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا کہ خدا اور کائنات، روح اور مادہ لازم وملزوم ہیں، کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا، ایک کا استرداد دوسرے کو رد کرنے کے مترادف ہے۔

ہم چند دوستوں نے پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں ''نئے لوگ'' کے نام سے ایک ادبی، فکری انجمن بنا رکھی تھی، جس کے اجلاسوں میں شعبۂ فلسفہ کے طالب علم نعیم جوزی، محمد امین، اقبال آفاقی اور منظور اعجاز، شعبۂ نفسیات کے ہارون رشید اور شاہد محمود ندیم، شعبۂ انگریزی کے سجاد میر اور شعبۂ ابلاغیات کے امتیاز عالم کے علاوہ اس وقت کے معروف اشتراکی دانشور افتخار جالب اور عزیز الحق بڑی باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ ترقی پسندی اور اشتراکیت سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ سوشیالوجی کا طالب علم ہونے کے ناتے مجھے نہ صرف مارکسزم کے باقاعدہ مطالعے کا موقع ملا بلکہ اپنے شعبے میں مارکسزم پر ایک سیمینار دینے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ مجھے یاد ہے یہ سیمینار میں نے شعبے کی روایت کے برعکس بطور چیلنج انگریزی کی بجائے اردو زبان میں دیا اور خلاف معمول سوال وجواب میں طلبہ کی بھرپور شرکت سے اس حقیقت کی توثیق کا موقع بھی ملا کہ اپنی قومی زبان کو وسیلۂ اظہار بنانے سے افہام وتفہیم میں کتنی سہولت رہتی ہے اور فکری عمل کے اصل تقاضے کس قدر پورے ہوتے ہیں۔

جہاں تک میرے اپنے فکری سفر کا تعلق ہے معاشی ومعاشرتی حرکیات کی تفہیم کا بہت بہتر ذریعہ محسوس ہونے کے باوجود مارکسزم لینزم، اخلاقیاتی وروحانی سطح پر مجھے

Scanned by CamScanner

مطمئن نہ کر سکا۔ ابن عربی کے درجات حقیقت اور مراتب وجود کے تصورات سے تعارف حاصل ہوا تو ایک ایسا کلی ویژن مرا نصب العین بن گیا جو حقیقت کی مختلف جہتوں کے آپسی تضادات زائل کر کے ایک وحدت کا احساس ابھار سکے۔ شاید اسی لیے غزل میرے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کہ یہ اپنی صوری و معنوی ماہیت کے اعتبار سے کثرت میں وحدت ہی کی آئینہ داری کرتی ہے۔

کس صورت ثبات پہ ٹھہری نگاہ دل
اک رقص رو میں ٹوٹتے بنتے چلے گئے

غالب کا یہ شعر

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
وا ماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

جس انسانی مجبوری کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کے مطابق ہمارے عقائد ایک لحاظ سے ہماری نفسی دفاعی میکانیت ہی کا نتیجہ دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ذاتی شکوک شبہات اور تحفظات کے امکان کے باوجود حقیقت اور وجود کی تمام سطحوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تشکیل پانے والا کثیر الجہات مابعد الطبیعاتی نظام فکر و احساس کسی بھی یک سطحی فکری نظام سے زیادہ جامعیت رکھتا ہے۔ اور ایسے کلی تصور حقیقت سے ابھرنے والے تصور انسان کا کم از کم مطالبہ یہ ہے کہ انسان کو نا انسان بنا کر رکھ دینے والی معاشی محرومی اور معاشی افراط، دونوں صورتوں سے نجات دلانے والے عمرانی معاہدے کے خد و خال ابھارے جائیں اور اس کے عملی نفاذ کا جتن کیا جائے۔ اس عظیم نصب العین کے اطلاقی و عملی پہلوؤں کے حوالے سے یہ پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ انفرادی روحانی و مابعد الطبیعاتی احساس و تجربہ کسی بڑی روحانی و مابعد الطبیعاتی روایت سے ہم رشتہ ہو کر ہی معاشرتی و تہذیبی جہات میں بامعنی اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ عالمی روحانی و مابعد الطبیعاتی روایتوں کے مطالعے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری روحانی و مابعد الطبیعاتی اور نفسی و

تہذیبی دنیا اسلامی، فکری و تہذیبی روایت کی وسعتوں ہی میں زندہ و بیدار ہوتی ہے اور اسی سے میری قومی وابستگی، انسان دوستی اور آفاقیت کا تعین ہوتا ہے اور اسی کے بیکراں سر چشموں سے مجھے جبر و استحصال، ظلم و ناانصافی اور سامراجیت کی جملہ صورتوں کے خلاف جہاد و مزاحمت کی قوت اور حوصلہ ملتا ہے۔

ہمیں اس حکمتِ دوراں کا اک نکتہ بہت ہے
تمنا ہے الٹ دیں وقت کے داؤ تو آؤ

میرے باطن میں عقل و وجدان کی کشمکش جاری رہتی ہے لیکن مجھے اپنے عقلی نتائج زیادہ پرکشش محسوس ہوتے ہیں جنھیں میرے وجدان کی تائید حاصل ہو۔ بلکہ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ میرے عقلی دلائل کسی وجدانی احساس کی تصدیق کے لیے ہی مرتب ہوئے ہیں۔ تاہم عقل سے آگے گزر جانے کے ارتقائی تجربوں کے باوجود میں نفیِ عقل کا ہرگز قائل نہیں ہوں بلکہ میرے ہاں عقلی پیمانوں کے لحاظ کا یہ عالم ہے کہ بعض احباب مجھے اوور ریشنل قرار دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مگر میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتا ہوں کہ مجھے کسی حد تک اقبال کی اس بصیرت اور سطحِ فکر و احساس شرکت کی اہلیت میسر ہے کہ:

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

ایک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

اور خود اپنے ایک شعر کے مطابق میرا خیال یہ ہے کہ:

عشق خود سکھاتا ہے ساری حکمتیں حالیؔ
نقدِ دل کے دینا بار سر کہاں رکھنا

روحانی واردات کی طرح شعری تجربے کا بھی یہ وصف ہے کہ اس میں بڑے بڑے تضادات زائل ہو جاتے ہیں اور یہ ایسے فکر و احساس کے ابلاغ کی راہیں بھی نکال

Scanned by CamScanner

لیتا ہے جنھیں عقلی و منطقی پیمانوں میں سمونا محال و ناممکن ہوتا ہے۔ تخلیقی واردات اپنے اندر حسن و جمال اور انکشاف و دریافت کے ایسے پہلو رکھتی ہے کہ بیشتر بے معنی دکھنے والے احوال حیات ایک پرکیف معنویت سے ہمکنار ہونے لگتے ہیں اور زندگی کرنے کا ولولہ تازہ ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے تخلیقی وقفوں کے بنجر شب و روز مجھے شدید کرب سے دوچار کیے رکھتے ہیں۔

جب بھی موسم ہنر حرف و بیاں لے جائے
یوں لگے جسم سے جیسے کوئی جاں لے جائے

میرا رواں رواں بڑی بے چینی سے ان وقفوں کے خاتمے اور تخلیقی لمحات کی آمد کا انتظار کرتا ہے:

ترستا ہے دل شاعر
کہیں کوئی سخی ساعت
بھی دو چار
خوش تعبیر حرفوں کا کرم کر دے
تو کچھ دن زندگی کرنے کا
پھر سے آسرا ہو جائے   (احتیاج)

چنانچہ جب بھی مطلوبہ ساعتیں نصیب ہوتی ہیں تو پورا وجود ایک عجیب معنوی سرشاری میں نہا جاتا ہے۔

جب بھی بادل بارش لائے شوق جزیروں سے
خوشہ خوشہ حرف کی بیلیں بھر گئیں ہیروں سے

تخلیقی عمل ایک نہایت پیچیدہ اور پر اسرار عمل ہے۔ یہ نہ صرف مختلف تخلیق کاروں کے ہاں مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے بلکہ بعض اوقات ایک ہی تخلیق کار کے مختلف تخلیقی تجربوں میں مختلف انداز سے کارفرما ہوتا ہے۔ تاہم بہت سی متنوع کیفیات کے

Scanned by CamScanner

باوجود زندگی میں بار بار تخلیقی مراحل سے گزرنے کی بنا پر ایک تخلیق کار کسی حد تک اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں کچھ واضح اور کچھ دھندلے اشارے کر سکے۔ یہاں میرے پہلے شعری مجموعے کے آغاز میں درج میری نظم "ا ب ج د" کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔ اس میں میرے تخلیقی لمحات کی چند کیفیات یوں نمایاں ہوئی ہیں۔

جیسے فضا میں
کبھی کبھی آوارہ بادل
بامعنی تصویر کی صورت بن جاتے ہیں
جیسے درختوں کی شاخوں پر
کبھی کبھی سرمست ہواؤں کے جھونکوں سے
پتوں کی آوازیں
ہم آہنگ سروں میں ڈھل جاتی ہیں
جیسے کوئی ننھا سا بچہ
پہلی بار اچانک ایک دن
ٹوٹے پھوٹے لفظ ملا کر
پوری بات بنا لیتا ہے

میں زیادہ تر غزل کہتا ہوں۔ تخلیقی عمل کے حوالے سے میرے احساسات کا ادھورا سا خاکہ یہ ہے کہ کسی تازہ غزل کے آغاز سے چند روز پیشتر ہی مجھ پر کچھ مختلف سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں ایک انوکھے اکسائٹمنٹ، ایک عجیب سی بے چینی سے گزرنے لگتا ہوں۔ اس دوران اچانک غزل کی کوئی زمین کسی ابتدائی مصرعے کی صورت سامنے آ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تخلیقی واردات کی دریافت کے لیے بنیادی کلید ہاتھ آ گئی ہو۔ ساری سانگیکی اس زمین کے آہنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ مصرعہ یوں احساس دلاتا ہے جیسے سطحِ سمندر پر کوئی آتش برگ تیرتا ہوا دکھائی دیا ہو جس کا زیرِ آب

مصرعہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ مجھے فکر و احساس اور معانی و تاثر کی ایک پر اسرار اور پر جاذب دنیا میں لے جاتا ہے۔ طرح طرح کی تصویروں، عکسوں اور ہیولوں کا ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ ان تصویروں، عکسوں اور ہیولوں کو گرفت میں لینے کے بہت جتن کرتا ہوں مگر الفاظ بے مایہ و لاچار دکھائی دیتے ہیں۔ پھر دوسرے مصرعے کی آمد یا تشکیل سے احساس ہوتا ہے جیسے تخلیقی واردات کے کسی ایک پہلو کی ذرا سی جھلک دکھائی دے گئی ہو۔ اگرچہ مناسب الفاظ کی عدم دستیابی کا احساس بدستور موجود رہتا ہے تاہم مناسب الفاظ کی تلاش کو ملتوی کر کے میں واردات کے دوسرے گوشوں کی دریافت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ کبھی کبھار پورے کا پورا مصرعہ یا پورے کا پورا شعر ایسے موزوں الفاظ کے ساتھ آپ سے آپ سامنے آجاتا ہے کہ اس سے زیادہ موزوں الفاظ تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ پانچ سات اشعار کے بعد جب حیرت و استعجاب کی شدت ماند پڑنے لگتی ہے تو مزید اشعار کہنے کی کوشش ترک کر دیتا ہوں اور پچھلے اشعار کی تراش خراش میں لگ جاتا ہوں۔ تراش خراش کے عمل میں بھی یہی بات اہمیت رکھتی ہے کہ شعری واردات کی نزاکت، لطافت اور وقار سے پوری طرح ہم آہنگ پیرایۂ اظہار تک رسائی حاصل ہو۔ اس ضمن میں قطعی اطمینان تو کبھی بھی حاصل نہیں ہو پاتا پھر بھی یہ طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ پانچ سات اشعار نے مل کر اس پراسرار واردات کے کچھ نہ کچھ نقوش تو ابھار ہی دیے ہیں جس نے پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

عالی طلوعِ فن کی نشانی یہی تو ہے
لفظوں میں ان کہی کا اثر جاگنے لگے

تخلیق ہونے والی ہر غزل نشاطِ یافت کے ساتھ ساتھ ایک ملالِ نایافت اور ایک گہرا احساسِ نارسائی بھی دے جاتی ہے۔ اور یہ حسرت ہوتی ہے کہ فکر و احساس اور معانی کے جن پراسرار علاقوں سے گزر ہوا کاش ان کے کچھ اور

Scanned by CamScanner

کی ہیئت بھی محفوظ ہو سکے۔

ابھر ابھر کر ہزار لہروں مثال آئے
مگر کہاں اوج شعر تک سب خیال آئے

اس سارے تخلیقی سفر کا دورانیہ کم سے کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے پر محیط ہوتا ہے۔ میں نے اپنی نظموں کی ہیئت کے عمل بارے زیادہ غور نہیں کیا مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بنیادی طور پر وہ بھی تخلیقی بے چینی ہی کی دین ہیں اور کسی نہ کسی طور میری مرکزی تخلیقی واردات ہی سے امرشتہ ہیں۔ میں زبردستی شعر کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے دوسرے شعراء کی بھی ایسی ہی شاعری اچھی لگتی ہے جو فنی دسترس اور استادانہ مہارت کے شعوری مظاہرے کی بجائے حقیقی تخلیقی واردات کا فطری ثمر ہو۔ یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنی تخلیقی ذات کی دریافت میں میرتقی میر، غالب، اقبال، راشد، مجید امجد، فیض، ندیم اور منیر نیازی کے مطالعے نے بڑی مدد دی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے اپنے شاعرانہ وجود کے بکھرے ہوئے ریزوں کو بیشتر انہی کے ہاں سے اکٹھا کیا ہے۔ تخلیقی تحریک کے ان خصوصی حوالوں سے قطع نظر مجھے سبھی جینوئن فنکار بھلے لگتے ہیں۔ میں اپنے تمام ہمعصر تخلیق کاروں کو اپنی ترجیحی برادری تصور کرتا ہوں۔ اپنی باطنی و روحانی صحت کے خیال سے میں دوسروں کے فکری و تخلیقی جوہر کا بہت جلد اعتراف کر لیتا ہوں۔ البتہ ادبی جعلسازی سے مفاہمت نہیں کر سکتا کیونکہ میں انسانی تذلیل کی ہر صورت سے دکھی ہوتا اور اسے رد کرتا ہوں۔ ایسے تخلیق کار جو فکری و نظریاتی اور اخلاقی حوالوں سے اپنی مرکزی تخلیقی واردات سے قریب تر رہنے کی کوشش کرتے ہیں مجھے اور بھی زیادہ اچھے لگتے ہیں۔

مجھے انسانی بلند کرداری بہت انسپائر کرتی ہے۔ مجرد افکار و نظریات کی اپنی قدر و قیمت کے باوجود میرے نزدیک معاشرے کی حقیقی تعمیر و تہذیب میں انسانی کردار و عمل ہی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اپنے فکر و نظر اور آدرش سے ہم آہنگ زندگی کرنے والے

Scanned by CamScanner

لوگوں کو میں لائقِ صد احترام سمجھتا ہوں۔ میرے خیالات اور زاویۂ نگاہ کے بالکل برعکس نظریات رکھنے والے افراد کی بھی یہ خوبی میری نظروں میں ان کا مقام بہت بلند کر دیتی ہے۔ سنجیدہ غور و فکر کرنے والے سچے لوگوں کا ایک ہی جیسے نتائج پر پہنچنا لازمی نہیں ہوتا۔ اپنے اپنے اندازِ نظر سے حیات و کائنات کی مختلف تعبیر اور تصورِ انسان کی مختلف تشکیل تک رسائی ایک فطری امر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کوئی اپنے طرزِ فکر و احساس اور نصب العین سے کتنا مخلص ہے۔ مختلف افکار و تصورات کی موجودگی میں فکری و تہذیبی عمل کی بہتر پیش رفت کے لیے تحفظات کے بغیر پُر خلوص مکالمہ ہی ایک روشن راستہ ہے۔ اس لیے مکالمے کا تعطل میرے لیے تنہائی و قطعے کے کرب سے کسی طور کم اندوہناک نہیں ہوتا۔ مکالمہ چاہے گفتگو کے توسط سے ہو چاہے تخلیق کے وسیلے سے وہ دوسروں کو اپنے زاویۂ نگاہ سے منظر بینی کی دعوت ہی تو دیتا ہے۔ سو یہ کہنا میری مجبوری بھی ہے اور حق بھی کہ:

یہ منظر وہی
ہے
جہاں سے اسے
میں نے دیکھا ہے
تم بھی
وہاں پر کھڑے ہو کے دیکھو
تو کچھ ایسے اسرار کھلنے لگیں گے
کہ شاید تمہیں
سارے منظر کے بارے میں
پہلا تاثر بدلنا پڑے
(زاویہ)

Scanned by CamScanner

دکتر سعید بزرگ بیگدلی

ترجمہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی

مشرق و مغرب کے ثقافتی روابط اور کلام اقبال میں ان کا عکس

مختلف ثقافتوں کو زیر بحث لاتے ہوئے مشرق کے ایک صاحب نظر نے جس کی فہم و فراست نے دنیا کے حکمرانوں کو کشور کشائی کا مفہوم دیا ہے ارباب بست و کشاد کو از سر نو اس موضوع کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یوں دنیا کے تمام صاحبان فکر اور ترقی یافتہ ممالک کے لوگ خاص طور پر اہل یورپ مشرق زمین کی تہذیب و ثقافت کی طرف دوبارہ راغب ہونے لگے ہیں۔ اس طرح کہ اقوام متحدہ جو دنیا میں صلح و امن کا نمائندہ ادارہ ہے اس نے بھی آئندہ عیسوی سال کو ثقافتوں پر بحث و مباحثے کا سال قرار دے دیا ہے۔ یہ مہم ایک لحاظ سے مشرق کی معنوی قوت کی آئینہ دار ہے جس نے ثقافت جیسے آبدار موتی کو اپنی آغوش میں پال کر آج کی دنیا کو درپیش اہم ترین سوال کا جواب مہیا کیا ہے، اسی بات کے پیش نظر راقم الحروف نے اسی موضوع کو اپناتے ہوئے سوچا کہ اپنی بساط کے مطابق اس بحث میں جو کہ ہر چند ایک فکری موضوع ہے لیکن اس کا تعلق ہر آزاد انسان کے باطن سے ہی ہے، حصہ لیا جائے۔ ایک مدت سے میں سوچ رہا تھا کہ ثقافتوں پر گفتگو ادبیات فارسی اور اس کے نامور اہل قلم کے حوالے سے کی جائے جن کے افکار کا موضوع ثقافتوں کا سراغ اور تحقیق تھا۔

اس ضرورت کے لیے جب بزرگان ادب فارسی کے سرمائے کی چھان بین کی تو اندازہ ہوا کہ زمان، مکان اور تاریخی سیاق و سباق میں سب سے مناسب اور قابل توجہ کلام ستارۂ مشرق علامہ اقبال لاہوری کا ہے لہٰذا اقبال کے فارسی کلام اور اردو کلام کو

تر بیت سے ثقافتوں کے حوالے سے افکار اقبال کا مطالعہ کیا۔ ضروری ہے کہ ابتدا ہی میں اس نکتے کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ یہاں ثقافت سے مراد تعلیم اور ثقافت دونوں ہیں۔ ایک مجموعی احساس کے مطابق ثقافت کا مطلب کسی معاشرے کو ورثے میں ملنے والی روایات اور اس میں موجود معنوی سرمایہ ہے چنانچہ ثقافتوں پر گفتگو تہذیب اور تمدن دونوں معانی میں کارآمد ہوتی ہے اور ہم اس گفتگو کو اسی تناظر میں آگے بڑھائیں گے۔

اقبال کا دور ایک ایسا عہد ہے جس میں دنیا کے اندر بے شمار واقعات رونما ہوئے۔ اقبال کے عہد حیات یعنی انیسویں صدی کے نصف دوم اور بیسویں صدی کے نصف اول کو مدنظر رکھتے ہوئے برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ جو بتدریج مشرق بعید میں چین تک پھیل گیا، قابل ذکر واقعات میں سے ایک ہے۔ اسی طرح چین جیسی وسیع و عریض سلطنت بھی جنگ تریاق میں چینیوں کی شکست کے بعد انگریزوں کے تسلط میں آ گئی۔ سلطان عبدالحمید کا زوال، جو اتحاد بین المسلمین اور خلافت اسلامی کے محرک اور آرزومند تھے۔ اٹلی کا طرابلس پر حملہ، ایران میں مشروطہ خواہی کی تحریک، فاتح اتحادیوں کا پہلی جنگ عظیم میں ترکی پر حملہ اور شدت آمیز انتقام، روس میں انقلاب اکتوبر اور اسی قسم کے دیگر واقعات جو اس پر آشوب دور کی یاد دلاتے ہیں جس کے بعد دنیا کے نقشے پر دو بڑی طاقتیں نمودار ہوئیں اور انھوں نے پوری دنیا کو اقتصادی اعتبار سے سرمایہ داری اور کمیونزم جیسے دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

اقبال جیسی حساس شخصیت ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتی تھی، چنانچہ یہ واقعات جو بنی نوع انسان کی قسمتوں کے لیے فیصلہ کن تھے، اور بالخصوص ایسے واقعات جو براہ راست مسلمانوں کی سرنوشت سے تعلق رکھتے تھے، ان کے کلام میں پوری آب و تاب کے ساتھ منعکس ہوتے ہیں۔

اقبال ایسے واقعات سے جو مسلمان قوم میں رونما ہوئے ہیں خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں اور اپنے استاد کے ذریعے ان سے اور حتی کہ مسلمان ممالک کے فرمانرواؤں

Scanned by CamScanner

ے بھی مخاطب ہوتے ہیں تاکہ اس پرآشوب دور میں دین کی عظمت اور اسلامی ممالک کی پائیداری کی محافظت کریں۔ اقبال باوجود اس کے کہ دنیا کے مختلف علوم اور فکر ودانش سے آگاہ تھے اور انگریزی اور اردو میں نثر بھی لکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے اور اردو میں بھی ان کا کافی مقدار میں کلام موجود ہے، اپنے آپ کو جس کا پابند سمجھتے تھے وہ فارسی زبان تھی جس میں وہ اپنے ارفع خیالات کا اظہار زیادہ مناسب گردانتے تھے۔ انھوں نے اپنے بلند پایہ افکار کو فارسی زبان میں ڈھالا اور انھیں یادگار اور جاوداں بنا دیا۔ یہ ایک وسیلہ تھا جس سے وہ اپنے مخاطب لوگوں کے قلب وروح سے ارتباط پیدا کر سکتے تھے۔ انھیں ایسے لوگوں سے شکایت ہے جو انھیں محض شاعر سمجھتے ہوں۔

اقبال اپنے کلام اور بالخصوص فارسی اشعار میں مشرق ومغرب کے ضمن میں ایسے نکات بیان کرتے ہیں جو ثقافت کے بارے میں ان کے نظریات کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے مقامات سے قطع نظر اس کے معنی مراد ہیں باقی مواقع پر مغرب کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ البتہ مغرب کو کبھی مغرب، کبھی فرنگ یا افرنگ، کبھی یورپ، اور مشرق کے لیے کبھی مشرق ومغرب، کبھی خاور خاوران اور کبھی ایشیا کی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ خصوصیات جو مغرب سے وابستہ کی گئی ہیں عبارت ہیں، غرور، مستی، چالبازی، انسانی ذمہ داریوں پر عمل نہ کرنا، مادی زندگی کی نشوونما اور ایسی بیماری جس کا علاج ممکن نہیں۔ یورپ ایسا جنگجو ہے جس کے ہاتھ میں تلوار ہے لیکن وہ اسے نیام سے نکالنے سے پہلے ہی مسلمانوں کے دین کے خلاف استعمال کرتا ہے اور ان کے درمیان تفرقہ پیدا کر دیتا ہے۔ تعقل پسندی، جادوگری، فنکاری اور حقیقت سے گریز یا ہوشیاری سے دنیا میں ان کا جینا محال کر دیتا ہے، البتہ وہ خصوصیات جو اقبال نے مشرق کے لیے بیان کی ہیں، دنیا کی پرواہ کیے بغیر حق کی طرف مائل ہونا، مغرب کی تقلید، متمدن روایات کا امین ہونے کے باوجود مغرب کے دام تجدد میں پھنس کر اپنے آپ کو بھلا دینا، آوارگی، غربت، باہمی اختلاف ونفاق، معنو...

Scanned by CamScanner

ضعف سے عبارت ہیں۔

اقبال مشرق اور مغرب دونوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اور ان کی کمزوریوں پر انتقاد کے دوران اپنے نصب العین کو نہ تو مشرق میں پاتے ہیں اور نہ مغرب میں البتہ ایسی حالت میں جبکہ مغرب اپنی طاقت کے غرور میں مشرق کو جارحیت کا نشانہ بناتا ہے اور اپنی درندہ خصلتی کو انتہا تک لے جاتا ہے تو اقبال اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مشرق کو ہوشیار کریں تا کہ وہ اس جارحیت کے خلاف نبرد آزما ہو سکے۔

اقبال مشرق اور مغرب کو بالکل الگ الگ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک کثرت اور دوسرا تمت کا بیمار ہے اور یہ بیماری باعث ہوئی ہے کہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قربان ہو جائے۔ اگرچہ جو قربان کر رہا ہے وہ بھی اپنے افکار و میلانات کی پیروی کو ترک نہیں کرتا اور یقیناً وہ بھی ایک ایسے جال میں پھنس جاتا ہے جو اس نے دوسروں کے لیے پھیلایا ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ وہ ہولناک جنگ ہے جو دوسری جنگ عظیم کی صورت میں مغرب کے سامنے آئی اور مغرب اپنی بے عقلی کی جلائی ہوئی آگ پر قربان ہو گیا۔

اقبال اس اختلاف کو اپنی گہری بصیرت سے انبیا اور اہل ہدایت کی راہ سے دوری تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں انبیا نے انسانوں کی ہدایت فرمائی ہے اور انھیں ساتھ لے کر ثقافتوں کی روح کو دریافت کیا ہے لیکن جب انسان گمراہ ہو کر ہدایت الٰہی سے محروم ہو گئے تو اس کے نتیجے میں وہ نہ صرف جادہ حق سے محروم ہوئے بلکہ وہ ادھر ادھر بکھر کر خونریز جنگوں کا سبب بھی بنے ہیں۔ چنانچہ اقبال کی نظر میں انسان کو سعادت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ اپنی جبلت کی طرف راغب ہوتا ہے جو جلوۂ الٰہی کی امین ہے۔ عداوتوں کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں۔ بشری اور روحانی ماحول میں بنی نوع انسان صلح جوئی اور ہم آہنگی کی طرف راغب ہے اور انسانی ارتقاء کے مقاصد حاصل کر رہی ہے۔ شاید اب زندگی غیر انسانی اقدام کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ مختلف ثقافتوں پر گفتگو جو آج کل تمام دنیا کا پسندیدہ موضوع ہے، اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مختلف اقوام اور معاشرے

اپنے مسائل اور مشکلات کو گفت و شنید اور منطقی ذرائع سے حل کریں اور صرف اس لحاظ سے کہ ایک ملک کے وسائل دوسرے سے زیادہ ہیں۔ اپنے نظریات دوسروں پر مسلط نہ کریں، وسائل زندگی مستحق لوگوں کو فراہم کریں، تمام انسانوں کو برابر سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کا احترام کریں۔ ان کے ہتھیار بنی نوع انسان کی حفاظت اور ان کی ثقافتوں کے تحفظ کے لیے ہیں اور بنیادی طور پر ثقافتوں کی گفتگو میں یہ پہلا قدم ہونا چاہیے ورنہ مدتوں سے انسانیت درد و رنج میں مبتلا ہے اور ثقافتوں پر گفت و شنید سے محروم جس کا نتیجہ دو عالمی جنگوں کی صورت میں سامنے آچکا ہے جس میں کروڑوں انسان ہلاک اور آپس کی کئی دیگر جنگوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔

یہ سب کچھ درندگی اور حیوانیت کے علاوہ کیا ہے؟ یا اس کے سوا کیا ہے کہ انسان اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہی نسل کا خون بہائے لیکن بالآخر آپس میں مکالمے اور گفتگو کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ آج انسان اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑا انہی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ دنیا کی عظیم ثقافتوں کا مطالعہ اس بات کا شاہد ہے کہ علوم کا راستہ سنٹرل ایشیا سے یونان، وہاں سے روم اور زوال روم کے بعد اسلام کی طرف اور اسلام میں طاقت کے انحطاط کے بعد یورپ کی جانب گیا اور جب بھی یہ دھارا یورپ میں زوال آمادہ ہوا، دوبارہ اس کا رخ مشرق کی طرف ہو جائے گا۔ مصر، یونان، ایران، روم اور اسی طرح کے دوسرے ممالک کی ثقافتیں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ ثقافت کی روایت بہت پرانی ہے اور جن ممالک نے آج متمدن ہو کر مادی ترقی حاصل کی ہے وہی صرف اہل ثقافت نہیں ہیں، بلکہ ان کی موجودہ ثقافتوں کا منبع قدیم ثقافتوں میں پوشیدہ ہے۔

مختصر یہ کہ انسان نے تاریخ کے مختلف ادوار میں دنیا کے مختلف حصوں میں ثقافتوں کو جنم دیا اور اسی مناسبت سے ضروری ہے کہ تمام انسان اپنی خود گمان نسلی برتری کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اپنے آپ کو اجتماعی انسانیت کا حصہ قرار دیتے ہوئے دور حاضر کی مشکلات کو اپنے فکر و ادراک کی طاقت سے حل کریں۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ

Scanned by CamScanner

ایسا طریقہ اپنایا جائے جس میں ایک دوسرے کے کام میں بے جا مداخلت اور نئے ورلڈ آرڈر کے لیے جارحیت کی بجائے دنیا کے صاحبان عقل و بینش نیک دلی سے انسانیت کی خدمت کریں اور اسی چیز کو اقبال اپنے کلام میں انسانیت کے احترام مشرق و مغرب کے درمیان زندگی بخش مکالمے سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ مشرق و مغرب دونوں مساوی انسانی اقدار کے امین اور خالق کائنات کی مخلوق ہیں اور ایک دوسرے پر انحصار بھی کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

پادشاہ منیر بخاری

کھوار پر فارسی کا اثر

زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ بنی نوع انسان کے درمیان ابلاغ اور رابطے کا واحد ذریعہ جو اپنی ترقی یافتہ صورت میں صرف انسان سے مخصوص ہے یا پھر اس بات کو مزید صراحت کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ زبان جذبات و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا صوتی طریقہ ہے۔ دنیا میں چھ ہزار (6000) سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے چودہ زبانیں چترال میں بولی جاتی ہیں۔ پاکستان کے شمال میں واقع یہ ضلع جغرافیائی اعتبار سے ہی نہیں لسانی حوالے سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چاروں اطراف سے پہاڑوں میں گھرے اس ضلع میں، کھوار، کلاشا، یدغا، فارسی، پھلورا، گوارتی، ڈنگلی وار، وخیک وار، گوجری، پشتو، شیخی اور اردو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ ساری زبانیں مکمل زبانوں کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ کسی زبان کی بولیاں نہیں ہیں ہر زبان اپنا الگ تشخص رکھتی ہے۔ ان سب زبانوں پہ جس زبان کے سب سے زیادہ اثرات ہیں وہ زبان فارسی ہے۔ اس لیے کہ چترال کے دو اطراف کی سرحدیں جن علاقوں سے ملتی ہیں وہاں کی زبان فارسی ہے۔ جب سے یہاں لکھنے کا رواج پڑا ہے تب سے ان سب زبانوں کے بولنے والے فارسی میں لکھتے آئے ہیں چاہے زمین کی مسلیں ہوں، نکاح نامے یا وصیتیں، سب فارسی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ اب بھی پورے چترال میں نماز کی نیت فارسی میں باندھی جاتی ہے۔ آج سے ۵۰ سال پہلے لوگ ایک دوسرے کو خط بھی فارسی میں لکھا کرتے تھے۔ ہر بچہ بوستان و گلستان پڑھ کر علم کے در پر دستک دیتا اور فارسی زبان میں علوم کی تحصیل کرتا۔ دفتری زبان اور مراسلت کی زبان فارسی تھی۔ اسی دفتری اور ظاہری اثر نے یہاں کی زبانوں کو لسانی طور پر بہت متاثر کیا۔ گرامر کے قواعد، الفاظ و تراکیب کی بندش میں ان زبانوں کے اصول فارسی

Scanned by CamScanner

زبان کے اصولوں کو اپنا چکے ہیں۔

ان چودہ زبانوں میں جو زبان کشیر علاقے میں بولی جاتی ہے اسے کھوار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کھوار اس زبان کا نسبتی نام ہے جو کھو قوم بولتی ہے اور یہ قوم چترال، گلگت اور کالام (سوات) کے علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ کھوار اب ان علاقوں کی سرحدوں کو عبور کر کے اطراف و جوانب میں بھی پھیل گئی ہے۔ چنانچہ پاکستان کے ہر شہر خصوصاً پشاور و کراچی میں اس کے بولنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

گریرسن کھوار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> It is also called Chatrari a word usually pronounced Chitrali by Europeons. It is the principle language of Chitral and at that part of the Yasin called "Arinah" by the shins. From the letter word the language was called by Dr Leitner. It extends down the Chitral river as for as Drosh and is bounded on the north by the Hindukush. No dialects have been recorded. لے

کھوار بولنے والوں کی تعداد اس وقت ۴ لاکھ ۵۴ ہزار نفوس پر مشتمل ہے ۲۔ ۳ لاکھ تیرہ ہزار افراد چترال میں بستے ہیں جبکہ باقی لوگ گلگت کے ضلع غذر، کالام (سوات) کے مضافات اور پاکستان کے مختلف شہروں میں بستے ہیں جن کی مادری زبان کھوار ہے۔ Meillet (۱۹۵۲ء) نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستان میں ۱۹۵۶ افراد کھوار بولنے والے موجود تھے۔ ۳

سنسکرت کتابوں میں ان علاقوں میں آباد آریوں کو دارد (Darda) یا درادا (Darada) کا نام دیا گیا ہے۔ روسی اور یونانی مصنفین نے ہندوکش اور ہندوستان کے

Scanned by CamScanner

درمیان سارے علاقوں کو دردستانی یعنی دردلوگوں کے ملک کے نام سے منسوب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ السنہ کی تقسیم میں آج نورستان (پرانا کافرستان) سے گلگت اور استور تک بولی جانے والی تمام زبانوں کو آریائی دردخاندان کا نام دیا گیا ہے۔ ؏

چترال میں آباد شدہ قدیمی کھو آریوں کی نسل سے ہیں۔ موجودہ وقت میں کھو باشندوں کو اصلیت کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ قدیمی کھو اور بعد میں آئے ہوئے کھو۔ قدیمی کھو وہ آریہ ہیں جو تقریباً تین ہزار سال پہلے ان وادیوں میں آباد ہوئے تھے۔ آج یہ قدیمی کھو چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر مشتمل چترال کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ صدہا سالوں سے جو بھی لوگ باہر سے بحیثیت حملہ آور فاتح یا مہاجر چترال آئے انہوں نے ان قدیمی کھو باشندوں کے ساتھ اپنے غلاموں جیسا سلوک کیا۔ ان کے مال ومتاع پر قبضہ جمایا اور انہیں بکھرنے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں آئے ہوئے کھو وہ لوگ ہیں جو مختلف ادوار میں بدخشاں، واخان، روس، چینی ترکمانستان اور گلگت، یاغستان، دیر، سوات اور افغانستان کے مختلف حصوں سے آکر چترال میں آباد ہوتے رہے۔ یہ تقریباً دو سو خاندانوں پر مشتمل تھے جن میں اکثر حملہ آوروں کی حیثیت سے یا حملہ آوروں کے ساتھ ان کی مدد کرتے ہوئے چترال میں وارد ہوئے اور ان وادیوں پر قبضہ کرنے کے بعد پھر یہیں کے ہو رہے۔ ایسے بھی کئی قبیلے ہیں جو باہر سے بھاگ کر ان علاقوں میں پناہ لینے کے لیے آئے اور جنھوں نے یہاں سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے قدیم باشندوں کو اپنے زیر نگین کر کے غلام یا باج گزار بنا کے رکھ دیا۔ باہر سے آنے والے یہ لوگ دور دراز کے علاقوں سے آنے کی وجہ سے اور مختلف پس منظروں سے تعلق رکھنے کی بناء پر نہ صرف قدیمی کھوؤں سے مختلف تھے بلکہ ایک دوسرے سے بھی بہ لحاظ زبان طرز معاشرت اور رسم و رواج اختلاف رکھتے تھے۔ بعد میں آپس میں رہنے سہنے کے سبب اور ایک دوسرے سے شادی بیاہ کرنے کے باعث یہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور باوجود اس کے یہ لوگ قدیمی کھوؤں کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک روا رکھتے تھے

مگر پھر بھی ان سب کو بحیثیت مشترکہ زبان کے کھوار کو اپنانا پڑا۔ قدیمی کھوؤں کے طرز بودوباش کا بھی ان سب نے اثر لیا اور چونکہ چترال کے گردو نواح کے علاقوں کے باشندوں سے ان لوگوں کو اکثر خطرہ لاحق رہتا تھا اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر ان کے لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ متحد ہو جائیں اور اس طرح اپنی حفاظت کر سکیں۔ لہٰذا اس احساس نے ان کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں جب ان ساری وادیوں میں اسلام کی روشنی پھیلی تب ان میں یک جہتی اور یگانگت کو اور بھی تقویت ملی۔ لہٰذا آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے اور دور دراز کے علاقوں سے آنے کے باوجود یہ سینکڑوں خاندانوں پر مشتمل لوگ ایک ہو گئے ہیں اور سب اپنے آپکو ''کھو'' سمجھتے ہیں۔ سب ایک زبان کھوار بولتے ہیں اور سب نے ایک ہی قسم کی طرز بودوباش اپنائی ہے۔ کھوقوم کی زبان کھوار ''کھو'' اور ''وار'' کے الفاظ کا مرکب ہے۔ ''وار'' کا لفظ مقامی طور پر زبان کے لیے استعمال ہوتا ہے لہٰذا کھوار کے معنی کھوقوم کی زبان ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) نے اس زبان کو آرنیہ (Arniya) کا نام بھی دیا ہے۔ ۵۰

اب ہم اسی کھوار زبان پر فارسی زبان کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ زبان الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے اور الفاظ حروف سے بنتے ہیں یعنی حرف کسی بھی زبان کی اکائی ہوتا ہے۔ فارسی کے تمام حروف اپنی مکمل آوازوں کے ساتھ کھوار زبان میں موجود ہیں تاہم یہ ہے کہ کھوار کی کچھ مخصوص آوازوں کے لیے دیگر کچھ حروف وضع کیے گئے ہیں۔ کھوار نے اپنے حروف تہجی کی بنیاد فارسی حروف تہجی پر رکھی ہے۔ عربی اور فارسی حروف کو الگ کرنے کے بعد کھوار میں جتنے حروف باقی بچتے ہیں وہ خالص ہندوستانی آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

کھوار میں ان خاص آوازوں والے حروف کی موجودگی اس زبان کی دیرینہ روزی کا پتہ دیتی ہے۔ یہ آوازیں سنسکرت میں بھی نہیں حالانکہ ان آوازوں

Scanned by CamScanner

کے حامل بے شمار الفاظ ایسے ہیں کہ وہ سنسکرت میں پائے جاتے ہیں۔

جہاں تک حروف علت (ا۔و۔ی) حرکات ثلثہ۔زبر۔زیر۔پیش ( ) تنوین۔ جزم، مدوشد ( ) وغیرہ کا تعلق ہے وہ سب کے سب کھوار میں اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح فارسی میں حرکات وعلل موجود ہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''زبانوں کے لسانی مطالعے میں صوتی تغیرات اور تصرفات کا مطالعہ اور مشاہدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اکثر زبانوں کے صوتی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ صوتی مماثلات (Phonetic coresponndence) کا عمل بلا استثناء زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ ؎

اس لیے زبانوں کے تقابلی مطالعے کے لیے یہ ایک جدید سائنس ہے اور صوتی مماثلات کا قاعدہ بنیادی اور اہم لسانی اصول ہے جس کے لیے پیش نظر دونوں زبانوں یا بولیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی رشتہ، تعلق یا اثر پایا جا سکتا یا نہیں۔ گلیسن (Gleason) نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ کسی بھی زبان میں اس کے گرائمر کے پچاس فیصد اور ذخیرہ الفاظ کے دس فیصد علم سے کام چلایا جا سکتا ہے لیکن اصوات کا سو فیصد علم نہ ہو تو ایک جملہ بھی صحیح نہیں بولا جا سکتا۔ ؎

ہر زبان کا ایک صوتی نظام ہوتا ہے اور اس کے مخصوص مصوتے (Vowels) اور مصمتے (Consonants) ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی نئی اور اجنبی آواز زبان میں شامل نہیں کی جا سکتی۔ بعض اوقات دخیل الفاظ غلط استعمال اور مخرج کی وجہ سے نئی آواز کی بنیاد بن جاتے ہیں اور دیگر زبانوں کے زیر اثر نئی آواز صوتی نظام کا حصہ بن جاتی ہے۔

یوں تو زبانیں بدلتی رہتی ہیں لیکن لسانی تغیرات کا شعور زبان کے عام بولنے والوں کو نہیں ہوتا۔ جب تک اس کا مخصوص مطالعہ نہ کیا جائے۔ کھوار اور فارسی صدیوں سے ایک ماحول میں ارتقاء پذیر رہی ہیں۔ ان کے مطالعے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان

Scanned by CamScanner

دونوں زبانوں کے نظام اصوات میں بڑی یگانگت پائی جاتی ہے۔ کھوار نے اپنے ارتقائی مراحل میں فارسی کی آوازوں کو اپنایا ہے اور کچھ آوازیں مقامی طور پر جذب کر لی ہیں۔ زبان اپنا وجود اور حیثیت رکھتی ہے اور ہر زبان اپنی خصوصیات رکھتی ہے اس لیے دو زبانوں کا اشتراک مشکل سے ہی ہوتا ہے لیکن صوتیاتی تجزیہ سے کھوار اور فارسی میں کافی اشتراک پایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر فارسی کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ زبانوں کا اختلاف خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ کھوار اور فارسی میں جہاں اشتراک پایا جاتا ہے وہاں ان کے درمیان اختلاف بھی کسی حد تک ہے اور اس اختلاف کی بدولت ان دونوں کی انفرادیت قائم ہے۔ کچھ اصوات، (ث، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ح) دراصل عربی علامتیں اور حروف ہیں۔ کھوار زبان نے ان حروف کو صرف فارسی کے اثر سے قبول کیا ہے کیونکہ فارسی میں بھی یہ الفاظ دخیل ہیں جو فارسی الفاظ کھوار میں شامل ہوئے ہیں اور جن کے بغیر کھوار زبان نامکمل ہے ان کے لیے مندرجہ بالا سات حروف لازما درکار ہیں۔ فارسی کا کھوار پر اثر نہ ہوتا تو کھوار میں یہ حروف تہجی شامل نہ ہوتے ''ژ'' کا حرف تو خالص فارسی کے اثر سے ہی کھوار میں آیا ورنہ کھوار میں 'ژ' کے بجائے 'ز' مستعمل ہے لیکن فارسی کے لاتعداد حروف 'ژ' سے شروع ہوتے ہیں اور بہت سارے جو جیم سے شروع ہوتے تھے کھوار نے بعد میں ان کو ''ژ'' سے ادا کرنا شروع کیا جس کے لیے ایک مثال ہی کافی ہے۔ فارسی میں ''جان'' کو کھوار میں ''ژان'' لکھا جاتا ہے اس طرح کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

کھوار اعراب یعنی (Short vowels) زیر۔ زبر۔ پیش، فارسی کے اثر سے کھوار میں آئے اور فارسی کی طرح ان کو عام عبارتوں میں حذف بھی کیا جاتا ہے۔ فونیٹک چینج یعنی فارسی کے بہت سارے الفاظ کچھ فرق سے کھوار میں رائج ہیں۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ پیراہن کو کھوار میں پیران کہتے ہیں، گندم کو گوم، زانو کو زان، آواز کو ہواز، بالشت کو دشت، پا یعنی پاؤں کو پونگ، نو کو نوغ، غرض یہ ایک نہ ختم ہونے والی فہرست

Scanned by CamScanner

ہے۔ فارسی کے بہت سارے الفاظ جغرافیائی تبدیلی اور اعضاء صوت کے مختلف ہونے کی وجہ سے آوازوں اور حروف کی غیر محسوس تبدیلی کے ساتھ رائج ہو چکے ہیں۔ اب چترال میں رہنے والے عام لوگ ان تمام الفاظ کو کھوار کے الفاظ ہی سمجھتے ہیں جبکہ یہ سب الفاظ فارسی کے اثر سے کھوار زبان اور یہاں کے مخصوص لہجے میں داخل کر مقامی ہو گئے۔ اس مطالعے پر کئی ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

فارسی کے اثر سے مشتق الفاظ کسی حرف یا علامت کے حذف و اضافہ یا کسی سابقہ و لاحقہ کے لگانے سے بنتے ہیں۔ ترکیب کے ذریعے لفظ سازی بھی فارسی اثر کے تحت ہے بلکہ فارسی مرکبات کھوار میں کثرت سے جوں کے توں داخل ہو گئے ہیں۔ ذیل میں کچھ مرکبات پیش خدمت ہیں جو کھوار کتب و رسائل سے دوران مطالعہ جمع کیے گئے ہیں۔

(با): باوفا، باہنر، باوجود، باعزت۔

(بے): بے روزگاری، بے مثال، بیچارہ، بے وفا، بے حد، بے ہنر، بے مروت۔

(بہ): بہرحال، بدستور۔

(نا): ناقابل برداشت، ناجائز، نایاب، ناکام، ناانصافی، ناممکن۔

(غیر): غیر آباد، غیر ملکی۔

غمگین۔ تماشبین۔ شرمندہ۔ شہرت یافتہ۔ جوابدہ۔ مقرر شدہ۔ تربیت یافتہ۔ پرہیزگار۔ آبادکار۔ زبان کار۔ مالدار۔ کارخانہ دار۔ عہدیدار۔ جداجدا۔ جوق در جوق۔ روبرو۔ سال بسال۔ درجہ بدرجہ۔ وقت بوقت۔ ذمہ داری۔ خود اعتمادی۔ چارہ جوئی۔ فرش بندی۔ جرأت مندی۔ نکتہ چینی۔ منصوبہ بندی۔ نیک بختی۔ تشریف آوری۔ خوش اسلوبی۔ عزت افزائی۔ خوش قسمتی۔ رہنمائی۔ نوخیز۔ زوال پذیر۔ دل چسپ۔ خوبرو۔ خوبصورت۔ ہتھیار بند۔ رضامند۔ حیرت انگیز۔ وحشت انگیز۔ فتنہ انگیز۔ سبز پوش۔ کارآمد۔ دلفریب۔ خوشنما۔

Scanned by CamScanner

جلوہ افروز ۔ برعکس ۔ درپیش ۔ خطرناک ۔ شاندار ۔ تجربہ گاہ ۔ تجربہ کار ۔ حکمران ۔ پس منظر ۔ بعید از قیاس ۔ پرکشش ۔ پنج سالہ (پنج سالہ) ۔ خودکار ۔ پیش کش ۔ کارکن ۔ سیاست دان ۔ خیر مقدم ۔ کامیاب ۔ دلبر ۔ پرامن ۔ ہمہ تن گوش ۔ سرشار ۔ پرکیف ۔ فیض یاب ۔ سیراب ۔

امیر سے امیرانہ ۔ غریب سے غریبانہ ۔ فقیر سے فقیرانہ ۔ زن سے زنانہ ۔ شاہ سے شاہانہ ۔ مخالف سے مخالفانہ ۔ سال سے سالانہ ۔ آزاد سے آزادانہ ۔ ماہ سے ماہانہ ۔ دوست سے دوستانہ ۔

فارسی سابقوں اور لاحقوں سے مرکب کچھ اور الفاظ جو دونوں زبانوں میں زیر استعمال ہیں مندرجہ ذیل ہیں ۔

(با) ۔ باوجود، باادب، باعقل، باکمال ۔

(بے) ۔ بے ادب، بے عقل، بے سبب، بے آبرو، بے اثر، بے اختیار، بے باک ۔

(بد) ۔ بدصورت، بدنصیب، بدبو، بدخواہ، بدکار، بدزبان، بدبخت، بدگمان ۔

(نا) ۔ نافرمان، ناامید، نااہل، نابالغ، نادان، ناروا، نالائق، نامراد، نامعلوم، نایاب، ناچیز ۔

(کم) ۔ کم فہم، کم عقل، کم بخت، کمتر، کمزور، کم نصیب، کمیاب ۔

(لا) ۔ لاثانی، لاچار، لاحاصل، لاعلاج، لاوارث، لازوال، لامکان، لاولد ۔

(در) ۔ درحقیقت، دراصل ۔

(بر) ۔ برجستہ، برگشتہ، برباد، برزبان ۔

(وار) ۔ بزرگوار، تاریخ وار، ہموار، ناہموار ۔

(وند) ۔ خداوند، خاوند ۔

(سار) ۔ خاکسار، سنگسار، کوہسار ۔

(گار) ۔ پروردگار، خدمت گار، ستمگار ۔

(مند)۔ عقلمند، ہنر مند، دردمند، غیرت مند، سعادت مند۔

(آر)۔ خریدار، پرستار۔

(خود)۔ خود پسند، خود پرست، خود غرض، خود نمائی، خوددار، خود شناس، خود شناء، خودسر۔

(خوش)۔ خوشامد، خوشبو، خوشخبری، خوش دل، خوش نویس، خوش فہم۔

(سر)۔ سرانجام، سربراہ، سرپوش، سرزمین، سرفراز، سرکش، سرگرم، سرگزشت۔

(دست)۔ دستخط، دستاویز، دست اندازی، دسترس، دستکاری، دستگیر، دستیاب۔

(ہم)۔ ہم جنس، ہمدرد، ہمراز، ہمراہ، ہموطن، ہموزن، ہمدم، ہمسایہ۔

(آور)۔ بخت آور، زور آور۔

(ور)۔ مزدور، نامور، تاجور، رنجور۔

(بان)۔ دربان، نگہبان۔

(دار)۔ تاجدار، مالدار، چوب دار۔

(ناک)۔ ہیبت ناک، خوف ناک، شرمناک۔

(گین)۔ غمگین۔

(چی)۔ خزانچی، مشعلچی، بندوقچی، طبلچی۔

(ستان)۔ ہندوستان، گلستان، پاکستان، نورستان، قبرستان۔

(زار)۔ گلزار، لالہ زار، مرغزار۔

(ش)۔ آزمائش، فہمائش، خواہش۔

(ار)۔ گفتار، کردار، رفتار، دیدار۔

(گی)۔ شرمندگی، زندگی، آسودگی۔

کھوار میں بے شمار اسم فاعل فارسی کے طرز پہ بننے لگے ہیں۔

آزمودہ گار، دولت مند، مامور، نگہبان وغیرہ۔

اسم مفعول بھی فارسی کے اثر سے بننے لگے ہیں۔

گفتہ، فرمودہ، دیدہ، آزمودہ، دانستہ، محبوب، مضبوط، مشہور، محکم۔

فارسی کے زیرِ اثر اسم آلہ بھی اس طرز کے ہیں جو فارسی میں مروج ہیں۔

بادگر۔ بادزن۔

فارسی کے اثر سے اسم حالیہ بھی بنتے ہیں۔

خنداں، شاداں، شایاں۔

فارسی کے عطفی مرکبات بھی کثرت سے کھوار میں داخل ہوئے ہیں۔

مشتے نمونے از خروارے۔

شان و شوکت، در و دیوار، دل و دماغ، آب و تاب، عزت و احترام، خیر و خوبی، شور و غل، فلاح و بہبود، فہم و فراست، نشوونما، غیظ و غضب، عجیب و غریب، دار و رسن، کاروبار، ظلم و ستم، خاص و عام، آب و دانہ، نام و نشان، آمد و رفت، خرید و فروخت۔

کھوار میں فارسی کے توصیفی و اضافی مرکبات بھی بے تحاشا استعمال ہو رہے ہیں ذیل میں چند ایک درج کیے جا رہے ہیں۔

مہمانِ خصوصی، صورتِ حال، زیرِ اہتمام، ایامِ عروج، تنظیمِ نو، پایۂ تکمیل، قابلِ رحم، زیرِ تربیت، اسمائے گرامی، نقطۂ نگاہ، مناظرِ فطرت، ذوقِ سفر، قابلِ ذکر، طریقۂ تعلیم، اہلِ جنوں، حسبِ ذیل، زرِ مبادلہ، خلوصِ دل، نظرِ ثانی، نظیرِ ثانی، ذوقِ علم، مجلسِ عامہ، زیبِ گلو، پیشِ نظر۔

کھوار کے صرف اور نحو کے قواعد فارسی کے علماء نے ترتیب دیے اس لیے فارسی کا اثر کھوار گرامر پر اتنا ہے کہ گمان گزرتا ہے کہ دونوں زبانیں سگی بہنیں ہیں جبکہ لسانی حوالے سے دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہے مگر جن علماء نے کھوار کی گرامر ترتیب دی وہ فارسی کے عالم تھے، فارسی دان تھے، فارسی کے صاحب اسلوب شاعر تھے۔ انھوں نے فارسی زبان کی گرامر میں کھوار زبان کو فٹ کرنے کی کوشش کی ہے اور رفتہ رفتہ کھوار زبان نے فارسی گرامر کو

قبول کرلیا ہے لیکن جب تک کھوار کے اپنے مزاج کے مطابق گرائمر نہیں بنائی جاتی، کھوار گرائمر اور اس کے قواعد مکمل نہیں ہوں گے۔ ہاں نئی گرائمر بنانے والوں کے لیے اب فارسی سے دامن چھڑانا بہت مشکل ہوگا کہ اب وہ اصول جو فارسی زبان کے تھے وہ کھوار میں اتنے رائج ہو چکے ہیں کہ غلط ہونے کے باوجود عوام وخواص کے استعمال میں ہیں۔ انھیں بھی اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنس، عدد، حالت، حالت فاعلی، حالت مفعولی، حالت اضافی، حالت منادی، حالت مجروری، ضمیریں، اسمائے اشارات، مصدر، مشتقات اور افعال معاون، اسم فاعل، اسم مفعول، اسم حالیہ، فعل ماضی، ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی احتمالی، ماضی ناتمام (استمراری)، ماضی شرطیہ، مضارع، حال، مستقبل غرض صرفی طور پر ہر تعریف فارسی سے مستعار ہے۔ ان میں کچھ قاعدے اور اصول زبان کے کینڈے سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن بہت سارے نہیں بھی رکھتے، لیکن فارسی صدیوں تک چترال کی دفتری، مراسلتی اور ادبی زبان رہی ہے لہذا اس کا اثر اتنا ہے کہ غلط چیزیں بھی اب زیب زبان ہو گئی ہیں۔ ہاں نحوی حوالے سے دونوں زبانوں میں کافی مشابہت ہے۔

زبان کیا ہے؟ الفاظ کا انبار محض انبار نہیں کچھ اور بھی مگر یہاں اس کا ذکر غیر ضروری ہے الفاظ کے بغیر زبان کا تصور غیر ممکن ہے۔ الفاظ ہی وہ کڑیاں ہیں جن سے سلسلہ زبان کی تشکیل ہوتی ہے۔ الفاظ کے وضع واختیار میں ہر زبان کا اپنا طریق کار ہوتا ہے جو اسے دوسرے افراد سے ممتاز کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کی مختلف زبانیں اپنے انفرادی وجود سے متصف نہ ہوتیں۔ اس کے ساتھ ہی کم وبیش ہر زبان میں کچھ ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ زبانوں کا مشترک سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہ اشتراک مختلف زبانوں کے مابین کم وکیف کے اعتبار سے مختلف درجوں کا ہوتا ہے اور اس کا انحصار ان عوامل پر ہے جو لفظیاتی اشتراک و یگانگت کا باعث ہوتے ہیں۔ دو یا چند قریب قریب بسنے والی متحد الاصل یا متحد الماخذ زبانوں میں اسی نوع کا اشتراک بہت نمایاں ہوتا ہے

جبکہ دوسری قسم کی زبانوں میں بہت دھندلا اور مبہم۔ نیز اس فرق کی نسبت سے اس اشتراک کے تناسب میں بھی فرق ہوتا ہے۔ تقابلی لسانیات میں جہاں اور کئی دوسرے پہلوؤں سے دو یا زیادہ زبانوں کے الفاظ کے اشتراک و اختلاف کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہاں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے مشترک الفاظ کا جائزہ لیا جائے اور زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں ان کا تناسب معلوم کیا جائے جو ہو بہو ایک ہیں۔ گذشتہ سطور میں ہم نے الفاظ کے تقابلی مطالعے کیے ہیں مثلاً ہم نے صوتی تغیر کے ذیل میں کچھ الفاظ کا ذکر کیا جن کے معانی دونوں زبانوں میں ایک ہیں ان کی صرفی اور اشتقاقی حیثیت بھی یکساں ہے مگر صوتی تغیر کی وجہ سے صورتیں قدرے مختلف ہوگئی ہیں۔ ہم نے مفرد و مرکب الفاظ کے نمونے بھی پیش کیے وہ بھی ایک خاص زاویے سے کچھ مشترک قسم کے الفاظ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ تمام بحثیں اپنی اپنی جگہ پر اہم اور موضوع کی وضاحت کے لیے مفید ہیں لیکن دونوں زبانوں کے لفظیات میں معتد بہ حصہ ایسے مشترک الفاظ کا ہے جن میں معنا یا صورتا کوئی اختلاف نہیں اور جن سے فارسی کے کھوار زبان پر اثرات پر اچھی روشنی پڑسکتی ہے پھر بھی وہ ابھی تک مقالے میں کہیں جگہ نہ پاسکے اس قسم کے الفاظ میں کچھ الفاظ ذیل میں پیش کیے جائیں گے۔

لسان ذخیرۂ الفاظ ہی تو ہے پس اگر دونوں زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں ایک بڑا حصہ ایسے الفاظ پر مشتمل ہو جو ہر طرح ایک ہوں تو اس سے فارسی کے ان اثرات کو سمجھنے میں مدد ملے گی جو کھوار زبان پر ہیں۔ فارسی اور کھوار کی لغات میں جہاں ایسے الفاظ ہیں جو کہ ان کی انفرادیت کے ضامن ہیں، وہاں ایسے الفاظ کی بھی کمی نہیں جو کہ ان کے اتحاد و اشتراک پر شاہد ہیں، قبل اس کے کہ ایسے الفاظ کی فہرست پیش کی جائے، یہ دریافت کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اس اشتراک کا تناسب کیا ہے۔ اس کے لیے ہم چترال کے ایک مصنف عزیز احمد کی تحریر "تحریک آزادیہ صحافتو کردار" سے ابتدائی عبارت کا ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں پھر اس میں سے وہ الفاظ علیحدہ کرتے ہیں جو بعینہ فارسی میں پائے جاتے

Scanned by CamScanner

ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ کل کے مقابلے میں ان کا تناسب کیا ہے۔

"کہ دی نظریہ، مشن و اتحریک، ہر و نیہ پت رویان خوش
نو بوے کلہ پت کی رویا فتے بے مقصد و یارا معلومات نو ہوے،
وابے رویان ذہنان سا وزنگو بچے ہروش رویان ضرورت کی ہیت
اویل تان جم ہوش کوری خوروتے ہورو واضح کوروئی، ہمی روے
استاذان دی بوتی، فلسفی دی و اطالب علم دی، ہلگم سفو سارزیات
صحافیاں یا صحافتو کردار تھیچی کویاں معتی اخبار نیو شاک ہیہ سلسلہ بو
لوٹ خدمات کوریکو بوتی و اکوراوا اسوئی" ۸

اس اقتباس میں کل ۵۵ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن میں مندرجہ ذیل فارسی میں بھی ہیں ان کی تعداد ۱۷ ہے۔

نظریہ، مشن، تحریک، خوش، مقصد، معلومات، ذہین، ضرورت، واضح، استاذ، فلسفی، اطالب علم، صحافی، صحافت، اخبار، سلسلہ، خدمت۔

ان کے علاوہ کئی الفاظ ایسے بھی ہیں کہ اگرچہ انہیں ہم فارسی کا لفظ نہیں کہہ سکتے مگر اصل اور ماخذ کے لحاظ سے فارسی کے ساتھ ان کا گہرا تعلق ہے بہر حال جمع و تفریق کے اس جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مختلف الفاظ کے مقابلے میں مشترک الفاظ کا تناسب ایک تین کا ہے۔ گویا ہر تین لفظوں میں سے ایک لفظ ایسا ہے کہ دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔ ذیل کی یہ فہرست اپنی جنس کے الفاظ کو جامع و مانع نہیں بلکہ اس کی حیثیت نمونے مشتے از خروارے کی ہے۔

(الف)

آباد، آرام، آرزان، آرزو، آزاد، آزمودہ، آسان، آسمان، آشنا، آرام، افسانہ، افسوس، انجام، اندازہ، آواز، آئین۔

(ب)

بابا، باز، بازار، بازو، باورچی، بخت، برابر، برباد، برکت، بزرگ، بس، بند، بندوبست، بندہ، بیچارہ۔

(پ)

پابند، پاجامہ، پاسنگ، پرہیز، پلنگ، پائیدار، پچنگی، پرامن، پرچم، پردہ، پروانہ، پری، پریشان، پشیمان، پیغام، پیداوار۔

(ت)

تاج، تازہ، تباہ، تحفہ، تماشہ، تمغہ، تنخواہ، تنگ، توپ، تیز، تیار، تیاری۔

(ج)

جان، جدا، جائیداد، جوڑہ، جشن، جگ، جمعدار، جنازہ، جنگ، جوان، جنگل، جہاں۔

(چ)

چاک، چالاک، چالاکی، چالان، چراغاں، چست، چستی، چغلی، چلہ، چمچہ، چمن، چنار، چندہ، چٹنی، چغہ، چاپ، چاپ خانہ۔

(خ)

خاکسار، خاک، خاکی، خامی، خان، خاندان، خدا، خدائی، خربوزہ، خریدار، خزانہ، خوار، خانساماں، خودی، خوراک، خوش، خوشحالی۔

(د)

دار، داغ، دراز، درخواست، درد، درزی، دروازہ، درویش، درہ، دریا، دستخط، دستور، دشمن، دعوت، دوزخ، دوزخی، دوست، دوستی، دشمنی، دیوان۔

(ر)

راز، راہ، رخصت، رسید، رشتہ، رفتار، رگ، رنگ، رنگین، روزانہ، روزگار۔

(ز)

زبان، زبانی، زخم، زخمی، زلف، زمانہ، زمیندار، زمینداری، زنگ، زور، زیر، زیب۔

(س)

سادگی، سادہ، ساز، سازش، سالانہ، سالار، سامان، سنتری، سپاہی، سخت، سخی، سرحد، سرخی، سردار، سرکس، سرکار، سرکاری، سرمایہ، سزا، سست، سستی، سفارش، سلسلہ، سوداگر، سوداگری، سودائی، سوز، سیاست، سپاہی۔

(ش)

شاباش، شامیانہ، شاہنشاہ، شاہی، شاید، شرمندگی، شرمندہ، شکار، شکاری، شمار، شعور، شوربا، شہد، شیر، شیشہ۔

(ط)

طبیعت، طبعی، طوفانی، طولانی۔

(ع)

عالمی، عرضی، عقلمند، علیحدہ، عوامی، عورت، عہدہ، عیسائی، عینک۔

(غ)

غازی، غرارہ، غریبانہ، غلامی، غلطی، غیبی۔

(ف)

فالودہ، فرضی، فرمائش، فرمان، فریاد، فریادی، فسادی، فسانہ، فصل، فلسفہ، فوارہ، فوجی، فولاد، فہرست، فیروزہ، فیروزی۔

(ق)

(بیشتر الفاظ عربی الاصل ہیں لیکن فارسی میں ان کا استعمال عام ہے۔ اس لیے ہم انھیں اس فہرست میں بھی رکھتے ہیں)۔

قابلیت، قابو، قاعدہ، قافیہ، قالین، قانونی، قبلہ، قبضہ، قد، قدرتی، قدرت،

قرآن ، قسمت ، قصہ ، قصیدہ ، قطرہ ، قلمی ، قلندر ، قلی ، قہوہ ، قیامت ، قیدی ، قیمت ، قیمتی ، قیمہ۔

(ک)

کار ، کاروان ، کاروبار ، کارندہ ، کاریگر ، کاریگری ، کاسہ ، کاغذ ، کاغذی ، کافور ، کباب ، کبابی ، کرایہ ، کرایہ دار ، کعب ، کلف ، کلمہ ، کمائی ، کمخواب ، کمی ، کوچہ ، کوزہ ، کوشش ، کوہستان۔

(گ)

گپ ، گردن ، گردہ ، گرم ، گرم مزاج ، گز ، گلاب ، گلابی ، گلبدن ، گلزار ، گلشن ، گلہ ، گمان ، گندہ ، گند ، گنجائش ، گندگی ، گنگ ، گواہ ، گواہی ، گور ، گوشوارہ۔

(ل)

لاچار ، لازمی ، لالہ ، لطیفہ ، لعل ، لغت ، لفافہ ، لنگر ، لہجہ ، لیاقت۔

(م)

ماتم ، مادہ ، مالش ، مباحثہ ، مبارک بادی ، مجموعہ ، محاورہ ، محبت ، محبوبہ ، محتاجی ، محکمہ ، محلہ ، محنت ، محنتی ، مخالفت ، مخمل ، مخملی ، مزدوری ، مست ، مشورہ ، مضبوطی ، معاف ، معافی ، معجزہ ، معذرت ، معذوری ، منظوری ، مہربانی ، میز۔

(ن)

نادان ، ناگہانی ، نام ، نالی ، نتیجہ ، نخرا ، نذرانہ ، نرم ، نرگس ، نرمی ، نزاکت ، نشان ، نشانی ، نمائندہ ، نمونہ ، نوابی ، نوکر ، نوکری ، نیک ، نیکی۔

(و)

وارث ، ورزش ، وزیری ، وسوسہ ، وصیت ، وضو ، وظیفہ ، وعدہ ، وغیرہ ، وقف ، وکالت۔

(ہ)

ہاضمہ ، ہزار ، ہفتہ ، ہمیشہ ، ہندسہ ، ہندو ، ہنر ، ہوش ، ہوشیاری ، ہیضہ۔

Scanned by CamScanner

(ی)

یا، یاد، یادداشت، یادگار، یار، یاری، یخ، یخنی۔

فارسی کے لاتعداد محاورے اور ضرب الامثال بالکل انہی معنوں میں کھوار میں استعمال ہوتے ہیں۔ نمونے کے لیے چند ایک کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ گذشتہ را صلوات آئندہ را احتیاط	
۲۔ قطرہ قطرہ، دریا می شود	بوغدو پیچھے گیا کو تین دونے
	چوٹی چوٹی دریاچ
۳۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت	حرامو مال حراموژانہ بجائے
۴۔ چاہ کن را چاہ در پیش	کاکی خورو تین چہ کھنکانے بار جو تیرو
۵۔ خس کم جہاں پاک	کاہاک دوو دیزی کا کھو پوچ دودیری
۶۔ کند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز کبوتر با کبوتر باز بہ باز	کوزو کوزو دو موشکیر
۷۔ ہر فرعون را موسیٰ	شیر و سورا کارقوراق
۸۔ خود کردہ را علاج نیست	تان کاردو کھہ دیز
۹۔ گندم از گندم بروید جو از جو	گوم کشیکو گرم سیری کشیکو سیری
۱۰۔ پیش از اجل مرگ نیست	اجل اری پروشٹی بریک نیکی

فارسی زبان چترال میں ماوراء النہر، افغانستان اور ترکستان سے پہنچی۔ وہاں کے شہروں سے چترال والوں کے تجارتی اور دیگر مراسم تھے۔ ان ممالک کی تجارت کے لیے وادیٔ چترال ایک شاہراہ کا کام دیتی تھی۔ بہت سے خاندان اور قبیلے بھی چترال میں ایسے ہیں جو عہد قدیم میں تبدیلیٔ سکونت اور نقل مکانی کر کے ان علاقوں سے چترال آئے اور آباد ہوئے اور اپنے ساتھ فارسی زبان بھی لائے۔ آہستہ آہستہ فارسی زبان یہاں کی ... مطالعہ کیا اور یہ حقیقت واضح ہو

گئی کہ فارسی کا کھوار زبان میں بڑا عمل دخل ہے۔

فارسی زبان سرکاری زبان کی حیثیت سے چترال میں ۱۹۵۲ء تک رہی۔ چترال میں فارسی زبان کے بہت سے شعراء اور ادباء پیدا ہوئے جنھوں نے نظم اور نثر دونوں میں تصنیفات چھوڑی ہیں۔ محمد شکور غریب ان کے دو شعر درج کر رہے ہیں۔

نیست اندر دھر معلوم کہ من خود کیستم
خود نمی دانم کہ ہستم در جہاں یا نیستم
درمیان دو عدم دعوائی ہستی چون کنم
ور بگویم ہستم ایک بعالم زیستم

مولانا محمد سیر۔ سیر جنھوں نے فارسی دیوان کے ساتھ ایک شاہنامہ بھی یادگار چھوڑا ہے ان کی ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ای درد عشق راتوی درمان بیابیا
برلب رسید بے تو مرا جان بیابیا
بے آفتاب روی تو شب گشتہ روز من
ای ہمچو صبح چاک گریبان بیابیا
ہر زخم دل بیاد تو چون گل شگفتہ است
ای نازنین بسیر گلستان بیابیا
جانی تسلی تو بود کلبۂ سیر
چون زلف خود مباش پریشان بیابیا

شہزادہ تجمل شاہ محوی، معظم خان اعظم، مرزا غفران غفران، محمد ناصر الملک ناصر، حبیب اللہ فدا، اور شہزادہ عزیز الرحمٰن بیغش، ان چند صاحب دواوین شعراء میں سے ہیں جنھوں نے فارسی میں شاعری کی۔ قاضی اقرار الدین، غلام مرتضٰی اور بہت سے دوسرے نثر نگاروں نے فارسی میں اعلیٰ پائے کی نثر تخلیق کی۔ وہ زمین جہاں صدیوں تک فارسی

Scanned by CamScanner

میں ربی اعلیٰ و ارفع جذبات کا اظہار کیا جاتا رہا ہو اس زمین کی زبان اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ اس زمین نے فارسی زبان کو سر آنکھوں پہ بٹھایا اور اپنی زبان کو اس شیریں زبان سے قطرہ قطرہ امرت رس پیتے رہے۔ آج کھوار بھی اس شیریں زبان کی طرح ایک میٹھی زبان ہے اور اس کی مٹھاس میں فارسی کے شیریں رنگ، محاورات، تراکیب، الفاظ اور ضرب الامثال کا ذائقہ صاف محسوس ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1. Linguistic Survey of India. Garison G.A, vol:III, p.29, London, 1946.

۲۔ سروے رپورٹ، کھوار، مشمولہ، اردو اور کھوار کے لسانی روابط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۲۲، ۲۰۰۳ء۔

3. Towards a Socio Linguistic Profile of the Khawar Language, p. 2, (Internet).

۴۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، پروفیسر اسرار الدین، جلد ۱۴، ص ۹۱، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، س ن۔

۵۔ ایضاً

6. Composition Grammer & Vocabulary of Arniya the Language and Races of Dardestan, p. 95, London, 1964.

۷۔ ادب و لسانیات، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص ۲۳۰، سندھ اردو اکیڈمی، کراچی۔ ۷۔

۸۔ اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ص ۱۵، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۳۱ء۔

Scanned by CamScanner

عطاالرحمٰن قاضی

میؔر کا نشاطیہ لب ولہجہ

کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے بارے میں مغالطہ آمیز رائے اس قدر عام ہو جاتی ہے کہ وہ کلیشے کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر عوام تو عوام، خواص بھی اس رائے کا صبح و شام ورد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میر تقی میرؔ اردو غزل کے ان شعراء میں سرفہرست ہیں جن کے بارے میں ''شاعرِ غم'' جیسی ترکیب کی مقبولیت نے ان کی شاعری کی متنوع جہات کو ہم پر منکشف نہیں ہونے دیا۔ ''شاعرِ غم'' کی ترکیب کو اس قدر قبولِ عام حاصل ہوا کہ ان کی شاعری کے دیگر پہلو بڑی حد تک دب کر رہ گئے۔ اس مغالطے سے نکل کر ہی ہم اردو غزل کے ایک بڑے شاعر کی تفہیم کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

اگر ہم کلامِ میرؔ کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو یہ بات فوراً واضح ہو جاتی ہے کہ میرؔ کی شاعری کا اصل موضوع غم نہیں ہے بلکہ انسان، اس کے تجربات، جذبات اور محسوسات ہیں۔ ان تجربات، جذبات اور محسوسات کے پیچھے اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی نظریات کے عمل دخل سے انکار ممکن نہیں۔

ایک نارمل انسان اپنی روزمرہ زندگی میں مختلف جذبات کا اظہار کرتا ہے وہ تکلیف دہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو 'اشک شوئی' پر مجبور پاتا ہے اور جب بھی کسی خوش کن واقعے سے دوچار ہوتا ہے تو ایک سرخوشی کی لہر اس کے روئیں روئیں میں رقص کرنے لگتی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں جو انسانی کردار (عاشق کے روپ میں) دکھائی دیتا ہے ایک عام انسان ہے جو تکلیف دہ باتوں پر اگر غمگین ہوتا ہے اور خود کو کسی اندرونی تحریک کے زیرِ اثر اشک شوئی پر مجبور پاتا ہے تو مسرت زا لمحوں سے مسرت کشید کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

یہ بالکل بجا ہے کہ میرؔ کی شاعری میں غم کا عنصر بحیثیتِ مجموعی غالب ہے لیکن یہ بھی

Scanned by CamScanner

ایک حقیقت ہے کہ اگر غم کا مضمون بھی جملہ فنی خصوصیات سے ہم آہنگ ہو جائے تو وہ قاری پر خوش گوار تاثر مرتب کرتا ہے۔ میرؔ کے غم انگیز اشعار کا ایک حصہ اپنے آہنگ، تراکیب اور تشبیہات کی وجہ سے قاری کو بالعموم جاں گداز محزونی کیفیت میں مبتلا کرنے کے بجائے ایک نشاطیہ کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ میرؔ کا بنیادی لہجہ حزینہ سہی لیکن جہاں کہیں انہوں نے غم کو نشاط غم میں تبدیل کیا ہے، ایسی شاعری منظر عام پر آئی ہے جو غموں کی دھوپ سے جھلسے ہوئے لوگوں کے لیے ایسا مرہم بن جاتی ہے جو غم کی شدت میں تخفیف کا باعث بنے کے ساتھ ساتھ قاری کے دل میں ایک ہلکا سا نشاطیہ احساس ضرور پیدا کرتی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمن لکھتے ہیں کہ:

> ''المیہ کے تجربوں میں کیفیت انبساط پیدا کر کے جمالیاتی تسکین کا سامان غالباً اردو شاعری میں سب سے پہلے میرؔ صاحب ہی نے فراہم کیا ہے۔''[1]

المیہ کے تجربات میں انبساط کی کیفیت صرف اور صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب فنی و جمالیاتی تقاضوں سے روگردانی نہ کی جائے۔ چند ایک اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہر اشک مرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر
ہر لخت جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

مرے منہ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک
ہزار آفریں چشمِ خوں بار کو

گلچیں سمجھ کے چُنیو کہ گلشن میں میرؔ کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پرخوں کی اک گلابی سے

مندرجہ بالا اشعار میں درد انگیز مضامین باندھے گئے ہیں مگر لہجے میں خوش طبعی کا جو عنصر موجود ہے وہ قاری پر غم، مایوسی یا سلبی کیفیات طاری نہیں کرتا بلکہ اس کی تالیف قلب کا سامان فراہم کرتا ہے۔ گویا میرؔ انسان کے ازلی وابدی دکھ سے حلاوت کشید کرنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ المیہ کی جمالیات (Aesthetics of Tragedy) کے حامل اشعار اتنی بڑی تعداد میں اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں ہیں۔

بہت سے مابعد الطبیعاتی موضوعات کو بھی انہوں نے اس انداز میں تغزل کا لبادہ اوڑھایا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار سر دھننے لگتا ہے۔ شوخی، تحیر، سرمستی اور ڈرامائی عناصر کی بدولت بے رحم سنجیدگی انحطاط پذیر ہو گئی ہے اور متصوفانہ مضامین بڑے دلکش اسلوب میں ڈھل گئے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

کیا جانوں بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبت شراب سے آگے سفر کیا

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

دور ہی سے ہوش کھو دیتی ہے اس کی بوئے خوش
آپ میں رہیے تو اس کے پاس کی تک جایئے

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خودنما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

Scanned by CamScanner

گہ گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو
آتا نہیں نظر وہ طرح دار اک طرح

میر کے ہاں اس شاعرانہ مزاج کی تلاش تو بے سود ہے جو غالب کا خاصہ ہے البتہ رندی و شگفتہ مزاجی کے حامل اشعار میر کے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ناصح، واعظ، زاہد اور محتسب سے چھیڑ چھاڑ کا رویہ جو اردو شاعری کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے میر کے ہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

شیخ جو تھا مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا
داڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر
بگلا شکار ہووے تو لگتے ہیں ہاتھ پر

خمریات اور بہاریہ موضوع کے حامل اشعار بھی غم زدوں کے دل و دماغ میں سرخوشی کی کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ
اک جرعہ ہم دم اور پلا پھر بہار دیکھ
نکلی ہیں اب کے کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب
موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں نے دیکھے بھرے بھرے
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

Scanned by CamScanner

عہد جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے

ابر بہاری وادی سے اٹھ آبادی پر آیا ہے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہیں

پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم بادوباراں ہیں

میر کی شاعری کا ایک حصہ حسیاتی شاعری (Sensous Poetry) کے ذیل میں آتا ہے۔ حسیاتی شاعری کا اطلاق جن اشعار پر ہوتا ہے، ان کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی لکھتی ہیں کہ:

''حسیاتی شاعری کا اطلاق ان اشعار پر ہوتا ہے جن میں شاعر ایسے الفاظ اور علامتیں استعمال کرے جو براہ راست ہمارے محسوسات یا کسی احساس کو متاثر کریں اور ہم اس حسی تجربے میں شاعر کے ساتھ شریک ہو جائیں جن کا اظہار شعر میں کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ بصری بھی ہو سکتا ہے سمعی بھی، لمسیاتی بھی اور اس کا تعلق قوت شامہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ حسیاتی شاعری کی جڑیں تصور کی بجائے انسانی تجربوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس میں خارجیت ضرور ہوتی ہے مگر یک رخی خارجیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں داخلیت کا عمل بھی شامل رہتا ہے''۔ [۳]

میر کے کلام میں ایسے اشعار وافر تعداد میں موجود ہیں جو ہماری حسیات کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ ولی اردو کے وہ پہلے شاعر ہیں، جن کے ہاں حسیاتی شاعری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے مگر ولی کے ہاں خارجیت کا عنصر بہر حال داخلیت پر غالب ہے اس کے علی الرغم میر ہاں کے داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ میر جب محبوب کے جسم کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے جملہ احساسات بیدار ہو جاتے ہیں بالخصوص قوت باصرہ اور قوت لامسہ کی زود حسی نے ان کی حسیاتی شاعری میں وہ دل کشی

Scanned by CamScanner

پیدا کی ہے جو بہت کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔ اسے میرؔ کی خلاقانہ صلاحیت اور تجربے کی سچائی کہیے کہ قاری بھی ان کے حسی تجربات میں سہیم و شریک ہو جاتا ہے۔ میرؔ جب محبوب کے جسم کا ذکر کرتے ہیں تو ساکن اور متحرک تصاویر کا ایک سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلتا چلا جاتا ہے کہیں وہ حسن فطرت اور حسن محبوب کے ادغام سے ایسا منظر نامہ تشکیل دیتے ہیں جس کا سحر قاری کی بصری اور لمسی حسیات کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ میرؔ حسن محبوب کو نمایاں کرنے کے لیے جن تشبیہات کو پیش کرتے ہیں وہ اپنی رنگینی و رعنائی کی بدولت قاری کے لیے جنت نگاہ کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ میرؔ کے ہاں عشق کی تقویم میں اگرچہ فراق کے لمحات اور بے مہری معشوق کا زمانہ طویل ہے لیکن جب بھی عاشق کو وصل کے لمحات نصیب ہوتے ہیں وہ ان سے ہر ممکن طریقے سے رس کشید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ محبوب کے حسن کا قصیدہ خواں بھی نظر آتا ہے اور محبوب کی جسمانی قربت کا خواہاں بھی، اور جب اسے یہ قربت نصیب ہوتی ہے تو پھر دور دور تک غم کی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہجر جب وصال میں تبدیل ہوتا ہے تو میرؔ جسم کے لذت آمیز تجربے کو اس قدر والہانہ پن سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو سرمستی و سرشاری کی ایسی کیفیت میں پاتا ہے جس کو لفظوں میں اسیر کرنا ممکن نہیں۔

گل شرم سے بہہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرا ترا مہتاب سا

لگتی ہے ہوا رنگ سراپا سے تمہارے
معلوم نہیں ہوتے ہو گلزار میں صاحب

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

شعلوں کے ڈانک گویا لعلوں تلے دھرے ہیں
چہروں کے رنگ ہم نے دیکھے ہیں کیا جھمکتے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

آج ہمارے گھر آیا ہے کیا ہے یاں جو نثار کریں
الّا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

ہائے جوانی وصل میں اس کے کیا کیا لذت پاتے تھے
بوسہ گنج لب سے پھر بھی ذائقے اپنے بناتے تھے

مندرجہ بالا اشعار میرؔ کے مزاج اور افتادِ طبع کو سمجھنے میں بھی بہت معاونت کرتے ہیں۔ فراق زدہ، ہجر میں گھلتے رہنے والا، بد دماغی اور چڑچڑے پن کا ہمہ وقت مظاہرہ کرنے والا شخص بھلا کب حسنِ فطرت اور حسنِ محبوب سے متمتع ہو سکتا ہے۔ یہ اشعار میرؔ کی ایسی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں جو صرف رونا اور آنسو بہانا ہی نہیں جانتا بلکہ مسکرانے کے فن سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔

Scanned by CamScanner

میر کے ہاں درویشانہ لب و لہجہ بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ درویش کا دعا یہ لہجہ اس قدر رحمت آمیز ہے کہ وہ قاری کو محرومی کیفیت میں مبتلا کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہے۔ یہ اشعار ایک خاص تہذیبی تناظر کو بھی سامنے لا رہے ہیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

درویش ہیں ہم آخر دو اک نگہ کی فرصت
گوشے میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے

میر کی ظرافت کئی مقامات پر ابتذال کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیے:

کیا جو عرض کہ دل سا شکار لایا ہوں
کہا کہ ایسے تو میں مفت مار لایا ہوں

ہے گی تو دو سالہ پر پے دختر رز آفت
کیا پیر مغاں نے بھی اک چھوکری پالی ہے

ساتھ کے پڑھنے والے فارغ تحصیل علمی سے ہوئے
جہل کے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

کیا لڑکے دلّی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ
دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

شمس الرحمٰن فاروقی موخر الذکر شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
''شعر میں تھوڑی بہت ہوسناکی اور ڈھیر ساری ہے۔ لفظیات بھی

دلچسپ اور ظرافت کو معاون ہے .... ظرافت اور غزل میں کوئی تناقص نہیں ہے۔ ہمارے شعراء نے شروع سے ہی غزل کے دامن کو وسیع رکھا ہے۔ بیسویں صدی میں یہ غلط خیال عام ہوا کہ غزل میں ظریفانہ عنصر نہ ہونا چاہیے .... خوش طبعی، چھیڑ چھاڑ، مزاح یہ سب میر کے بھی پہلے سے غزل میں موجود ہیں اور یہ محض سودا یا انشاء کی صفات نہیں ہیں۔ ناسخ اور ذوق کا کلام بھی ظرافت سے مملو ہے بعد کے شعراء میں داغ کا کلام بھی نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اور خود غالب کے یہاں (جن کو عام طور پر بڑا دقیق فلسفی کہا جاتا ہے) مزاح موجود ہے۔ لہٰذا میر کے یہاں اس طرح کے اشعار میں امرد پرستی اور ہوسناکی ہی نہیں، بلکہ ظرافت اور شوخی کا بھی اظہار ہے۔ اس پر ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ غزل کا شاعر زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہوتا ہے"۔ ۳

شمس الرحمٰن کی یہ بات درست ہے کہ غزل کا شاعر زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہوتا ہے لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہر صنفِ سخن کے کچھ اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ غزل جیسی سنجیدہ شاعری میں غیر سنجیدگی کی ایک حد تک گنجائش ہے لیکن اگر غزل کا شعر تغزل سے یکسر عاری ہونے کے ساتھ ساتھ (ہلکی سی نشاطیہ کیفیت کے بجائے) پھکڑپن کا نمونہ پیش کرے تو ایسی شاعری کی حمایت کرنا کوئی مستحسن بات نہیں ہے کیونکہ پھکڑپن نشاطیہ کیفیت کے علی الرغم طبیعت میں انقباض پیدا کرتا ہے۔ میر کے مذکورہ بالا اشعار اخلاقی اور فکری وفنی اعتبار سے بھی میر کے ان اشعار کے ساتھ لگا نہیں کھاتے جو ان کو اردو کا بہت بڑا غزل گو شاعر ثابت کرتے ہیں۔ ان اشعار کی اگر کچھ اہمیت بنتی ہے تو فقط یہ کہ ان اشعار نے اردو غزل کو بے رحم سنجیدگی کے حصار سے نکالنے کی سعی کی ہے۔

Scanned by CamScanner

تکرار الفاظ کی بدولت میرؔ کے کلام میں وہ موسیقیت در آئی ہے جو ایک طرف اگر پڑھنے والے کی زبان چٹخارے بھرتی ہے تو دوسری طرف سننے والے کے لیے یہ اصوات فردوس گوش بن جاتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

جہاں تک بحور اور ان سے جنم لینے والی نفسی کیفیات کا تعلق ہے، طویل بحریں نغمگیں آہنگ کی تشکیل میں زیادہ مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ میرؔ کے ہاں طویل بحریں بالخصوص بحرِ میرؔ کا سامعہ نواز صوتی آہنگ قاری کے دل میں پُر مسرت جذباتی کیفیات کو جنم دینے کے ساتھ ساتھ، زخم خوردہ، پژمردہ اور مضمحل روح میں انبساط و اہتزاز کی لے بن کر رقص کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ غم انگیز مضمون بھی جب بحرِ میرؔ کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو قاری کا دل پُر مسرت جذبات سے مملو ہو جاتا ہے اور انبساط و اہتزاز کی زیریں لہر آہستہ آہستہ قاری پر مستولی ہو جاتی ہے۔

دور بہت بھاگو ہو ہم سے، سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی، آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

Scanned by CamScanner

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم بادو باراں ہے۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

"غم اور اس کی مختلف شیڈس ہی ان کی کل کائنات نہیں۔اس کے علی الرغم ان کے یہاں نشاطیہ کیفیت کے قوس قزحی رنگ بھی جھلکتے ہیں، میر غم فراق ہی کے شکوہ کناں نہیں، بلکہ لذت وصال کے کیف شناس بھی ہیں"۔ ۴

اب آپ خود ہی بتایئے کہ کیا میر کو شاعرِ غم قرار دے کر میر کی شخصیت اور شاعری کی بوقلمونی اور مختلف فکری وفنی ابعاد کا صحیح ادراک ممکن ہے یا نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شکیل الرحمٰن، پروفیسر، المیہ کی جمالیات، خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، ص ۴۔

۲۔ مسز افتخار بیگم صدیقی، ڈاکٹر، محسوسات کا شاعر ولی، اردو غزل مرتبہ از ڈاکٹر کامل قریشی، پروگریسو بکس، لاہور، بار اول 1989ء، ص 88۔

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد دوم، بار اول 1991ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص 177,178۔

۴۔ حامدی کاشمیری، ڈاکٹر، مقدمہ، انتخاب غزلیات میر، بار اول 2000ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص 10۔

Scanned by CamScanner

محمد کیومرثی

اردو پر فارسی زبان کے اثرات

تأثیر زبان فارسی بر زبان اردو

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیرین تر است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت
خامہ من شاخ نخل طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام

(علامہ اقبال لاہوری)

انسانی معاشرے میں زبان ایک بہت اہم رول ادا کرتی ہے جسے کبھی، کسی وقت اور کسی زمانے میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور در اصل یہی زبان قوموں کے کلچر کی محافظت بھی کرتی رہتی ہے یعنی مختلف اقوام کی ثقافت اور تہذیبیں زندہ رہنے کے لیے ایک زندہ زبان کی محتاج ہیں۔

ماہر لسانیات اکثر اس بات پر متفق ہیں کہ کسی معاشرے میں زبان مرنے اور مٹ جانے کے بعد کلچر اور ثقافت بھی خود بخود مر کر تباہ ہو جاتی ہے۔ تاریخی پس منظر دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ایران اور برصغیر کے سماجی، معاشرتی اور تہذیبی تعلقات بہت پرانے اور دور کی بات ہیں یہاں تک کہ آریاؤں کے تمدن اور ان کی حکومت سے بھی پہلے یہ تعلقات اور روابط قائم رہے ہیں۔ وادی سندھ یا سندھ اور موہنجوداڑو میں جو آثار و شواہد پائے جاتے ہیں وہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان دونوں قوموں ...

پہلے ہی سے بہت سی مشابہتیں موجود ہیں۔

ایران اور وادی سندھ یا موجودہ پاکستان کے مشترک تعلقات خاص طور پر سیاسی، تہذیبی سطح پر یہ روابط ماقبل تاریخ کے دوران تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ بھی اس بات پر شاہد ہے کہ پیشدادیان اور ہخامنشیان جو ایران کی پہلی حکومتوں کی حیثیت سے ظاہر ہو گئیں تو اسی زمانے سے ان دونوں ممالک میں آنا جانا اور آمد و شد شروع ہو گیا۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد کا مسئلہ ایک اہم موضوع خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں اسلامی دوران کے آغاز ہونے کے ساتھ ساتھ ان دونوں ممالک کے تعلقات اور بھی بڑھتے اور اس سرزمین کی تاریخ، کلچر اور لوگوں کی رسومات پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے گئے۔ دوسری طرف سے فارسی زبان و ادب نے اس خطے میں اتنی ترقی کر لی کہ قریباً آٹھ سو سال تک یہ زبان برصغیر کی سرکاری زبان قرار پائی۔ فارسی زبان و ادب نے برصغیر کی مقامی بولیوں پر بھی گہرے اثرات چھوڑ دیے اور نہایتاً انہی تبدیلیوں کے نتیجے میں اردو زبان معرض وجود میں آئی۔

ماہر لسانیات اردو زبان کا تعلق ہند آریائی زبانوں کے خاندان سے بتاتے ہیں اور اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ قدیم اردو کا آغاز برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور مقامی باشندوں کے میل جول سے ہوا۔

سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کے ساتھ برصغیر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس نے لاہور کو منتخب کر کے اس میں اپنا نائب مقرر کر دیا اور اس کے بعد زیادہ تعداد میں علماء اور صوفیاء نے یہاں آ کر تبلیغ دین کے مراکز قائم کر لیے جس کے نتیجے میں مقامی لوگ اور باشندے بہت بڑی سطح پر اسلام قبول کرنے لگے۔ اس سماجی انقلاب کا اثر یہاں کی زبان پر بھی پڑا یعنی انہوں نے اشاعت دین کے لیے یہاں کی زبان کو اختیار کیا اور اس طرح غزنوی عہد میں مسلمانوں کی اپنی زبان، فارسی، عربی اور ترکی کے ساتھ ساتھ ایک ہندوی زبان کے خدوخال بھی نکھرنے لگے۔[1]

Scanned by CamScanner

غزنویوں کے حملوں کے نتیجے میں فارسی زبان وادب نے بڑی تیزی سے برصغیر میں رشد ونمو پا کر ترقی کی منازل طے کر لیں اور بہت سی کتابیں اور مضامین فارسی سے ہندی یا اردو میں اور اردو سے فارسی ترجمے کیے گئے۔ [۲]

البتہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ فارسی زبان اپنی صلاحیتوں اور اپنے اندر تہذیبی ،علمی اور ادبی رونق کی بدولت ہمیشہ آفاقی محافل کے ادیبوں، دانشوروں اور عالموں کی توجہ کے تحت رہی ہے۔اب بھی چند صدیوں کے گزرنے کے باوجود فارسی زبان وادب کے چراغ کی روشنی اس خطے میں چمک رہی ہے۔ فارسی زبان وادب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں کے درمیان بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس کی مقبولیت بہت زیادہ ہے۔ [۳]

فارسی اور اردو کے اشتراکات بہت زیادہ ہیں اور فارسی زبان نے نہ صرف اردو پر بلکہ پاکستان کی دوسری زبانوں پر بھی گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ برصغیر اور پاکستان کی پہلی زبان جو فارسی سے زیادہ متاثر ہوئی اور اس میں بہت سی تبدیلیاں آئیں، پنجابی زبان تھی۔ پنجابی نے فارسی کے ساتھ سیدھے تعلقات قائم کر لیے، فارسی زبان اور پنجابی کی آمیزش سے ایک ایسا خمیر مایہ تیار ہوا جس سے دہلی پہنچ کر اردو زبان وجود میں آئی۔ اس سلسلے میں ملا وجہی دکنی کی کتاب (سب رس) میں اس آمیزش کے نمونے بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جب پنجاب پر فارسی زبان کے اثرات پڑے تو پنجابی زبان کے پرانے سے پرانے کلاسیکل شعر بھی ان اثرات سے نہ بچ سکے۔ یہ سب انھی اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم پنجابی زبان میں بے شمار فارسی الفاظ موجود پاتے ہیں اور خاص بات یہ کہ ان کی بیگانگی کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ [۴]

حافظ محمود خان شیرانی اور دیگر ماہر لسانیات کی اکثریت اس بات پر اتفاق کرتی ہے کہ قدیم اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندی یا ہندوی کہا جاتا رہا ہے۔ امیر خسرو نے بھی اسی زبان کو ''ہندوی'' کہا ہے اور اس سلسلے میں قدیم صوفیائے کرام کے اقوال اور

تحریریں بھی اس بات کا ثبوت ہیں۔ اردو دراصل ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب لشکر یا چھاؤنی ہے۔ شیرانی صاحب نے اپنی تحقیقات کی بنا، پر لکھا ہے کہ یہ لفظ ترکی زبان میں مختلف شکلوں میں مستعمل ہے اور یہ لفظ مختلف المعانی بھی ہے جسے فرودگاہ، لشکر، پڑاؤ اور کچھ حصہ لشکر کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔ لفظ اردو کا استعمال سب سے پہلے ''تزک بابری'' میں شہنشاہ بابر نے کیا ہے۔ 5

اردو زبان معرض وجود میں آتے ہی ترقی کرتی رہی اور اس کی ابتدائی شکل میں فارسی الفاظ و اصطلاحات کمتر دکھائی دیتے ہیں اور ہندی یا ہندوی زبان اس پر مسلط تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے اثرات مزید ہو کر نمایاں ہو گئے اور اکثر ادیب، دانشور اور عالم لوگ اپنی مہارت اور برتری دکھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ فارسی زبان کے الفاظ و اصطلاحات کو منتخب کر کے استعمال کرنے لگے۔

ملمع نویسی کی صنعت جس طرح فارسی میں رائج تھی اسے اسی طرح اردو میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ ان میں فرق یہ تھا کہ فارسی میں استعمال کرتے وقت ایک مصرع فارسی میں استعمال کرتے تھے اور دوسرا مصرع عربی میں تھا لیکن اردو میں ایک مصرع اردو اور دوسرا مصرع فارسی میں تھا۔ مثال اور نمونے کے طور پر:

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق، ترا چشمی عطا کر دست غافل در نگر

(اقبال لاہوری)

اور کبھی کبھی اردو زبان میں فارسی الفاظ اتنی بڑی حد تک استعمال کیے گئے کہ گویا فارسی ہی زبان ہے۔ مثال کے طور پر:

نہیں منت کش تاب شنیدن داستان میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زبان میری

(اقبال لاہوری)

Scanned by CamScanner

اردو زبان کی تشکیل میں فارسی زبان کے اثرات اتنے زیادہ ہو گئے کہ آگے چل کر جب پاکستان کا ملک دنیا کے نقشے پر ابھرنے والا تھا اور اس کے لیے ایک قومی ترانے کی ضرورت پڑی تو پاکستانی معاصر شعراء میں سے ایک شاعر پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے لگے۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ سارے الفاظ فارسی میں ہیں اور اردو زبان کا ایک لفظ بھی سوائے ایک اضافت ''کا'' پایا نہیں جاتا۔ ۶

اردو شعراء نے مختلف شکلوں اور صورتوں میں فارسی شاعری کی پیروی کی ہے مثال کے طور پر اردو میں ''واسوخت'' کے عنوان سے شعر کی ایک قسم موجود ہے جو کہا جاتا ہے کہ وحشی بافقی نے اس کو ایجاد کر کے بنایا ہے۔ اور اردو شعراء نے خصوصاً میرزا محمد رفیع سودا نے اس کو استعمال کر کے اس صنعت سے تقلید کی ہے۔ مرثیہ بھی فارسی کی ایک شعری صنعت محسوب ہوتی ہے جسے اردو زبان کے شعراء اس میں کچھ تبدیلیاں لا کر اس کی تقلید کرنے لگے ہیں۔

فارسی کنایے اور فارسی ضرب الامثال، فارسی نظم و نثر اور فارسی زبان کا گرامر حتیٰ کہ فارسی رائٹنگ کا طور طریقہ اردو میں استعمال ہو کر دیکھے جاتے ہیں۔ ۷

اردو شاعری قافیے کی صنعت میں بھی فارسی قوافی کی پیروی کرتی رہی ہے۔ اردو شعر کے اکثر مضامین یا فارسی مضامین سے لیے گئے ہیں یا کہ وہی فارسی مضامین و موضوعات کو استعمال کیا گیا ہے۔ کمال خان رستمی، ملا وجہی، غواصی، ملک خشنود اردو کے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے زیادہ تر فارسی داستانوں اور کہانیوں کے موضوعات اختیار کر لیے تھے۔

مشہور ماہر لسانیات شمس العلماء محمد حسین آزاد فارسی زبان کے اثرات اردو پر کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ''اردو زبان کا پودا سنسکرت کی زمین سے اگ کر فارسی زبان کی آب و ہوا میں رشد و نمو کر کے پالا گیا ہے''۔ ۸

فارسی الفاظ کی بڑی تعداد جو فارسی اور اردو میں ایک ہی شکل اور معنی میں

استعمال ہوتے ہیں میں ایسے کلمات و الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ فارسی زبان کے ہر لفظ کو اردو میں استعمال کر سکتے ہیں۔

ادبی زاویے سے اگر دیکھا جائے تو فارسی زبان کے زیادہ تر الفاظ، کلمات اور جملے اردو میں استعمال ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی ادبی سطح پر اردو عینا فارسی میں بدل جاتی ہے اور سارے کلمات اور الفاظ فارسی میں کہے جاتے ہیں۔

اردو میں بعض ایسے مصادر اور افعال موجود ہیں جو ڈائریکٹ فارسی مصادر، افعال اور کلمات سے بنائے گئے ہیں اور دراصل دونوں کی جڑ میں کافی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔

درج ذیل میں کچھ نمونے لائے گئے ہیں:

پختن : پکانا　　آمدن : آنا　　دادن : دینا　　کردن : کرنا

فرمودن : فرمانا　　شرم کردن : شرمانا　　تراشیدن : تراشنا　　رنگ کردن : رنگنا

کچہ زدن : چچھانا　　چشیدن : چکھانا　　پروراندن : پالنا　　چاپ شدن : چھپنا

اردو زبان میں کچھ ایسی اصطلاحات اور تراکیب موجود ہیں جن کا ایک یا دو حصے فارسی میں ہیں اور باقی اجزاء اردو ہیں۔ ایسی تراکیب کی تعداد بہت زیادہ ہیں۔ درج ذیل چند نمونے لائے گئے ہیں:

آب آب ہونا : شرمندہ شدن　　آب آجانا : جلاء و صیقل شدن

آرام کرنا : استراحت کردن　　آرزو حاصل ہونا : مراد یا آرزو حاصل شدن

بہت سی فارسی ضرب الامثال اور محاورات اردو میں پائے جاتے ہیں جو عینا فارسی ہیں اور

Scanned by CamScanner

اردو میں استعمال ہو جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ ایسی ضرب الامثال بھی اردو میں موجود ہیں جن کے مفہوم اور معنی ایک ہی ہیں لیکن مختلف اور متفاوت کلمات سے استعمال کی جاتی ہیں اور ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہیں۔ درج ذیل میں کچھ نمونے موجود ہیں:

قدر نعمت بعد زوال: پس از زوال قدر نعمت دانستہ می شود

دیر آئے درست آئے: دیر آید درست آید

مسلمانی آبادانی: مسلمانی آبادانی

نادان دوست سے دانا دشمن بھلے: دشمن دانا بہ از دوست نادان

ایک انار سو بیمار: یک انار و صد بیمار

نیکی اور پوچھ پوچھ: نیکی و پرسش

عقلمند کو اشارہ کافی ہے: عاقل را یک اشارہ بس باشد

نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایمان: نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایمان

قول مردان جان دارد: قول مرد قول است

یار زندہ صحبت باقی: یار زندہ صحبت باقی

نوکر بر طرف روزی ہر طرف: روزی دہندہ خداوند است، رزاق خداوند است

مال مفت دل بی رحم: مال مفت دل بی رحم

ان ضرب الامثال کے علاوہ بہت سے فارسی محاوروں، ترکیبوں اور اصطلاحوں کے بھی فارسی سے اردو میں ترجمے کر لیے گئے ہیں۔ جو اردو شعرا نے بھی اپنے شعروں میں استعمال کر لیے ہیں۔ درج ذیل کچھ مثالیں موجود ہیں:

(برآمدن سے برآنا)

Scanned by CamScanner

عہد سے اس صنم کے بر آیا نہ جائے گا
یہ ناز ہے تو ہم سے اٹھایا نہ جائے گا

(قائم)

(بر آمدن سے بر آنا)

کس کی یہ طاقت ہے کہ اس سے بر آئے
وہ زلف سیاہ اپنی اگر لہر پہ آئے

(سودا)

(خو کردن سے خو کرنا)

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
بندگی سے جس نے خو کی ہو خدائی کیا کرے

(یقین)

ان تراکیب اور اصطلاحوں کے علاوہ نئی اصناف سخن اردو کی شاعری میں داخل کی گئیں، مرثیے اور مسدس کا رواج بھی اردو زبان میں ہو گیا۔ بہت سی فارسی تشبیہیں اور استعارے اردو میں منتقل کر لیے گئے۔ درج ذیل کچھ اشعار میں خوبصورت مثالیں موجود ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

(میر)

روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

(درد)

اردو شعر کے حوالے سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ فارسی کی لفظی صنعتوں سے بے حد

متاثر ہے اور فارسی زبان کی اکثر لفظی صنایع اردو میں بھی استعمال ہو جاتی ہیں اور اردو میں عروضی اوزان بھی وہی فارسی اوزان ہیں۔ 9

لفظی صنعتیں جو فارسی سے آکر اردو میں استعمال ہو جاتی ہیں، یہ ہیں:

تسجیع کی صنعت : متوازی سجع، مطرف سجع اور متوازن سجع

سجع متوازی کی مثال ملاحظہ ہو:

جس کوچہ و بازار میں جاتی وہاں اسباب عیش مہیا پاتی، سبزے کی مہک، بجلی کی چمک، بادل کی کڑک ایک عالم دکھاتی ہے۔ (آرائش محفل، میر شیر علی افسوس)

جناس کی صنعت، من جملے جناس تام جناس ناقص، جناس زاید و، جناس مرکب اور جناس خط اردو میں استعمال کی جاتی ہیں۔

رد العجز الی الصدر کی صنعت جسے مطابقہ کی صنعت بھی کہا جاتا ہے اردو میں استعمال ہو جاتی ہے۔ اعنات کی صنعت، تضاد کی صنعت، مراعات النظیر کی صنعت، لف و نشر کی صنعت، یہ سب اردو میں فارسی زبان سے آکر موجود ہیں۔ معنوی صنعتوں کے سلسلے میں بھی فارسی کی ساری معنوی صنایع اردو میں استعمال کی جاتی ہیں۔ تشبیہ، استعارہ، تجاہل عارفانہ، حسن تعلیل، تلمیح، ایہام، اغراق، تمثیل یہ ساری صنعتیں جو فارسی سے آکر اردو میں موجود ہیں۔

بہر حال یہ پاکستان اور پاکستانیوں کی اپنی بات ہے کہ فارسی زبان دراصل اردو زبان کی ماں کی حیثیت رکھتی ہے اور انہوں نے اردو کو دختر زیبائے فارسی کے نام سے پکارا ہے وہ سب بھی اس بات پر معتقد ہیں کہ عربی الفاظ جو اردو میں استعمال ہو جاتے ہیں وہ بھی فارسی زبان کے ذریعے سے اردو میں داخل ہو کر منتقل ہو گئے ہیں اور ڈائریکٹ عربی سے نہیں آئے۔ حالانکہ ڈاکٹر شاہد چوہدری کا کہنا ہے کہ محمد بن قاسم عرب سپہ سالار جس نے برصغیر پر پہلی دفعہ کے لیے حملہ کیا اس کی افواج کے سپاہی بھی ایرانی تھے اور شہر شیراز سے تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر شبلی صدیق فرماتے ہیں کہ'' یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ مقبولیت و پذیرائی انہی شعراء کے حصے میں آئی جنہوں نے فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا خصوصاً مرزا غالب کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اگر اس کے بعض اشعار سے افعال ناقصہ نکال دیے جائیں یا حروف جار بدل دیے جائیں تو وہ مکمل طور پر فارسی شعر بن جائیں گے''۔۱۰

❁❁❁

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر علی انور

ذکرِ الٰہی کا مقصود
عملی اور روحانی زندگی میں انقلاب

ذکر کے لغوی معنی:

ذکر عربی زبان میں ''ذَکَرَ'' ''یَذْکُرُ'' کا مصدر ہے۔ اس کے لغوی معنی بھولی ہوئی چیز کی یاد تازہ کرنا۔

یاد کرنا

یاد رکھنا

قول و بیان

قول یاد رکھنا یا یاد کرنا

کسی چیز کو بار بار ذہن میں لانا[1]

ذکر کا اصطلاحی مفہوم:

دینی اصطلاح میں ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔
ذکر کی ضد ''غفلت'' ہے گویا ذکر عدم غفلت کا نام ہے۔[2]
لفظ ''ذکر'' قرآن مجید میں مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً

۱۔ نماز کے لیے واذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا

۱۔ اسلامی تمدن و تاریخ، ڈاکٹر حافظ محمود اختر، ص ۲۵

۲۔ اسلامی دستور حیات، غلام احمد حریری، ص ۳۹

الی ذکر اللہ ۔[۱]

۲۔ نصیحت کے لیے ان ھو الا ذکر و قرآن مبین ۔[۲]

۳۔ قرآن کریم کے لیے انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون۔[۳]

۴۔ یاد کرنے کے لیے فستذکرون ما اقول لکم و افوض امری الی اللہ ۔[۴]

۵۔ یاد الٰہی کے لیے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ۔[۵]

مذکورہ بالا ذکر کے قرآنی مفہوم پر غور کرنے سے یہ حقیقت عیاں اور کلیۃً ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں جہاں پر بھی "ذکر" کا بیان ہوا ہے ہر موقع پر اس میں ایک مشترک معنی اور مفہوم پنہاں ہے اور وہ معنی یاد الٰہی اور ذکر خداوندی کے ہیں۔

ابتداء میں ذکر خداوندی فریضہ سمجھ کر کیا جاتا ہے مگر آدمی اس پر کاربند رہے اور باقاعدگی سے ادا کرتا رہے تو یہ اس کی طبیعت میں راسخ ہو جاتا ہے پھر وہ اگر زبان سے ذکر نہ بھی کرے تو اس کا دل نور الٰہی سے معمور رہتا ہے۔[۶]

امام غزالی نے ذکر کے چار درجات بیان کیے ہیں:

۱۔ صرف زبان سے ذکر کرنا۔

۲۔ دل پر جبر کر کے اسے ذکر کا خوگر بنانا۔

۳۔ دل ذکر خداوندی میں اس حد تک مشغول ہو جائے کہ بلا تکلف زبان پر جاری رہے۔

۴۔ دل ذکر الٰہی میں اس حد تک مشغول ہو جائے کہ اپنے آپ کی خبر نہ

۱۔ القرآن، ۹:۶۲

۲۔ القرآن، ۶۹:۳۶

۳۔ القرآن، ۹:۱۵

۴۔ القرآن، ۴۴:۴۰

۵۔ القرآن، ۲۸:۱۳

۶۔ مکاشفۃ القلوب (ابو حامد محمد الغزالی) مترجم قاری محمد عطاء اللہ، ص ۳۰۱۔

Scanned by CamScanner

رہے۔ صوفیا کے نزدیک اس اصطلاح کا نام "استغراق" ہے اور یہی ذکر کا (چوتھا درجہ) جو درجہ اصل میں مطلوب و مقصود ہے، پہلے تین درجے اس کے لیے مقدمہ یا تمہید کا کام دیتے ہیں۔ [1]

انسان ہمیشہ اسی چیز کو یاد کرتا ہے جس کے ساتھ اس کا گہرا لگاؤ مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر ہوسکتا ہے۔ یہ وجوہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ ایک مومن کامل کی دلی محبت اور مخلصانہ الفت صرف ذات باری تعالیٰ سے ہوسکتی ہے۔ اس بات کی شہادت قرآن کریم سے بھی ملتی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

والذین آمنوا أشد حبا للہ [2]

ترجمہ: اور جو مومن ہیں وہ دلی لگاؤ سب سے زیادہ اللہ کے ساتھ رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کا اعلان فرمایا کہ مومن کو سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ صاحب تفسیر ثنائی لکھتے ہیں کہ جو مومن ہیں وہ دلی لگاؤ اور قلبی خلوص سب زیادہ اللہ کے ساتھ رکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کمال دور اندیشی سے جانتے ہیں کہ ہمارا جس قدر تعلق خدا کے ساتھ ہے اتنا کسی اور سے نہیں۔ ہماری عزت، ذلت، غربت، امارت سب اسی کے قبضہ میں ہے۔ [3]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ متقین کی صفات کا ذکر بھی فرماتا ہے کہ وہ اس ذکر الٰہی کی وجہ سے متقین اور مومنین کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

۱۔ نسخہ کیمیا یعنی کیمیائے سعادت، مصنف امام غزالی، اردو ترجمہ از پروفیسر مجید یزدانی، ص ۲۹۹۔

۲۔ القرآن، ۲:۱۶۵

۳۔ قرآن حکیم مترجم مع تفسیر ثنائی مکمل (ثناء اللہ امرتسری)، ص ۳۸ (حاشیہ)

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وّ علیٰ جنوبھم [1]

مومن وہ ہیں جو کھڑے ہوئے، بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں خدا کو یاد کرتے ہیں گویا کہ مومنین ہر وقت اور ہر حالت میں ذکر الٰہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لیتے ہیں اور اس حقیقت کا ذکر مولانا ابو الکلام آزاد اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''وہ ارباب دانش جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں (لیکن ہر حال میں اللہ کی یاد ان کے اندر بسی ہوتی ہے''۔ [2]

اور آگے چل کر فرماتے ہیں کہ حق کی معرفت و استقامت کا سرچشمہ اللہ کا ذکر اور کائنات کی خلقت میں تفکر ہے۔ [3]

مومنین جب ذکر الٰہی کی کثرت کرتے ہیں تو وہ قربت الٰہی کے حصول کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں اور یہ ایک جذبات و محبت پر مشتمل تحریک بن جاتی ہے۔ یہ محبت کی تحریک دونوں طرف سے ہی ہوتی ہے جب بندہ اپنے باری تعالیٰ کو ہر حالت میں اور ہر وقت یاد کرتا ہے۔ اس کے ذکر میں ہمہ تن محو ہو جاتا ہے۔ جب اس محبت میں یکسو ہو جاتا ہے تو دوسری جانب اللہ تعالیٰ بھی ایسے اپنے محبوب بندوں کو بھی یاد کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فاذ کرونی أذکرکم [4]

ترجمہ: ''پس مجھے یاد کرو کہ میں تم کو یاد کروں گا''

۱۔ القرآن، ۳: ۱۹۱

۲۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد، ج ۲، ص ۲۱۳

۳۔ ایضاً

۴۔ القرآن، ۲: ۱۵۲

Scanned by CamScanner

''صاحب تدبر قرآن'' اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو منافقین اور مفسدین کی محاذ آرائی کے مقابل میں ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور اس کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ان اشرار کے غوغا سے بے پروا ہو کر تم زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔[1]

اگر ہم حضور ﷺ کی سیرت کا اس آیت کی روشنی میں جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ بھی ذکر الٰہی کثرت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کی روایت سے آپ کی ایک حدیث ہے کہ:

عن عائشة قالت:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يذكر الله

على كل أحيانه [2]

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، رسول اللہ ﷺ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے''۔ آپ ﷺ رات کو اس قدر، ذکر الٰہی اور عبادت الٰہی میں مشغول رہتے کہ آپ ﷺ کے پاؤں سوجھ جایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے تو ایک دفعہ عرض کر دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ''کیا آپ کو بھی اتنی عبادت کی ضرورت ہے'' تو آپؐ نے فرمایا ''کیا میں اللہ کی یاد سے غافل ہو جاؤں؟'' آپؐ نے فرمایا کہ یاد الٰہی تو بہت بڑی چیز ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولذكر الله أكبر [3]

ا۔ [الصحیح]

۲۔ الجامع الصحیح البخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری، ج ۱، ص ۸۸

۳۔ القرآن، ۸ : ۴۵

Scanned by CamScanner

ترجمہ: یادِ الٰہی بہت بڑی چیز ہے۔

صاحب تفسیر "تفہیم القرآن" اس آیت کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کا ایک مطلب اللہ کی یاد بجائے خود بہت بڑی چیز ہے۔ خیر الاعمال ہے۔ انسان کا کوئی عمل اس سے افضل نہیں ہے بلکہ ذکر الٰہی کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے کہ برائیوں سے روکے بلکہ اس سے بڑھ کر وہ نیکیوں پر ابھارنے والی اور سبقت الی الخیرات پر آمادہ کرنے والی چیز بھی ہے۔[1] بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب جنگ کا میدان ہو، جہاں جان کے لالے پڑے ہوتے ہیں اور میدان جنگ میں ایک خوف اور لرزہ طاری ہوتا ہے تو حکم دیا گیا کہ ذکر الٰہی کیا کرو۔

قرآن میں ارشاد خداوندی ہے:

یاایہا الذین آمنوا اذا لقیتم فئۃً فاثبتوا واذکروا اللہ کثیراً[2]

ترجمہ: اے ایمان والو جب تمہارا مقابلہ کسی فوج سے ہو جائے تو تم جم جاؤ اور اللہ کو خوب یاد کرو۔

ذکر الٰہی کی کثرت کرنے کے لیے آپ ﷺ کی سیرت اور ارشادات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ذکر خدا سے ہر وقت زبان کو تر رکھنا ہی مومن کی خصوصیات میں سے ہے اور آپ کی سیرت طیبہ کا یہی درس اول بھی ہے۔

حدیث نبویؐ ہے:

عن عبداللہ بن بسر ان رجلاً قال یا رسول اللہ ان شرائع الاسلام قد کثرت علی فاخبرنی بشئی

۱۔ تفہیم القرآن، ابوالاعلیٰ مودودی، ج ۳، ص ۷۰۷۔

۲۔ القرآن، ۸: ۴۵۔

أتشبث به قال "لا يزال لسانك رطبا من ذكر الله" ۱؎

ترجمہ: عبداللہ بن بسر فرماتے ہیں، ایک شخص نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اسلام کے احکام کی مجھ پر کثرت ہو چکی ہے لہذا آپ مجھے کوئی (آسان سی) چیز بتا دیں جس پر میں عمل کرتا رہوں۔ آپؐ نے فرمایا "تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے"۔ ۲؎

دوسری حدیث میں آپؐ نے ذکر کے ثمرات بیان کرتے ہوئے فرمایا:
حدیث نبویؐ ہے:

عن الاعرابی مسلم انه شهد علی أبی هريرة و أبی سعيد الخدری انهما شهد علی رسول الله صلی الله عليه وسلم انه قال "ما من قوم يذكرون الله الا حفت بهم الملائكة و غشيتهم الرحمة و نزلت عليهم السكينة و ذكرهم الله فيمن عنده" ۳؎

ترجمہ: اعرابی مسلم فرماتے ہیں کہ وہ حضرت ابوھریرہ اور ابو سعید خدری کے پاس حاضر ہوا (ان دونوں نے فرمایا) کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ آپؐ نے فرمایا "جو قوم اللہ کا ذکر کرتی ہے فرشتے انہیں اپنے گھیرے میں لے

۱۔ صحیح سنن الترمذی، ابو عیسیٰ ترمذی، مترجم ابوالحسن محمد یحییٰ گوندلوی، ص ۵۳۔
۲۔ ابن ماجہ، امام محمد بن یزید ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل الذکر، ص ۷۷۔
۳۔ مسلم، مسلم بن حجاج القشیری، کتاب الذکر والدعا، ص ۳۳۵، ج ۲۔

بیٹھتے ہیں اور رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر سکونت نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ (بطور فخر) ان کا تذکرہ اپنے فرشتوں سے کرتا ہے جو اس کے پاس ہوتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر ذکر کی دو بڑی اقسام بیان کرتے ہیں۔

ا) ذکر قلبی: اس سے مراد وہ ذکر ہے جو صرف دل میں ہو اور زبان پر الفاظ نہ ہوں یہ ذکر بالکل مخفی ہوتا ہے اس لیے اسے ذکر خفی بھی کہتے ہیں۔ اس کی بنیادی شرط اللہ کی طرف توجہ ہے۔ [1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

واذكر ربك في نفسك تضرعاً و خيفة و دون الجهر من القول بالغدو والاصال ولا تكن من الغفلين۔ [2]

ترجمہ: اور یاد کرو اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی چلائے بغیر (یوں یاد کرو) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی اور نہ ہو جاؤ (یادِ الٰہی سے) غافل رہنے والوں سے۔

صاحب تفسیر ضیاء القرآن اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"دل کے آئینے سے غفلت کا غبار اور روح کے رخ تاباں سے نافرمانی کے داغ دھونے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی صبحیں اور شامیں یادِ الٰہی میں بسر کرے، ذکر تب اپنا پورا اثر دکھاتا ہے جب ذکر کے دوران انسان عاجزی اور انکساری کا مجسمہ

ا۔ اسلامی تمدن و تاریخ، پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر، ص ۳۹۔

۲۔ القرآن، ۷: ۲۰۵۔

Scanned by CamScanner

بنا ہوا ہو۔

ii) اسے اس بات کا ہر وقت شدید احساس ہو کہ اس کے اعمال اور اس کا ذکر اس بارگاہِ رفعت وجلال کے شایانِ شان نہیں۔

iii) ذکر گلا پھاڑ پھاڑ کر نہ کرے جس میں بے ادبی کا شائبہ ہو بلکہ درمیانی آواز سے کیا جائے جس میں ادب اور سنجیدگی ہو۔ [1]

صاحب تفسیر حقانی ذکر قلبی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

ذکر قلبی وہ ہے جس میں انسان اپنے لطائف باطنیہ کو اور اپنے جمیع قوی اوراکیہ کو اس کی طرف (اللہ) متوجہ کر دے اور یہاں تک محویت حاصل ہو کہ اپنے تئیں بھی بھول جائے خواہ نفی اثبات کر کے خواہ مراقبہ سے خواہ توجہ اور ہمت شیخ سے یہ بات حاصل ہو جب انسان کو یہ حالت نصیب ہوتی ہے تو جس طرح ممکنات میں ایک دوسرے کو اثر سے حال بدلتا ہے، مٹی پھول کی صحبت سے معطر اور لوہا آگ میں رہنے سے انگر ہو جاتا ہے اسی طرح انسان پر آثار تقدس فائض ہوتے ہیں پھر تو اس کی زبان اور اس کی آنکھ خدا کی زبان اور اس کی آنکھ اور اس کے ہاتھ پاؤں، اس کے ہاتھ پاؤں ہو جاتے ہیں (حالانکہ وہ ان چیزوں سے پاک ہے)، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آتا ہے پھر اس بندہ سے آثار عجیبہ بھی سرزد ہونے لگتے ہیں جن کو معجزات وکرامات کہتے ہیں اور یہ بھی ذکر قلبی ہی کی شاخ ہے"۔ [2]

1۔ تفسیر ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ الازہری، ج ۲، ص ۱۲۔

2۔ تفسیر حقانی، ابو محمد عبدالحق حقانی، ج ۲۔۳، ص ۳۹۔

(۱) ذکر لسانی: یہ ذکر کی دوسری بڑی قسم ہے۔ یہ وہ ذکر الٰہی ہے جو زبان کے ذریعہ ہوتا ہے خواہ اونچی آواز سے ہو یا دھیمی آواز سے۔ سورہ اعراف کی متذکرہ بالا آیت میں اس کی اجازت دی گئی ہے اور دھیمی آواز سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ آنحضورﷺ کا فرمان ہے" اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کثرت سے کیا کرو کہ لوگ مجنوں کہنے لگیں" ایک اور ارشاد ہے کہ" ایسا ذکر کرو کہ منافق لوگ تمہیں ریاءکار کہنے لگیں۔ ان احادیث میں ذکر لسانی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ریاکاری کا ذکر قلبی میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۱

صاحب تفسیر فتح المنان نے بھی اس لسانی ذکر کو" ذکر جوارح" یعنی ہاتھ پاؤں اور اعضاء کا ذکر کہا ہے۔ جس میں ان اعضاء کو ذکر میں استعمال کرنا اور نہیات سے روکنا ہے۔ نماز بھی ایک ذکر الٰہی کی صورت ہے کیونکہ اس میں انسانی جسم کے تمام اعضاء حرکت میں ہوتے ہیں۔ ۲

ذکر الٰہی اپنے اندر بے پناہ معاشرتی، اخلاقی، سیاسی، معاشی و اقتصادی ثمرات رکھتا ہے۔ جس سے انسان زندگی (دینوی و اخروی) کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ سب سے بڑی چیز دل کو اطمینان کی دولت سے سرفراز کرنا ہے۔ جس شخص کے قلب میں سکون و اطمینان ہے اس کی زندگی کامیاب ہے اور وہ ہر قسم کی نیکی کی طرف گامزن رہتا ہے اور ہر قسم کی برائی سے محفوظ رہتا ہے اور یہی اطمینان قلب کی دولت فقط ذکر الٰہی سے ہی نصیب ہوتی ہے جس کی شہادت خود قرآن دیتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ ۳

۱۔ اسلامی تمدن و تاریخ، ڈاکٹر حافظ محمود اختر، ص ۳۹۔

۲۔ تفسیر فتح المنان، عبدالحق حقانی، ج ۲۔۳، ص ۹۔

۳۔ القرآن، ۱۳ : ۲۸۔

ترجمہ: دھیان سے سنو اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔

صاحب تفسیر ضیاء القرآن فرماتے ہیں:

"کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ذکر الٰہی سے ہی دل میں اطمینان اور سکون پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ نور ہے جس سے شبہات کے اندھیرے بھاگ جاتے ہیں، یہی وہ غذا ہے جس سے روح کو تقویت ملتی ہے اور انسان میں نیکی کی مضمر صلاحیتیں نشو ونما پاتی ہیں اور جوان ہوتی ہیں۔ اسی سے انسان میں وہ جلال اور قوت پیدا ہوتی ہے جس سے شیطان پر لرزہ طاری ہوتا ہے اور اس کے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔ دنیا کی ساری نعمتوں میں سے "اطمینان قلب" سب سے عظیم نعمت ہے"۔ [1]

ذکر الٰہی ایسی نعمت عظمیٰ ہے جس سے تزکیہ نفس بھی ہوتا ہے اور روحانی بالیدگی بھی۔ تزکیہ نفس اور روحانی بالیدگی دونوں ایسی ضروری چیزیں ہیں جن کے بغیر دینوی زندگی میں پاکیزگی اور طہارت قائم نہیں رہتی اور اگر دینوی زندگی سے ایسی برکات کو نکال دیا جائے تو زندگی بیکار ہو جاتی ہے۔ بیکار دینوی زندگی آخرت میں عذاب کا موجب بنتی ہے۔

صاحب اسوہ حسنہ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ:

"انسانوں کے نفوس کی اصلاح کی جائے اور انہیں اللہ کے فرمانبردار بندے اور وفادار نائب بنانے کی سعی ہونی چاہیے، تزکیہ نفس اور روحانی بالیدگی کے لیے کام کیا جائے۔ یہ سب کچھ ذکر الٰہی سے ہی ممکن ہے"۔ [2]

1۔ تفسیر ضیاء القرآن، ج دوم، ص ۴۸۹۔

2۔ اسوہ حسنہ، بنت الاسلام، ج ۲، ص ۱۴۔

Scanned by CamScanner

ذکر قربت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نماز کی فضیلت کے بیان میں فرماتے ہیں کہ نماز مومن کی معراج ہے (ارشاد نبویؐ) کیونکہ نماز سے انسان اپنے خالق حقیقی سے ہمکلام ہوتا ہے اور نماز ہی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکات کا مرکز بنا ہوتا ہے۔ جسم، کپڑے، جگہ پاک ہوتے ہوئے اپنے رب ذوالجلال کی طرف راغب ہوتا ہے اور یہ تمام چیزیں قربت الٰہی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ نماز ذکر الٰہی کی ایک بہت بڑی عملی صورت ہے جس میں انسان کے تمام اعضا بھی ذکر الٰہی میں محو ہوتے ہیں۔ [1]

ذکر خشیت الٰہی کا موجب ہوتا ہے۔ اللہ کی یاد سے ذاکر کے دل میں خوف خدا پیدا ہوتا ہے جو اسے احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

الذین اذا ذکر اللّٰہ و جلت قلوبھم۔ [2]

ترجمہ: (ایمان والے وہ ہیں) جب اللہ کو یاد کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری اس آیت کی تشریح فرماتے ہیں کہ:

> جب بھی مومن لوگوں کے پاس ذکر الٰہی کیا جاتا ہے تو ان کے دلوں میں خوف خدا پیدا ہو جاتا ہے جس سے ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں۔ [3]

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے انسان کو فلاح اور کامیابی ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ دنیوی زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرے حصہ کا تعلق اخروی زندگی

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ، مترجم احمد بن سراج احمد، ص ۳۳۱۔
۲۔ القرآن، ۲۲ : ۳۵۔

سے ہے۔ ہر دو قسم کی زندگیوں میں فلاح وکامیابی کا دارومدار ذکر الٰہی پر ہی ہے جس کی شہادت خود قرآن نے دی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ [1]

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

صاحب تفسیر ''درس قرآن'' فرماتے ہیں:

> نماز جمعہ کے بعد اور کسب معاش و تجارت وغیرہ میں یہ تاکید فرمائی گئی کہ خداوند کے ذکر و فکر سے پھر بھی غافل نہ رہو۔ کفار کی طرح غافل ہو کر تجارت یا کسب میں نہ لگو بلکہ تجارت، خرید و فروخت اور مزدوری وغیرہ کے وقت بھی اللہ کی یاد جاری رکھو۔ [2]

خوشحالی اور آسودگی کا حصول ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک ایسی نعمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ خوشحالی اور آسودگی سے بھی نوازتا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، انسان بے فکر اور بے خوف ہو جاتا ہے اور اس کے معاشرتی مسائل ختم ہو جاتے ہیں اور ایک کامیاب شہری کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو فرما دیا کہ جو شخص بھی اللہ کے ذکر سے دوری اختیار کرے گا، اس کی معیشت اس پر تنگ ہو جائے گی۔

ارشاد ربانی ہے:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ [3]

۱۔ ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۲۱۵۔

۲۔ القرآن، ۶۲ : ۱۰۔

۳۔ درس قرآن، مولانا محمد احمد، جلد دوم، ص ۵۸۸۔

ترجمہ: اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگی معیشت ہے۔
صاحب تفسیر ''رفاعی'' اس آیت کی شرح میں فرماتے ہیں:

''یہاں ذکر سے مراد خدا کی یاد ہے اور یاد محبت کے بغیر بھی نہیں ہوتی۔ جو دل خدا کی یاد سے معمور ہوتا ہے وہ شقاوت میں مبتلا نہیں ہوتا اور جب اس یاد خدا کا اثر نفس امارہ پر پڑتا ہے تو وہ لوامہ بن جاتا ہے اور اس کے بعد جب یہ اثرات مسلسل پڑتے رہتے ہیں اور نفس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے تو وہ مطمئنہ بن جاتا ہے اور جب مطمئنہ بن جاتا ہے تو یہ مادی حجاب دور ہو جاتے ہیں اور نفس کے غلبے سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔ [1]

مولانا نعمانی فرماتے ہیں کہ'' یہ ایک فطری بات ہے کہ آدمی جس کسی کی عظمت و کمال کے خیال میں ہر وقت مصروف رہے اور جس کے حسن و جمال کے گن گاتا رہے اس کے دل میں اس کی محبت و عظمت ضرور پیدا ہو جائے گی۔ اور برابر ترقی کرتی رہے گی۔'' آپ یہاں تک فرماتے ہیں کہ اسلام میں جو پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی ہے وہ بھی ذکر الٰہی کو عام کرنے کی ہی ایک عملی صورت ہے کیونکہ نماز بلاشبہ اللہ کا ذکر ہے تاکہ انسان دن میں پانچ وقت اس خدائے ذوالجلال کے سامنے عاجزی اور انکساری سے پیش ہو۔ قربت اور محبت ایزدی حاصل ہو۔ [2]

ذکر الٰہی سے اخروی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے کیونکہ انسانی زندگی (دنیوی) کے بعد زیادہ اہم اخروی زندگی ہے جس میں احتساب اور جزا و سزا کا تصور ہے۔ اس زندگی میں ہر ایک کو اس کے کیے ہوئے اعمال کے مطابق زندگی گزارنا ہوگی۔ وہ زندگی اس کے لیے کانٹوں کا بچھونا یا پھول کی سیج بن سکتی ہے۔ ان ساعات میں کوئی رشتہ کام نہیں

۱۔ القرآن، ۲۰ : ۱۲۴۔

۲۔ تفسیر رفاعی، سید محمد رفاعی عرب، ص ۳۸۵۔۳۸۶۔

آ سکے گا سوائے اس کے اپنے اعمال صالحہ۔ مگر ان کٹھن نجات میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذاکرین کو نوید مسرت سے باخبر فرمایا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

والذاکرین اللہ کثیراً والذکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجراً عظیما۔ ¹

ترجمہ: اور جو مرد اور عورتیں اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

سید واجد رضوی لکھتے ہیں کہ زوال ملت کیوں ہوا؟ وہ زوال ملت کے اسباب کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ملت کے زوال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے تقویٰ اور توکل کو چھوڑ دیا ہے اور تقویٰ ہی اصل میں انسان کو گناہوں، برائیوں سے بچاتا ہے اور نیکی کی طرف راغب کرتا ہے۔ تقویٰ اصل میں ذکر الٰہی کا ثمر ہے۔ ²

انسان سے گناہ کا ارتکاب ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ گناہ کا ہونا اصل میں اعمال صالحہ کی کمی کا باعث اور سبب ہے اور ان گناہوں ہی کی وجہ سے انسان کی مغفرت و بخشش مشکوک ہو جاتی ہے۔ گناہوں کی معافی حاصل کرنا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی برائیوں سے نجات حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کے دربار میں سرخرو ہو سکے۔ گناہوں کی معافی بھی ذکر الٰہی ہی میں پنہاں ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو بخش دیتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

فرمان خداوندی ہے:

والذین اذا فعلوا فاحشۃً أو ظلموا انفسھم ذکروا

اللہ فاستغفروا لذنوبھم ومن یغفر الذنوب الا اللہ۔[1]

ترجمہ: اور وہ لوگ کہ جب کوئی غلط کام کرتے ہیں اور اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں

اس کے بعد خدا کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں تو خدا کے

سوا کون گناہ بخشنے والا ہے۔[2]

ذکر الٰہی سے غفلت بہت بڑے نقصان کا سبب بنتی ہے کیونکہ ذکر الٰہی سے غافل انسان سست اور کاہل ہو جاتا ہے اور ساتھ ساتھ کام چور ہونا شروع ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے تمام دینوی اور دینی کام ٹھپ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے بیروزگاری، نکماپن، مفلسی، بیماری، لڑائی جھگڑا جیسی معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اس لیے جو لوگ ذکر الٰہی سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں وہ نقصان میں ہوتے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

یاایھا الذین آمنوا لا تلھکم اموالکم ولا أولادکم

عن ذکر اللہ ومن یفعل ذلک فاولئک ھم الخسرون۔[3]

ترجمہ: اے ایمان لانے والو تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد

سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا فعل کرے تو یقیناً وہ لوگ نقصان اٹھانے

والے ہیں۔

۱۔ القرآن، ۳: ۱۳۵۔

۲۔ تفسیر رفاعی، ص ۸۱۔

۳۔ القرآن، ۶۳: ۹۔

Scanned by CamScanner

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ بکثرت ذکر اللہ کیا کریں اور تنبیہ کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مال اور اولاد کی محبت میں پھنس کر ذکر اللہ سے غافل ہو جاؤ پھر فرماتا ہے کہ جو ذکر اللہ سے غافل ہو جائے اور دنیا کی زینت ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے، اپنے رب کی اطاعت میں سست پڑ جائے۔ وہ اپنا نقصان آپ کرنے والا ہے" [1]

ذکر الٰہی سے دوری اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب بنتی ہے۔ ذکر الٰہی کی کثرت قربت الٰہی کا سبب بنتی ہے۔ نماز کو اسی لیے مومن کی معراج کہا گیا ہے۔ اور عبادات میں سے نماز کی عبادت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ نماز بھی اللہ تعالیٰ کے کامل ذکر کی ہی ایک عملی صورت ہے، اسی لیے تو نماز اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ نماز پڑھنے سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ انسان کا تکبر ختم ہو جاتا ہے۔ خالق اور مخلوق کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور نماز بذات خود بہت بڑے ذکر الٰہی کی ہی صورت ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

واقم الصلوۃ لذکری۔ [2]

ترجمہ: اور میری یادگاری کے لیے نماز قائم رکھ۔ [3]

صاحب تفسیر "مظہری" "لذکری" کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نماز کو اس لیے قائم کرو کہ مجھے نماز کے

۱۔ تفسیر ابن کثیر، حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر، مترجم: مولانا محمد جونا گڑھی، ج ۵، ص ۳۶۳۔
۲۔ القرآن، ۲۰ : ۱۴۔
۳۔ تفسیر رفاعی، ص ۳۷۶۔

اندر یاد کرو کیونکہ پوری نماز ہی ذکر خدا ہے۔ نماز کے اندر آدمی دل و زبان اور تمام اعضاء کے ساتھ اللہ کی یاد میں مشغول ہوتا ہے''۔ ۱

نماز اسلام کا بنیادی ستون ہے۔ کسی عمارت کا بنیادی ستون اس عمارت کے استحکام کا سبب ہوتا ہے۔ نماز کو بہت بڑا ذکر الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک ایسی بندگی ہے جو انسان کے لیے ضروری ہے اور اسلام میں اسی کا ہی مقام و مرتبہ ہے۔

سید قطب شہید اسلامی نظریہ کی خصوصیات کے تحت لکھتے ہیں:

''اس کی سب سے بڑی خصوصیت ربانیت ہے جس کے معنی ہیں کہ ربانی نظریہ سے مراد وہ نظریہ ہے جس کو انسان نے اللہ تعالیٰ سے اس کی تمام خصوصیات اور اصولوں کے ساتھ کامل و مکمل حالت میں لیا ہے تاکہ انسان خود اپنے آپ کو اس کے رنگ میں رنگ لے اور اپنی زندگی کو اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھالے، ہر وقت اسے یاد رکھے اس کی یاد ہی کی کثرت اسے سچا اور پکا مسلمان بنا دے گی۔ جو اصل میں اسلام کی تعلیمات کا مغز اور روح ہے''۔ ۲

ذکر کے کلمات:

ذکر کی اہمیت، ضرورت اور اس کے معاشرتی، معاشی، دینی اور دنیوی ثمرات کو قرآن وحدیث اور مختلف محققین کی تعلیمات و آرا کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس بات کا شدت سے اشتیاق ہونے لگتا ہے کہ وہ کون سے کلمات یا عبادات یا اعمال ہیں جن کے ادا

۱۔ تفسیر مظہری اردو، جلد ہفتم، مولانا ثناء اللہ پانی پتی، ص ۳۶۸۔

۲۔ اسلامی نظریہ کی خصوصیات اور اصول، سید قطب شہید، مترجم: سید شبیر احمد، ص ۴۳۔

Scanned by CamScanner

کرنے سے یہ کہہ سکیں کہ ذکر کر رہے ہیں۔ وہ اعمال درج ذیل ہیں۔

۱) قرآن مجید کی تلاوت:

قرآن مجید کی تلاوت ذکر الٰہی کی ایک اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اس کی تلاوت سے بے اندازہ اجر وثواب حاصل ہوتا ہے۔ ایک ایک لفظ پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ قرآن کو غور وفکر سے پڑھنا سارے اذکار سے افضل ہے۔ اس لیے اس سے جو تاثیر پیدا ہوتی ہے اور جو رموز اس کی تلاوت سے کھلتے ہیں وہ انسان پر ایک دائمی اثر چھوڑتے ہیں جس کی بدولت انسان صراط مستقیم کو اختیار کرتا ہے۔

۲) تہلیل:

اس سے مراد 'لا الٰــــــہ الا اللّٰہ' (اللہ کے سوا، کوئی معبود نہیں) کا پڑھنا ہے۔ اس کو افضل الذکر کہا گیا ہے چونکہ اس میں انسان اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرتا ہے جو تمام نیکیوں کی جان ہے پھر یہ پاک کلمہ دین کی اصل ہے اور ایمان کی جڑ ہے اس لیے اس کی جتنی بھی کثرت کی جائے گی اتنی ہی ایمان کی جڑ مضبوط ہوگی۔

۳) تکبیر:

(اللہ اکبر) 'اللہ سب سے بڑا ہے' اس میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان ہے جب انسان زبان سے اس کی بڑائی کا اقرار کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کی عظمت اس کے دل میں مقام کر جاتی ہے۔

۴) تسبیح:

(سبحان اللہ) 'اللہ پاک ہے'۔ اس میں خداوند کریم کے بے عیب اور جملہ نقائص سے پاک ہونے کا اعلان ہے۔ اللہ کے فرشتے اور تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگر انسان بھی اس حقیقت کا اعتراف کرلے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔

Scanned by CamScanner

۵) تحمید:

(الحمد للہ) 'تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں'۔ یہ جملہ اسقدر اہم ہے کہ قرآن کریم کا آغاز ہی ''الحمد'' سے ہوا ہے۔ پھر امت محمدیہ قیامت میں 'حمادون' کہلائے گی۔ حضور ﷺ کے جھنڈے کا نام ''لواء الحمد'' ہوگا۔ آنحضورؐ کے شمائل میں دن رات کی دعائیں ملتی ہیں۔ اکثر کا آغاز اسی لفظ ''الحمد'' سے ہوتا ہے اگر یہ حقیقت دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان اپنے آپ کو اللہ کا مطیع و فرمانبردار بنالیتا ہے۔

۶) استغفار:

استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ

گناہوں سے مغفرت طلب کرنا۔ گناہ پر ندامت کے بعد ہی ممکن ہے اور یہ ندامت انسان کو توبہ پر آمادہ کرتی ہے اور توبہ سے انسان کی آئندہ زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔

۷) اللہ تعالیٰ کے ناموں کا ورد:

اللہ تعالیٰ کے ناموں کا ورد بھی ثواب کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام صفاتی ہیں اگر ان کا زبان سے اقرار ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات انسان کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بہا۔ [1]

ترجمہ: اور اللہ کے بہت اچھے نام ہیں تو تم اسے ان ناموں سے پکارو۔ [2]

۸) دعا:

دعا ایک بہترین عبادت ہے۔

۱۔ القرآن، ۷ : ۱۸۰۔

۲۔ تفسیر رفاعی، ص ۲۰۹۔

Scanned by CamScanner

ارشادِ نبویؐ ہے:

الدعاء مخ العبادة۔ ؎۱

ترجمہ: دعا عبادت کا مغز ہے۔

۹) حضورؐ پر درود:

آپؐ پر درود پڑھنا بھی ذکر میں شامل ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

یا یھا الذین آمنوا صلوا علیه و سلموا تسلیما۔ ؎۲

ترجمہ: اے ایمان والو نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجا کرو۔

۱۰) جملہ عبادات:

تمام عبادات بھی ذکرِ الٰہی میں شامل ہیں کیونکہ وہ خدا کی یاد کا بہترین ذریعہ ہیں۔

۱۱) تبلیغِ دین:

دین لوگوں میں عام کرنا اور اس کے معارف سے روشناس کرانا بھی ذکر اللہ میں شامل ہے اور یہ مسلمانوں کا سب سے اہم اور بنیادی فریضہ ہے۔

۱۔ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، ج ۲، ص ۱۹۶۔

۲۔ القرآن، ۳۳ : ۵۶۔

Scanned by CamScanner

کتابیات

۱۔ اسلام کیا ہے؟ مولانا منظور احمد نعمانی، صدیقی ٹرسٹ نشتر روڈ کراچی۔

۲۔ اسلامی تمدن و تاریخ، ڈاکٹر حافظ محمود اختر مطبع معراج الدین، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۳۔ اسلامی دستور حیات، غلام احمد حریری، مطبع ہاشم اینڈ پرنٹر، لاہور، 1991ء۔

۴۔ اسلامی نظریہ کی خصوصیات اور اصول، سید قطب شہید، مترجم سید شبیر احمد، اسلامک بک پبلشرز، لاہور۔

۵۔ اسوۂ حسنہ، بنت الاسلام، بزم بتول، اسلامیہ پارک، لاہور۔

۶۔ القرآن الکریم مع اردو تفسیر، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس۔

۷۔ الصحیح البخاری، ابوعبداللہ محمد اسماعیل بخاری، ترجمہ ظہور الباری، مطبع مکتبہ مدنیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

۸۔ تدبر القرآن، امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن، ۱۲۲ فیروز پور روڈ، لاہور، مطبع مکتبہ جدید پریس، لاہور، دسمبر ۱۹۷۷ء۔

۹۔ ترجمان القرآن، ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، نیو دہلی، مطبع جے۔ کے آفسٹ پرنٹرز 315، دہلی، ۱۹۸۹ء۔

۱۰۔ ترمذی تالیف ابوعیسیٰ ترمذی، تخریج و تشریح، ابوانیس، محمد یحییٰ گوندلوی، سیالکوٹ، مطبع عاصم بک سنٹر، سمبڑیال، سیالکوٹ، ۱۴۲۱ھ۔

۱۱۔ تفسیر ابن کثیر، حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر، ترجمہ مولانا محمد صاحب، جوناگڑھی، مکتبہ قدوسیہ، لاہور۔

۱۲۔ تفسیر ثنائی، ثناء اللہ امرتسری، مطبع استاذ اللہ، گوالمنڈی، لاہور۔

۱۳۔ تفسیر حقانی، ابومحمد عبدالحق الحقانی، مکتبہ الحسن، لاہور۔

۱۴۔ تفسیر رفاعی، سید محمد رفاعی عرب، دینی کتب خانہ، رفاعی منزل، لاہور۔

Scanned by CamScanner

۱۵۔ تفسیر ضیاء القرآن، ج ۲، پیر محمد کرم شاہ الازھری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۶۔ تفسیر مظہری، مولینا ثناء اللہ پانی پتی، ایچ ایم سعید کمپنی، ادب منزل، کراچی۔

۱۷۔ تفہیم القرآن، ابوالاعلیٰ مودودی، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔

۱۸۔ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ، ترجمہ احمد بن سراج، مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔

۱۹۔ درس قرآن، مولانا محمد احمد، اشاعت القرآن، ناظم آباد، کراچی۔

۲۰۔ زوال ملت اور نشاۃ ثانیہ، سید واجد رضوی، مقبول اکیڈمی، لاہور۔

۲۱۔ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، مطبع روحی، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

۲۲۔ کیمیائے سعادت، ابو حامد محمد الغزالی، ترجمہ پروفیسر مجید یزدانی، مسلم پرلیس، لاہور۔

۲۳۔ مکاشفۃ القلوب، ابو حامد محمد بن محمد الغزالی، ترجمہ قاری محمد عطاء اللہ، مکتبہ اسلامیات، لاہور۔

Scanned by CamScanner

وزیر آغا

کیوں دکھ اوڑھ کے بیٹھے ہو!

کیوں دکھ اوڑھ کے بیٹھے ہو
کیا سوچ رہے ہو
دھند کو دیکھو
اس نے اپنے سارے تھان سمیٹ لیے
پھولوں کو دیکھو
اپنے اپنے
شاخوں اور پتوں کے معبد
سب نے چھوڑ دیے
کلیاں دیکھو
کیسے کھل کر پھول بنیں
اور بچے ہاتھ چھڑا کر
گھر سے دوڑ گئے
بھونرے، خوشیاں، نغمے، سب آزاد ہوئے
کیوں دکھ اوڑھ کے بیٹھے ہو
تم، دکھ کی میلی گدڑی پھینکو
آسمان کو دیکھو
تم بھی ـــــ آسمان کو دیکھو!!

❀❀❀

Scanned by CamScanner

آفتاب اقبال شمیم

ایک نا اطاعت پسند کا نوحہ

وہ مرا تو نہیں ہے مگر
اس کا نوحہ لکھوں گا
جسے ایڈ (Ad) ایجنسیوں کے مشاہیر
مدت ہوئی اپنے ہاتھوں سے دفنا چکے ہیں
وہی جو
کنوئیں کا صداکار بننے پہ راضی نہیں تھا
نصابوں کی اشرافیہ نے اسے
نام انعام کی عکس افروز ٹھہری ہوئی جھیل میں
تیرنے کی طلب کا اشارہ دیا
بحر و دریا، ستارہ و مہتاب کے کہکشاں پانیوں کا شناور
کہاں ڈوبتا
پھر وہ پہر کے آبِ پایاب میں
اپنے محشر میں 'کن' کی صدا سننے والی
انا اور آزادیوں کی الف قامتیں
ضابطوں کو نہیں مانتی ہیں

اسے دیکھ
وقتوں کی کشور میں وہ اپنی تنہائیوں کی
اکیلی مسافت میں متروک و رائج سے آگے

رواں ہے
لکھے ان لکھے لفظ کے درمیاں ہے
مگر کون پوچھے اسے اس کی منزل کہاں ہے

Scanned by CamScanner

تبسم کاشمیری

خیال، کبوتر اور چڑیا

سہ پہر کا کبوتر
اور شام کی چڑیا
دونوں مرے ساتھ
مرے ہاتھوں اور کندھوں پر!
انار کے پیڑ کی خوش بو
اور زرد چنبیلی کی جھاڑی
مرے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی
ایک بادل مرے پاؤں سے لپٹتا
نظم کے قلعہ پر برستا
اور ایک فصیل پر دوڑتا ہوا
لفظوں کی گھڑیوں میں جھنجھناتا
شور مچاتا اور مچلتا ہوا ایک خیال
نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گیا
کچی پکی سڑکوں پہ گشت کرتا
تاریکی کے ساتھ دوڑتا
اور ریل گاڑیوں میں سفر کرتا ہوا
مجھ تک آ پہنچا

Scanned by CamScanner

اور مرے ہم رکاب ہو کر چلنے لگا

اور کھیلنے لگا

سہ پہر کے کبوتر

اور شام کی چڑیا کے ساتھ!

Scanned by CamScanner

احسان اکبر

عراق آشوب

"کون دیتا ہے دادِ ناکامی
خونِ بغداد، بہ سرِ بغداد"
جہاں والے غضب کی قدر اندازی پہ قادر تھے
فلک کے قلب میں تیر ان کے جاتے
اور خوں سے تربتر آتے
قیامت اور کیا ہوتی؟
جنوبی کمپنی کی گارد
علماء کی اذیت گاہ پر
تبدیل ہوتی ہے
نجف، گیلان، کربل، کاظمین ہو
اس زور سے نوحہ اٹھاتے ہیں
کہ بابل کے منارے گونج اٹھتے ہیں
کنارِ دجلہ وہ ہو حق کا عالم ہے
کہ نے بصرہ ہے نے بغداد
خالی نینوا ہی نینوا باقی
"ھوالغالب .... ھوالغالب"
زمینِ علم و تہذیب ہے دہائی!
لا غالب الا اللہ

Scanned by CamScanner

کل یہ کون کہہ سکتا تھا
ہارون و برامکہ کی حق تلفیں
کبھی یاں جو ہیں نمک کے لیے
مجبور کر دی جائیں گی
لاحول ااا ھو
سلوا
دیوار گریہ پہ صدا اتحد یل ہوتی ہے
"صلاح الدین اٹھ رے ہم پلٹ آئے
دمشق اگلا قدم ہے"
عرب کی گرتی ہوئی دیوار
کردستان میں کھینچی گئی
دیوار تو حد بصرہ و موصل سے ہوتی
درمیاں بغداد کے رکتی ہے
کس کس کی کتابوں میں یہ منظر تھا؟
روایات اس کی بابت چپ
کہ اس جلوہ کی ٹیکنالوجیکل تحریر
کمپیوٹر سے ہے
جو آنے والے وقت کے نقشے بنائے گا
خبر تھی
اہل حرف اہل حیلہ ایک ہیں
تم ہاتھ ہاتھوں میں دیے چلتے
تو سب رنگوں سے مل کر روشنی والی اکائی پھوٹتی

سب کی محفل میں روشنی ہوتی
(کبھی سب لوگ ملتے تب تری اک داستاں بنتی تھی)
اب وہ لوگ
اور وہ دور
بغداد، باغ، اور جن سے تھا
کہاں ہیں؟
آج ان اینٹوں کی قربانی کو داد صبر دے
جو دجل، دجلہ سے ہوا
ممکن نہ تھا
لگتا نہ تھا
تم سات صدیوں بعد پھر
پچھلی صدی میں پھینکے جاؤ گے
کہانی اور دریا کی روانی
پچھلے پانی میں نہیں بہتے
مرے دجلہ! ہم
جنہیں خود اپنے پانی
اپنی مٹی ہی نے گوندھا ہے
انھیں خاشاک ہونے سے بچا
خاک ہزار و یک فسانہ!
آپ مت افسانہ بن جاؤ
کسے معلوم تھا
بربادیوں کو جھٹکے دامنوں بھی تجھے لینا ہے

Scanned by CamScanner

(ان کا آپ قصہ خواں بھی بننا ہو گا)

ان کاریگروں کا

آج جو اہلِ عرب کی جیب سے

اپنی ہی حرفت دکھاتے

اور پرائی ان کے سر پر مار آتے ہیں

کوئی بھی سانحہ

جو تجربے کی شکل بن جائے

بہت مہنگا نہیں رہتا

یہ تنہائی کی مظلومی

یہ مظلومی میں تنہائی

اگر اپنوں سے رشتے ڈھونڈ سکتی

تو یہ مرگِ انبوہ کی

اپنی جگہ اک جشن بن جاتی

علی، ابنِ علی، کاظم، سری سقطی، بشر حافی

جنید و بایزید و بوحنیفہ، رابعہ، کرخی

شہ گیلاں، شبلی، فاطمہ، نیشاپوری، حلاج کے

سب اپنی روایت ساتھ لاتے ہیں

کہاں سے تم روایت اپنی لائے

اپنے ہاں مشرب منگاتے ہو

تمھیں تو بوالحسن کہتے ہیں

”خون آشام لمحوں سے

پرندے گھونسلوں تک میں نہیں بچتے“

Scanned by CamScanner

یہاں بازوؤں سے تلواروں کی
اب تک خوں نہیں اترا
کبھی گوشوں، کبھی رشتوں میں سارے آدمی محفوظ رہنے دینا
(ایوبی کے چراغ
قومی بدبختی کے لیے
انفرادی داخلی محرومیوں کے وارث ہوتے ہیں)
آفاق پیا
اونچا اڑنے والے طائر
دام ہم رنگ زمیں سے
ہر زمانہ میں
یونہی غافل رہے ہیں
اور ستم یہ ہے
''اناالحق'' کی صدائے حق
تری ہر حق زمیں پر
ہر زمانے
وقت سے پہلے اٹھی

۱۔ عراق میں مسلم مذہبی مقامات
۲۔ اسرائیل کا مشہور شہر
۳۔ یہودیوں کی مناجات کا مقدس مقام
۴۔ بغداد دریائے دجلہ کے کنارے آباد ہے
۵۔ سب مسلم اولیائے کرام
۶۔ صلاح الدین ایوبی کے قبائل مراد ہیں کرد
۷۔ منصور حلاج کی صدا جو بے خودی میں اس کے منہ سے ادا ہو جاتی۔

نصیر احمد ناصر

کیا اب میری باری ہے؟

ہنستے کھیلتے
واک پہ جاتے
باتیں کرتے
کافی پیتے
نظمیں لکھتے
موت نے مجھ کو زندہ دیکھ لیا ہے

راک وال

چہرے اور آنکھیں تو باہر کا چہکارا ہیں
یاد کے آنسو
درد کے رشتے
اندر خانے سب کچھ گروا جاتا ہے
پینٹ نیا ہو جانے پر
باہر سے گھر
خوب نظر آتا ہے !!

❀❀❀

علی محمد فرشی

نظم

کہاں دفن تم نے کیا ہے اسے؟
راکھ کن پانیوں میں بہائی؟
تناول کیا تم اس کا؟
کہ اونچی پہاڑی سے اس کے بڑھاپے کو سر سے اتارا؟
یا کوہ ندا کی طرف آپ ہی جست اس نے بھری؟

اور اس کے جنازے میں شامل
خدائی بھی زندہ کہاں ہے؟
کہ ہم پوچھ لیتے
خدا کی وصیت میں
انسانیت کے لیے کتنا ترکہ ہے محفوظ
شیطان کی دسترس سے؟

کولمبس کی اولاد
پانی، ہوا، آگ اور خاک پر
حکمراں ہے خدا کی طرح
اور ہم ..... اس کی برسی کی تاریخ
معلوم کرنے میں مصروف ہیں

Scanned by CamScanner

آدمی کے لیے

آدمی کو خدا مان لینا

کہاں اتنا مشکل ہے

لیکن

یہاں بات انسان کی ہو رہی تھی

❀❀❀

Scanned by CamScanner

رفیق سندیلوی

بڑا چکر لگائیں

کسی دن آ
پرانی کھائیوں کو پار کر کے
دلدلوں میں پاؤں رکھیں
نرسلوں کو کاٹ ڈالیں
پیش منظر کے لیے رستہ بنائیں
آ کسی دن

دھند میں جکڑی ہوئی
کانٹوں بھری یہ باڑھ
جس میں وقت کی بجلی رواں ہے
جو زمین و آسماں کو
کاٹتی ہے
بیچ سے
اس کو ہٹائیں

آ کسی دن
جھولتے پُل سے اتر کر
نقشِ تقویم میں

پُر پیچ کہساروں کے اندر
گھومتی، بل کھاتی ندی میں
غوطہ زن ہوں
تیرتے جائیں
کسی دن آ
بڑا چکّر لگائیں!

Scanned by CamScanner

ہم حیراں ہیں

ہم نے حیراں کیا ہونا ہے
ہم تو اپنی روح کے بیچ پر
جرس جرس
رقصاں رقصاں بیت رہے ہیں
رخ پر پریم دھرم کا سونا
آنکھوں گرد نندا ای شب کا سرمہ
بالوں میں مٹی کی افشاں
کتنے پیارے لگتے ہیں ہم
ایسے دیکھے رہتے ہیں
جو سرد ہوا کا جھونکا چھو لے
لو بن جائے
ایسے بھیگے رہتے ہیں
ہم دوسرے گام میں
صحرا آخر کر دیتے ہیں
اپنی خبر کی زد میں آئے ہوئے ہیں
محمل میں کیا بھید نہاں ہے
ناقہ کس منزل کو رواں ہے
صحرا یہ جو رشک جناں ہے

کون جہاں ہے
یہ جو بانگ درا ہے
کون زمانوں کی بے انت فغاں ہے
ان گلیوں کے
طفل و سنگ و سگ و غوغائے رقیباں
کیا ہے سارا کھیل تماشہ
ساری خبر ہے
لیکن اپنی کھینچ کی شدت سے
کبھی باہر آ نہیں پائے
تم کو کیا بتلاتے
ہم تو وہ آہو ہیں
جس کو اپنی روح کے بے آباں میں
اپنے ہی نافہ کے تعاقب میں رہنا ہے
وصل میں فصل
اور فصل میں وصل کی راس رچائے
عشق ہمیں ہیں
حسن ہمیں ہیں
ہم حیراں ہیں
ہم حیران ہی کیوں ہیں؟

❀❀❀

Scanned by CamScanner

زاہد منیر عامر

انوالومنٹ

فضا میں رنگین بلبلوں کی طرح سے گیندیں اچھل رہی تھیں
یہ ارغوانی، یہ قرمزی، سبز، نیلگوں، سرمئی ستارے
بلند ہو کر بھی پستیوں کو پہنچ رہے تھے
وہ ناز تھا جس پہ سرگونی کا ابر رحمت بنا ہوا تھا
معاصرے ناتراش احساس کے فلک پہ
نیاز نے اک لکیر کھینچی
فلک کو چھوتی حسین گیندیں
مری تمنا کے استعارے
چمکتی امید کے سہارے
شکستہ ہو کر زمیں پہ اترے
تو ریزہ ریزہ انھی کے ذرّوں میں میری ہستی بکھر چکی تھی

(۲)

سکون، اک ناشناس جوہر
ازل سے جس کی تلاش مجھ کو
وہ میکدہ ہو، شہنشہی ہو، حرم سرا ہو

☆ اناطول فرانس کی نذر

Scanned by CamScanner

سبھی کے چہروں پہ وحشت و آز کے نشاں تھے
سبھی کو دیکھا
میں ایک سہا وجود بن کر
چمکتے شہروں سے بھاگ نکلا!
مہکتے باغوں سے آگے بڑھ کر، میں آبشاروں سے در گزر کر
بلند چوٹی سے سر جھکائے
پھسلتے قدموں سے ایک جانب
اتر چکا تھا۔

(۳)

یہاں کا منظر دنی نہاروں کے پیش منظر سے مختلف تھا
بہت سے گیانی، بہت گنوں میں، بہت دنوں سے، بہت مہارت کو پا چکے تھے
یہاں نہ دکھ تھا، یہاں نہ سکھ تھا
تمام دکھ سکھ
برہنہ پا اس پہاڑ کی دوسری جہت میں رُسوا خراب اور خوار پھر رہے تھے
یہاں محبت نے ہاتھ بن کر
شکستہ اوراق چھو لیے تھے
شکستہ اوراق
جن کے باطن سے بوئے الہام اٹھ رہی تھی
میں اپنی آنکھوں سے ان کے لفظوں کو چومتا تھا

Scanned by CamScanner

حروفِ ابجد

مری نگاہوں پہ ایک نمدیدہ جمل کی چال چل رہے تھے
پڑھا نہیں تھا، لکھا نہیں تھا
میں ان صحیفوں کو کیسے پڑھتا؟
میں ان نوشتوں کو کیسے لکھتا؟
بہت سے راہب تخن سرا تھے
حضورِ مریم، عقیدتوں کے گلاب لفظوں میں ٹانکتے تھے
میں ان کے لفظوں کے پیکروں میں فقط تحیر ہی بیچتا تھا
حضورِ عذرا، عظیم مریم!

وہ ہاتھ جس نے حسین پیکر کے نقش پتھر کو دے دیے تھے
مرا نہیں تھا
میں بے ہنر تھا
مری عقیدت؟
مری محبت؟
نہ لفظ و معنی، نہ رنگ و صورت
کہ شیشہ بازی مرا مقدر
فضا میں رنگین بلبلوں کی طرح میں گیندیں اچھالتا تھا

بہت زمانوں سے بند سینے کے در کھلے اور صدا یہ آئی
'تم اپنے فن کا حقیر تحفہ جنابِ مریم کی نذر کر دو'
بس ایک لمحے کو میں نے سوچا

Scanned by CamScanner

کہ ایک لمحے نے مجھ کو سوچا
خبر نہیں کچھ!
یہی بتایا گیا ہے مجھکو
حضورِ مریم کھڑا ہوا میں، بہت عقیدت سے، سر کے بل تھا
فضا میں گیندیں اچھالتا تھا
یہ ارغوانی، یہ قرمزی، سبز، نیلگوں، سرمئی ستارے
حیا و تقدیس کے فلک پر چمک رہے تھے
کسی ہنرور، کسی سخن ور
نے اپنے فن سے نکل کے باہر
نگاہِ غیظ و غضب سے دیکھا
مجھے خبر کیا؟
نگاہِ مریم میں پیار اترا
حیا کی دیوی کے سرخ ہونٹوں پہ مسکراہٹ کے پھول بکھرے
حسیں قدمچے سے پاؤں اٹھے،
زمیں پہ اترے
مجھے اٹھایا.........
تمام راہب ریاضتوں کی بیاض کے عیب ڈھونڈتے تھے

❀❀❀

پروین طاہر

انعکاس

میں تو اپنی ہی تھی
لیکن
تمھاری ذات کے اندر چھپا
میرا اثبات
میں اگرچہ نامکمل
کر دیا میرے تخیل نے
تجھے اتنا مکمل
جس طرح ہے کوئی پورن ماہتاب
اپنے ہونے کے لیے
اب مانگتی پھرتی ہوں
تجھ سے
اک کرن بس اک کرن کی
آب و تاب
جگمگانا ہے مجھے اک جائیہ
آگے کھڑی ہے منتظر
لمبی اماوس رات
بس اک کرن
بس اک کرن کی آب و تاب !!

Scanned by CamScanner

بدگمان

تمہارے گلے میں
نئے خواب کے موتیوں کی سنہری سی مالا
ہماری نہیں ہے
سمندر......... وہ جس پر
تمھارے قدم کشتیاں ہوں
ہمیں صرف درسِ فنا ہے
ہمارے لیے تو
کسی اجنبی سی صدا کے بھنور سے نکلنا بھی ممکن نہیں ہے
ہمیں آشنا سی نگاہوں سے
سبزے میں لپٹی ہوا نے بلایا...... تو
...........ہم گر پڑیں گے
خزاں کے شجر سے
کوئی آخری پھول بن کر
ہمارے ہر اک آئنے کا تو شیوہ ہے بس
ٹوٹتے دل کے احساس سے ٹوٹ جانا
قیافہ لگانا
بھلا کون سی آنکھ نمکین سے جھوٹ کے پانیوں سے بھری ہے
بھلا کون سے ہونٹ شیرینیاں بانٹتے ہیں
'شروعاتِ چاہت' میں ایسا قیافہ لگانا نہیں جانتے ہم

Scanned by CamScanner

داؤد رضوان

ناممکن کا ممکن

شام دل گرفتہ ہے
بے وجود تنہائی
چار سمت پھیلی ہے
دھند کی ردا اوڑھے
خواب اگلے وقتوں کے
سرخ بوجھل آنکھوں میں
لہر لہر اٹھتے ہیں
بوند بوند تاویلیں
خواہشات کا ایندھن
سرد کر نہیں سکتیں

❀❀❀

Scanned by CamScanner

ناہید قمر

رات خاموش ہے

رات خاموش ہے
بولتی کچھ نہیں
چشم احساس تک، کن فراموشیوں کے کناروں سے یہ
ایسے ادھڑے ہوئے دل زدہ منظروں کو اٹھا لائی ہے
جو رفوگر کے ہاتھوں میں آتے نہیں
دکھ کے طاعون سے
بال و پر فاختاؤں کے جھلسے ہوئے، راکھ اڑتی ہوئی
کیسے پوچھے مگر ان دریدہ زمینوں کی بابت کوئی
شاخ زیتون سے

کرگسوں نے جہاں
عہد نسیان کی بے کفن ساعتوں کے بدن ہی نہیں
باب وابستگی کے سنہری غلافوں میں لپٹی ہوئی
یاد کے برگزیدہ متن کھا لیے
رہ گیا ایک پنجر سا تابوت میں
وقت کی منجمد کروٹوں کے نشاں
میوزیم میں سجے ریپلیکا پر کہاں
داستان کے سرے
ایک بے واقعہ واقعیت کے ٹکڑوں میں گم ہو گئے

Scanned by CamScanner

رہ گئی ہے فضا میں فقط گونج سی
گورکن کی کدالوں کی آواز کی

اور حرفِ مکافات خاموش ہے
رات خاموش ہے

Scanned by CamScanner

ارشد معراج

خواب کی چتا پر ماتم کرتی تعبیر

ہم ایسے خوش فہمیوں میں ڈوبے
یہ سوچتے تھے
محبتوں کی سنہری فصلیں پکی ہوئی ہیں
گلابی پوروں سے دانہ دانہ سمیٹ لیں گے
مگر مری جاں..........!
یہ واہمے تھے، گمان تھے سب
حقیقتوں کے کواڑ اب تک کھلے نہیں ہیں
پون کی میلی ہتھیلیوں پہ
جو گیت ہم نے لبوں سے لکھے
وہ نوحہ بن کر بجھے پڑے ہیں
اور ایک ہم جو گلاب لہجے
خزاں کے موسم میں ڈھونڈتے ہیں
نئی رتوں میں ہوا کے رخ پر بکھر گئے ہیں
تمہیں یہ سب کچھ پتا ہے ارشد..........
کہ پیلے پتوں کے ناخنوں پر
حنائیں کب تک سفر کریں گی..........؟

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر سرفراز ظفر

پانی گدلا مت کرنا

پانی گدلا مت کرنا
ہو سکتا ہے دور کہیں
ایک کبوتر ندی کنارے
صحرا کی وسعت طے کر کے
ستاتا ہوا، پیتا ہو
یا جنگل کی خاموشی میں
خستہ، ہارا ایک مسافر
اپنی پیاس بجھاتا ہو
پانی گدلا مت کرنا
یا نزدیک کہیں گاؤں کی
دوشیزہ ایک مٹکا لے کر
نرم حنائی ہاتھوں سے
بھرنے میں مصروف نہ ہو
پانی گدلا مت کرنا
یا شفاف سے پانی میں
سبز گھنے شہتوت کے سایے
اک درویش بھی سوکھی روٹی
نرم و ملائم کرتا ہو

پانی گدلا مت کرنا
کتنے خوش قسمت وہ لوگ
جو اس چشمے کے پہلو میں
اپنے گھروندوں میں بھی رہ کر
من کو پاکیزہ رکھتے ہیں
جن کے سرکنڈوں کے چھپر
انگوروں کی بیلوں میں
پھولوں کے جھرمٹ میں گھر کر
فطرت کی رنگینی کو
دوبالا ، دو چند کریں
بے شک ان چھپروں کے اندر
سورج کی لہراتی کرنیں
نور کی بارش برساتی ہیں
چھن چھن کر جو آتی ہیں
ان چھپروں کے سایے میں
نور کی پاکیزہ بارش میں
کیسے ہوں گے پھر وہ لوگ
پاکیزہ سے ذہنوں والے

اجلے چہرے، من کے صاف
جیسے آئینہ شفاف
میں نے اب تک نہ دیکھا ہے
ان لوگوں کو جا کر بھی
لیکن اس چشمے کا پانی

ان کا ہے غماز مگر
کیسے پاکیزہ رکھتے ہیں
ان کو یہ معلوم سبھی
تم پر بھی یہ لازم ہے
پانی گدلا مت کرنا

Scanned by CamScanner

الیاس بابر

بہار رُت میں

بہار رُت میں
خزاں رسیدہ، اُجاڑ چہروں پہ ڈولتی ہے
کوئی اداسی
کھلکھلاتے لبوں میں سنسناتی ہے
بے سکونی
کہ روشنی سے یتیم آنکھوں
میں مسکراتی ہے بے یقینی، بہار رُت میں

بہار رُت میں
لرزتے لمحوں کی ڈالیوں پر
پروئے جاتے ہیں
خواب سارے
عذاب سارے، "مگر"
تمنا کے دائرے
بے نشان، بے نقش
خواب چہروں
سراب چہروں
پہ خواہشوں کی مہیب برکھا
نجانے کیوں ہر بہار رُت میں
گمان کی وسعتوں سے اوپر
خیال کے آسماں کی حد تک
کچھ اس طرح سے گرا رہے ہیں
کہ جیسے کالے سحاب کا
بے سکون سینہ اُبل پڑا ہو

Scanned by CamScanner

سیدہ نوشین فاطمہ

اب کیا............!

میری آنکھیں بوجھل بوجھل ہیں
میرے سارے سپنے ٹوٹ گئے

اب مجھ کو باغ سے کیا لینا
میرے کھیل کھلونے چھوٹ گئے

میں پھول کو پیار سے کیوں دیکھوں
میرے گہنے گجرے ٹوٹ گئے

میں خود پہ بیتی کس سے کہوں
میرے سنگی ساتھی روٹھ گئے

Scanned by CamScanner

صائمہ نذیر

تو مرے لیے کیا تھی؟

تو مرے لیے کیا تھی
ایک پل کی سرشاری
دور ہو گئی ایسے
جیسے جلتے موسم میں
یخ ہوا کا اک جھونکا
چھو کے بس گزر جائے
یا کہیں اندھیرے میں
صرف ایک لمحے کو
روشنی بکھر جائے
اک ذرا پلٹ کر دیکھ
میں اسی قدم پر ہوں
جس پہ یہ کہا تم نے
''تم سے میں اگر بچھڑوں
زندگی بچھڑ جائے''

Scanned by CamScanner

فائزہ صادق

پچھلے پہر کی ہوا

ہوا پچھلے پہر چلتی ہے تو
جانے ادھورے خواب کتنے
ان کے الفاظ کے انبار
کیسے ڈھونڈ لاتی ہے
میں کھوئی کھوئی آنکھوں سے
کئی بچھڑے ہوئے اپنوں
اور ان کے اَن گنت سپنوں کی
ان ساری
مکمل ہو نہ پائی صورتوں کو دیکھتی ہوں
اور دل میں سوچتی ہوں
ہوا پچھلے پہر کی............
کس لیے چلتی ہے آخر

Scanned by CamScanner

سیما کوثر

جیون صحرا میں اتری ایک شام

نہ خواہشیں ہیں اس قدر کہ زندگی سے پیار ہو
نہ خوف یوں کہ موت کے سمے کا انتظار ہو

نہ اس قدر ابال ہے کہ نفرتوں میں ڈھل سکے
نہ اس قدر کشش، محبتوں کا دیپ جل سکے

نہ وہ مہک اڑی ہوئی، گمان ہو بہار کا
نہ رنگ جو نقیب ہو خزاں کے کاروبار کا

نہ قرب وہ کہ جیسے کوئی دل کے آس پاس ہو
نہ دوری وہ جہاں کہیں اکیلے پن کی باس ہو

Scanned by CamScanner

تبسم ارشد

کاش!

خواہشوں کا حصول ممکن ہو
گر نہ پائیں تو بھول جائیں انھیں

ذہن کی لوح سے مٹا ڈالیں
ساری یادوں کو ساری باتوں کو

کاش ! ایسا ہو زندگانی سے
''کاش'' کا لفظ ہی نکل جائے

اور ایسا نہ ہو سکے تو پھر
سامنے پھر یہ لفظ نہ آئے

کاش..............!

Scanned by CamScanner

شائلہ ناز

دو باتیں

تم نے کہا تھا
''میں تمھیں تارے لا دوں گا''
آ کر دیکھو
تارے سجے ہوئے ہیں
لیکن میری پلکوں پر
تم نے کہا تھا
زیست کی رہ میں ساتھ چلیں گے
لیکن اب
میں ان راہوں میں تنہا، حیراں سوچتی ہوں
دونوں باتیں ہی......!

Scanned by CamScanner

جلیل عالی

نظمیں

ٹائمنگ

جن دنوں
ڈیزی کٹر
زمین کے سینے میں
سرطان اتار رہے تھے
تمہارا قلم
مضمون آفرینی کی
آسمانی سیر پہ نکلا ہوا تھا

ترجیح

گلوبلائزیشن کے سیلاب کی
تباہ کاریوں کے
منظر مت دکھاؤ
پسماندہ زمینوں پر
خواہش جگاتے
لش لش کلچر کی
زرخیز مٹی کا
پھیلاؤ تصور کرو

Scanned by CamScanner

اجارہ

اپنی سرزمینوں پر
بڑھتے ہوئے
ہمارے ٹینکوں کو
پتھر مارتے ہو!
دہشت گردو!!
تمہیں ہر صورت
ہماری من مانی قیمت پر
امن خریدنا ہوگا

قصور

''سامراجی جارحیت کو
بُرا بھلا کیوں کہتے ہو
قصور تمہارا اپنا ہے
تم نے ٹیکنالوجی میں ترقی نہیں کی''
''مگر ہمارا ایٹمی پروگرام''
''اس سے عالمی امن کو خطرہ ہے''

احتیاط

کبھی کبھار
کچھ دیر
خود اپنے ساتھ بیٹھ لینے کا
مشورہ بجا
مگر آڈٹ فائل کھل جانے کا
خطرہ خریدنا
کہاں کی عقلمندی ہے

وقار بن الہٰی

گرما گرم

یہ عادت بہت پرانی تھی کہ وہ جب بھی باہر نکلتے، اکٹھے ہی نکلتے۔ حالانکہ ان میں سے زید کی عادات بکر سے بہت مختلف تھیں۔ بکر جتنا آدم بیزار تھا زید کو اتنی ہی میل ملاقات سے محبت تھی۔ بلکہ اب تو اسے کوئی تردد بھی نہیں کرنا پڑتا تھا...... گھر گھسا رہتا اور ملنے جلنے والے اس کے ہاں حاضری دیتے رہتے' جیسے اس کا گھر' گھر نہیں کوئی مزار ہو، جہاں حاجت مند حاضری دیتے رہتے ہیں۔ اب یہ تو وہی جانتا تھا کہ گھر کو مزار بنانے کے لیے اسے کیا کچھ کرنا پڑا تھا اور کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے لیکن گھر کا مزار بنا تھا کہ......

بات ہو رہی تھی ان کی پرانی عادت کی...... ویسے بکر کو جانے کیا خدا کی مار تھی کہ گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ استعمال نہ ہو تو ہر شے کو زنگ لگ جاتا ہے' گھٹنوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ البتہ بکر کی بات دوسری تھی کہ اسے زنگ لگتا تھا نہ ہی اس کے گھٹنوں میں پانی بھرنے کی نوبت آتی تھی بس اسے باہر نکلنے اور لوگوں سے ملنے سے چڑ سی تھی۔ ہاں! کہیں جانا ہوتا تو دونوں کوشش کرتے کہ اکٹھے ہی جائیں۔ اب اس کوشش کے پیچھے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایک ایک' دو گیارہ کا فلسفہ کارفرما تھا کیونکہ دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مجال ہے جو ایک کو دوسرے کی کوئی شے تجویز یا پسند' پسند آ جائے...... اس روز وہ یہ طے کر کے نکلے کہ گرما خریدے بغیر واپس نہیں آئیں گے......

دونوں کی مالی حالت اچھی خاصی تھی بلکہ زید کے ہاں چونکہ غیر ملکی امداد بھی وارد ہوتی تھی' اس لیے وہ بہتر نہیں بلکہ بہت ہی بہتر حال میں تھا' جس کا اسے احساس بھی تھا اور جس کا اظہار وہ کبھی کبھار کرنے سے چوکتا بھی نہیں تھا...... اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دو

Scanned by CamScanner

کی بجائے چار خرچنے کا عادی ہو گیا تھا البتہ اس کا چ چا ضرور کرنے لگ گیا تھا — زید کا خیال تھا' گر ما خریدنے کے لیے بہترین جگہ وہ چھابے ہوتے ہیں جہاں کوئی بھی سفید پوش اپنی مرضی سے ایک دن نمودار ہوتا ہے' چند ایک بہتر نسل کے پھل منڈی سے لا کر رکھتا ہے اور شام تک بیچ باچ کر اپنی جیب بھرتا' دوسروں کی کاٹتا گھر کو سدھارتا ہے۔ بکر کا خیال تھا' ایسے لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ایک تو انہیں کارپوریشن کے ملازموں کو بھتہ دینا پڑتا ہے' دوسرے انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ بھاؤ کا خیال نہیں رکھتے اور ان کے نزدیک بس جیب کاٹنا ہی افضل ہوتا ہے — بہتر جگہ تو بڑی مارکیٹ ہی ہوتی ہے جہاں دکاندار کو اپنے نام اور بھرم کا پاس ہوتا ہے — ان دونوں کی یہ عادت بھی عجیب تھی کہ وہ جانتے تھے' کبھی ایک دوسرے کی بات دلیل سے قائل نہیں ہوں گے' بحث کے بنا پھر بھی نہیں رہتے تھے۔ آج بھی انہوں نے خوب بحث کی اور کسی نتیجے کا انتظار کیے بغیر ایک چھابے کے پاس جا رکے۔

انتخاب زید کا تھا لیکن دیکھ بکر بھی رہا تھا کہ ایک خان کچھ عرصے سے یہاں چھابا لگاتا تھا۔ یوں کہ مال اس نے سامنے چھابوں میں بھرا ہوتا لیکن گاہک کی پہچان ظالم کو ایسی تھی کہ دیکھتے ہی تاڑ جاتا کہ آنے والے کو پھل سامنے رکھے چھابے میں سے دینا ہے یا ان چھابوں کے نیچے چھپا کے رکھی ہوئی پیٹیوں میں سے نکالنا ہے۔ کچھ مال اس نے دور ایک ہوٹل میں بھی چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کیوں؟ کہتا تھا' اس میں اس کے مستقل گاہکوں کا مال ہوتا ہے' جو اسے منہ مانگے دام دیتے ہیں۔ کمی تو خیر زید کے پاس بھی کسی شے کی نہ تھی لیکن وہ شاید اس کا مستقل گاہک نہیں بنا تھا' اس لیے ان مخصوص پیٹیوں کا اسے ابھی حصہ دار نہیں بنایا گیا تھا۔

بات جو بھی تھی' زید کو دیکھتے ہی خان خود تو نہیں اٹھا' اس کا ملازم لڑکا دوڑتا چلا آیا۔ گاڑی کے دروازے کے پاس تھوڑا سا جھکا' گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کچھ کچھ ہنسا اور آنکھوں میں چمک اور لبوں پر ہنسی لاتے ہوئے بولا —

''سلام صاب۔ خان کہتا ہے بہت دنوں بعد آئے ہیں آپ ---؟''

زید نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ گاڑی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے سرکایا اور اس لڑکے کی طرف دیکھے بغیر کہنے لگا

''گرما ہے؟'' لڑکے نے جھکے جھکے ران کھجائی اور پیچھے آ کر رکنے والی دوسری گاڑی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی بہت۔ آپ کے لیے کتنے لاؤں'' دوسری گاڑی پھل خریدنے نہیں کسی اور وجہ سے رکی تھی۔ اس کا اندازہ تو اس لڑکے نے بھی لگا لیا تھا۔

''بس ایک ہی لے آؤ لیکن ہو پیلا' سبز بالکل نہیں۔ اور چھلکا پتلا ہو' سمجھے'' لڑکے نے جواب نہیں دیا۔ سیدھا ہوا' چھلانگ لگائی اور غائب ہو گیا۔ زید کیڈٹ کا ہوں نے اب اس کا تعاقب کیا کہ اس کا مطلوبہ دانہ وہ نکالتا کہاں سے ہے۔..... لیکن بکر نہ رہ سکا۔

''اسی لیے تو میں ان لوگوں کے پاس نہیں آتا۔ دیکھو تو کس بے شرمی سے کھجاتے ہیں اور اب اسی ہاتھ سے وہ گرما توڑے گا بھی اور تمہارے پاس لائے گا بھی۔ یار---'' لیکن زید نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔ فوراً بول اٹھا۔

''بھائی اس نے صرف کھجایا ہی ہے نا' یا کچھ گرے میں شامل بھی کر دیا ہے۔ بھائی میرے'' کھجلنے کی عادت میں تو ساری قوم مبتلا ہے' اس غریب بچے کا کیا قصور'' شاید وہ ابھی اپنی بات جاری رکھتا لیکن وہ لڑکا واپس آ گیا تھا اور اس نے ہاتھوں میں ایک بھاری بھرکم گرما اٹھا رکھا تھا........ زید نے اب گاڑی کا شیشہ پورا گرایا' گرما لے کر اپنے پاؤں میں رکھا اور بچے سے پوچھا۔

''کتنے پیسے ہوئے۔؟''

''خان کہتا ہے پورے چھ کلو ہے۔ بنتے تو ڈیڑھ سو ہیں' آپ ایک سو چالیس دے دیں---'' زید نے لڑکے کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی جیب سے ڈیڑھ سو کے نوٹ نکالے اور پہلی بار لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

Scanned by CamScanner

''پھر اور دس روپے لو، اور واپس لے آؤ [illegible]
[illegible] پیسے واپس لے لوں گا۔''

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بہت ہی پوچھ لیا کر

''میرے پیسے ہیں' تمہیں کیا۔'' ؟

''نہیں یار! اتنا عرصہ کام تو نہیں۔'' تو وہ کیا کرے گا۔ پھر اس نے سوچا' کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ چپ ہی رہے؟ آخر دونوں صورتوں میں اس کے مقدر میں چپ ہی تو لکھی ہے۔ ٹھنڈا ٹھار ہو کر اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور مارکیٹ کی طرف ہو لیے۔

زید کا کام تو ہو چکا تھا لیکن بکر کی خریداری ابھی باقی تھی۔ اس نے جب گاڑی مارکیٹ کی طرف موڑی تو زید پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''اب یہاں کیا کام ہے تمہارا؟'' بکر نے جواب تو دیا لیکن اس کے لہجے میں تھوڑی سی ہکلاہٹ تھی۔

''یار وہ تمہاری بھابھی نے گرما لانے کو کہا تھا......'' زید کو بات کچھ اچھی نہ لگی۔ گاڑی میں ہی رخ تھوڑا سا بدل کر اس نے کہا۔

''تم آدمی ہو یا کیا شے ہو۔ میں نے جو حرکت ابھی کی ہے' وہ تم بھی کر سکتے تھے۔ بلکہ بہتر کوالٹی کی شے خرید سکتے تھے۔'' زید کے لہجے میں ناراضگی تو نہیں البتہ تھوڑی بہت گرمی ضرور تھی...... بکر اس سے بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن اس نے سوچا' چھوڑو بھی۔ گرما ہی خریدنا ہے اس فرشتے سے فائدہ...... پہلے اس کا ارادہ تھا' گاڑی بند کر دے گا لیکن جب اس نے دیکھا کہ زید کا گاڑی سے باہر قدم نکالنے کا کوئی ارادہ نہیں تو اس نے

Scanned by CamScanner

اپنا ادا وہ بول دیا اور گاڑی اسٹارٹ رہنے دی۔ دروازہ کھول کر اترنے لگا تو زید نے اسے پکار لیا۔

”اب بھاؤ تاؤ میں کہیں رات نہ کر دینا۔“ لگتا تھا زید اس کی عادت سے واقف تھا اور قدرے بیزار بھی۔ بحث کی کرتا اسے نہ تو جھک کر ادا کرنے کی عادت، نہ ہی اس پر پیسے کا پڑتا۔

”جلدی کروں گا۔ گرمی بہت زیادہ ہے۔“ اس نے مسکرا کر زید کی طرف دیکھا۔

”فکر نہ کرو، میں گیا اور آیا۔ اور ہاں گاڑی اسٹارٹ ہے تاکہ اے سی چلتا رہے۔“ پھر باہر نکلا، دروازہ بند کیا، مسکرا کر ایک بار پھر زید کی طرف دیکھا اور پھل کی دکان پر جا کھڑا ہوا۔

اس دکاندار سے اس کی خاصی پرانی پہچان تھی۔ دراصل وہ خود بھی تو گاہکوں کی اس قسم میں تھا جو ایک بار جس دکان پر چڑھ گئے پھر وہاں سے اترنے کا نام نہیں لیتے۔ دکاندار بھی ایسے گاہکوں کو پھانسے رکھنے کا گر جانتے ہیں۔ ہر بار دو چار روپے چھوڑ دینے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اب یہ تو وہی جانتے ہیں کہ واقعی انہوں نے کوئی رعایت کی ہوتی ہے یا صرف اعلان پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور پھر اس نے پھل خرید نا بھی کتنا ہوتا تھا؟ کبھی کبھار وہ بھی کھینچ تان کر۔ اسے تو ہنسی ان ڈاکٹروں پر آتی تھی جو اپنے مریضوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ انڈے دودھ کا استعمال تو جاری رکھو لیکن تازہ تازہ پھل ضرور کھاؤ کر۔ اب یہ کوئی نہیں بتاتا کہ پھل خریدنے کے لیے پیسے کہاں سے لاؤ؟

دکاندار ابھی مصروف تھا۔ سلام دعا کا تبادلہ تو ہو گیا تھا لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی کہ ایک خاتون بھاؤ تاؤ میں مصروف تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی اپنی گاڑی میں سے اتری تھی لیکن جتنی دیر میں وہ زید کو مطمئن کر کے دکان تک آتا، خاتون کر مالٹو اکر فارغ ہو چکی تھی۔ دکاندار کہہ رہا تھا۔

Scanned by CamScanner

''بیگم صاحبہ ــــــ میں نے بھی آپ سے زیادہ پیسے لیے ہیں؟ پورے چھ کلو ہے۔ اور آپ کو الٹی بھی دیکھ لیں بلکہ آپ کہیں تو میں ابھی کاٹ کر آپ کو چکھا سکتا ہوں۔ اگر پھیکا ہوا تو اللہ قسم ایک پیسہ نہیں لوں گا۔'' بیگم صاحبہ گو گاڑی سے اتری تھیں بھلا وہ کیسے مان لیتیں۔

''جو آپ کہہ رہے ہیں سب ٹھیک ہے لیکن پیسے زیادہ لگا رہے ہیں''۔

''بیگم صاحبہ ــــــ بنتے ایک سو بیس ہیں' میں نے دس روپے چھوڑ دیے ہیں۔ زیادہ ہیں؟ حالانکہ اتنا عمدہ پکا ہوا' میٹھا گرما اور کہاں ملے گا؟''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن نہیں نہیں پیسے زیادہ ہیں۔ بس میں ایک سو دے دوں گی' وہ بھی تم کہہ رہے ہو ورنہ نوے سے ایک پیسہ زیادہ نہ دیتی ــــــ'' بکر سمجھ گیا کہ بیگم صاحبہ کا ایک سو سے زیادہ دینے کا ارادہ قطعاً نہیں۔ دکاندار بھی وصول اتنے ہی کرے گا لیکن فی الحال وہ اس کوشش میں ہے کہ بیگم صاحبہ کو اتنا تو قائل کر لے کہ وہ ان کے ساتھ خاص رعایت کر رہا ہے ــــــ بکر نے سوچا۔ وہ اگر انتظار کرتا رہا اور بیگم صاحبہ کا اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا تو ایک تو گاڑی میں بیٹھا زید جانے کیا سوچے اور دوسرے گاڑی کا اے سی چل چل کر کہیں ٹینک ہی خالی نہ کر دے ــــــ اسے یاد آیا' ابھی گذشتہ رات ہی بورڈ نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے پورے بیس پیسے فی لیٹر پٹرول کی قیمت میں رعایت دی تھی ــــــ اس نے خاتون اور دکاندار کو اسی تکرار میں چھوڑا اور خود دکاندار کی آنکھ بچا کر کھسک آیا۔ آخر باہر فٹ پاتھ پر بھی تو اتنے چھابے والے بیٹھے تھے' وہ ان سے ہی خرید سکتا تھا۔

بکر مارکیٹ کے برآمدے میں تھوڑا سا دائیں نکل گیا تا کہ دکاندار کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب دکاندار کی نظریں اس پر نہیں پڑ سکتیں تو اس نے خود ہی ٹھٹک کر ایک موٹا تازہ گرما اٹھایا' اسے گھما پھرا کر چاروں طرف سے دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ گلا سڑا نہیں

اس نے چھابے والے سے کہا۔

''اسے تولنا بھائی'' چھابہ فروش نے گرما اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔

ترازو پر رکھا اور تول بڑھاتے ہوئے بولا۔

''چھ کلو سے ذرا زیادہ ہی ہے' آپ چھ کلو کے پیسے دے دیں''۔ بکر نے گرما

لے لیا۔

''اور چھ کلو کے کتنے پیسے ہوئے؟''

''سولہ روپے کے حساب سے چھیانوے روپے'' دکان پر وہ تماشا دیکھ آیا تھا۔

پھر بھی اس کا جی چاہا ایک کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔

''کیا بات کر رہے ہو یار۔ چھیانوے روپے کی وجہ سے تو میں دکان پر چھوڑ آیا

ہوں۔ اتنی لیتے ہو'' دکاندار شاید تھکا ہوا تھا۔

''اتنی تو بہت کم ہیں جی۔ آپ سے آخری بات' بس پچاسی دے دیں''۔ اس

نے جیب سے پیسے نکالے اور دکاندار کے حوالے کر کے گاڑی کی طرف مڑا ہی تھا کہ وہ

خاتون بھی اسے جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ

کامیاب لوٹ رہی ہیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی' اب زید اس سے وزن اور

قیمت نہ پوچھ بیٹھے — فرق تو کوئی نہیں پڑتا تھا لیکن زید نے تاثر یہی دینا تھا جیسے وہ گرما

کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا لایا ہو۔ مختصر راستے سے ہوتے ہوئے اس نے گاڑی زید کے

گھر کے سامنے روکی۔ اسے اور اس کے گرے کو اتارا اور پھر گاڑی موڑ کر اپنے گھر کی

طرف ہو لیا۔ راستہ کوئی اتنا زیادہ تو نہیں تھا لیکن اس کے ذہن میں کھد بد مسلسل ہو رہی

تھی۔ زید نے گرما خریدا تھا ایک سو چالیس کا' وہ بیگم صاحب لے گئیں ایک سو روپے کا اور وہ

لے آیا تھا پچاسی روپے میں .... اب گرما ہی تو تھا' کوئی کپڑا تو تھا نہیں جس پر دکاندار

یہ کہہ سکتا کہ کوالٹی مختلف ہو گی ..... یا غیر ملکی اور ملکی میں اب فرق لوگ پہچان نہیں

Scanned by CamScanner

پاٹے .... یا

گھر کی طرف اس نے موڑ کاٹا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کوڑے کے ڈھیر کے پاس سے گذرنا اور یہ سوچ کر اپنا جی جلانا پڑا کہ کتنی بار وہ میونسپل کمیٹی سے کہہ چکا تھا کہ اس ڈھیر کا کچھ کریں اور نہیں تو کم از کم اسے ڈھانپ ہی دیں لیکن میونسپل کمیٹی والے بھلا اس کی بات پر کیوں توجہ دیتے کہ اعتراض کرنے والا وہی ایک تو تھا...... پل بھر کو اسے خیال آیا کہیں ہم بدبو کے عادی تو نہیں ہو گئے کہ سڑاند سے دماغ پھٹا جا رہا ہے لیکن جوں ہے کہ ہمارے کانوں پر رینگتی ہی نہیں۔ گذرتے ہوئے اس کی نظریں ڈھیر کی طرف بھی اٹھ گئیں۔

دو بچے کٹے ہوئے گرما کی پھانکیں اٹھائے دانتوں سے اس کے بچے کھچے سفید حصے کو کاٹنے اور کھانے کی کوشش میں ہنس ہنس کر نڈھال ہو رہے تھے۔

Scanned by CamScanner

اعجاز راہی

گمشدہ لمحوں کی تلاش

پتہ نہیں کیا ہوا اسے روشنی سے چڑ سی ہو گئی۔ روشنی طلوع ہونے سے پہلے جب وہ سیاہ شیشوں کے کاگل پہنتا تو سورج کے ڈوبنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں پر جمے رہتے۔ گاڑی چلاتے ہوئے کئی بار اور پیدل چلتے ہوئے بار بار کسی نہ کسی چیز سے ٹکرا جاتا۔ فٹ پاتھ پر کھلے منہ کے گٹر اور سڑک پر بنے سپیڈ بریکر اسے اور اس کی گاڑی کو بارہا امتحان میں ڈال چکے تھے۔ مگر پاؤں پر چڑھنے والا پلستر اور گاڑی کے اگلے حصے کا فریچر بھی اسے عینک اتارنے پر مجبور نہ کر سکا۔ اس کے اپنے (جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ دنیا میں کوئی کسی کا اپنا نہیں ہوتا) اسے سمجھا سمجھا کر اب مایوس ہو چکے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہوا اسے روشنی سے اتنی چڑ کیوں ہو گئی کہ روشنی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔

جب بھی وہ اس کا سبب پوچھتی تو وہ زوردار قہقہہ لگا کر کہتا باہر کی روشنی انسان کو اندھا کر دیتی ہے، مگر جب اس کی آنکھیں بند ہوں، تو آوازیں دھوکہ نہیں دے سکتیں ــــ جیسے تم ــــ تمہاری آواز سے تمہارے اندر کا آدمی بھی مجھ تک پہنچ جاتا ہے، جبکہ پہلے تمہارے چہرے کی روشنی مجھے تمہارے اندر جھانکنے سے روک لیتی تھی۔

وہ جواباً کہتی تم کبھی میری سمجھ کے چوکھٹے میں فٹ نہیں ہو سکے۔ فریم بڑا کرتی ہوں، تو تم چھوٹے رہ جاتے ہو، مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میں تمہیں چھوٹا ہوتا ہوا دیکھ ہی نہیں سکتی۔ فریم چھوٹا کرتی ہوں، تو تم فریم سے باہر نکل جاتے ہو۔

وہ پھر قہقہہ لگاتا۔ اصل میں تم مجھے اپنے فریم میں فٹ کرنا چاہتی ہو۔ یہ کب ہوا ہے، ہر شخص اپنے ہی فریم میں اچھا لگتا ہے، جیسے میں تمہیں تمہارے فریم میں ہی فٹ کر کے دیکھتا ہوں اور سنتا بھی ہوں بلکہ صرف سنتا ہی ہوں۔ دیکھتا ہوں تو تمہارے اور میرے

Scanned by CamScanner

درمیان وقت آجاتا ہے۔ میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی دوسرے کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔ تمہارے اور میرے درمیان ایک ربع صدی حائل ہے۔ وقت کو eliminate کرتا ہوں، تو تمہارے ساتھ خود اپنے فریم سے باہر نکل جاتا ہوں۔

وہ کہتی۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم چیزوں کو اس کے پرسپیکٹو میں رکھ کر نہیں دیکھتے۔ اپنی خواہشوں کے جزیرے آباد کرتے ہو تو پھر میں کب تمہارے فریم میں فٹ ہو سکتی ہوں۔ وقت کو کیسے منہا کیا جا سکتا ہے۔ وقت تو سرمست دریا کا وہ پانی ہے، جس کے سامنے خواہشوں کے بند کب ٹھہر سکے ہیں۔ تم غلط کہتے ہو، کہ تم مجھے میرے اپنے فریم میں رکھ کر دیکھتے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم میرے چہرے پر پھیلی روشنیوں میں خود کو تلاش کر لیتے۔۔۔! پھر میرے وجود کے قوس و قزح پر ان رنگوں کو دیکھ لیتے، جو تم نے بکھیرے ہیں۔

وہ پھر ہنستا ہے۔ مگر اس بار اس کی ہنسی میں آواز نہیں ہوتی۔ ''میں تو اب تک کچی دیوار پر کچے رنگوں سے اپنے وجود کا اوراک لکھتا رہا ہوں، بار بار یہی کرتا رہا ہوں اور ہر بار تمہاری نظروں میں پھیلا نئے جزیروں کی تلاش کے تجسس کا شاور سب کچھ دھو دیتا ہے۔ نشان تک مٹا دیتا ہے۔ تمہارے انگ انگ جھانکنے کے باوجود تمہارے وجود کی ایک ایک پور پیاسی اور متلاشی نظر آتی ہیں کہ تم تو اب تک بھری ہوئی رس بھری کی طرح ہو اور جانے کتنے جنموں کی پیاسی کہ نہ پیاس بجھتی ہے، نہ رکتی ہو۔

اس بار وہ قہقہہ لگاتی ہے۔ نہیں۔۔۔ یہ تو تمہارا وہ خوف ہے جسے تم زمانوں کا فرق کہتے ہو، اپنے اور میرے درمیان۔ میں تو سیر ہوں اور تمہاری ایک نظر سے بھر جاتی ہوں، بھرا ہوا میرا وجود شانت ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے کسی چیز کی طلب نہیں رہتی۔ یہ جسم جو ہے نا۔۔۔ بے مایہ ہے۔ اس کا سارا مول ایک نظر ہے۔ بھری ہوئی ایک نظر کافی ہوتی ہے۔

وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ سوچتا ہے اور گزرے لمحوں کو یاد کرتا ہے۔ اس رات کو یاد کرتا ہے، جو اسے روگ دے گئی تھی تو پھر ان بے شمار راتوں کو یاد کرتا ہے، جو بے شمار

روگ دے گئی تھیں۔ وہ جب یہ یاد کرتا ہے کہ اس رات کیا ہوا تھا تو وہ سب کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس رات نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ خود ہی سوچنے لگتا ہے کہ اس رات کیا نہیں ہوا تھا۔ جو اسے یاد تھا، وہ تو سب کچھ ہو گیا تھا۔

وہ رات گرم بھی تھی اور تکلیف دہ بھی...... ہوا جب رک جائے اور سورج جاتے جاتے اپنی ساری تمازت زمین پر بکھیر جائے تو رات خود بخود تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ اس کی تکلیف رات کے اس وقت سامنے آتی تھی جب گلی میں کسی نے پٹاخہ چھوڑا تھا اور وہ پٹاخہ اس پر بم کی طرح گرا تھا۔ شاید اس پر نہیں اس کے دل پر...... اور دل کے معاملوں میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب پھول پتھر بن کر لگتا ہے۔

"کیا محسوس کر رہے ہو......"۔

ہرے گاؤن، ہری ٹوپیاں اور سفید دستانے پہنے ہوئے اس کے ارد گرد کھڑے لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔ شاید وہ بڑا سرجن تھا۔

"پتہ نہیں......"۔

اس نے اپنی آواز کو سنبھالا دیتے ہوئے اپنی ڈوبتی ہوئی نظریں مانیٹر سکرین پر گاڑنے کی کوشش کی، جہاں اس کا دل ایک لوتھڑے کی طرح دھڑکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا، جیسے تڑپتا ہوا دل ان تیز روشنیوں کے سبب ہے، جو چھت کے قریب لگے ہوئے ملٹی پل سرچ سٹینڈ سے نکل کر اس پر پڑ رہی تھیں۔ وہ گھبرا سا گیا اور آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی، لیکن اسی لمحے ایک ہاتھ اس کے چہرے پر یوں لہرایا جیسے ماں اپنے بچے کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے گالوں پر پھیرتی ہے۔

"آنکھیں بند کیوں کر لیتے ہو۔ ہم تمہارے دل کے اندر تو نہیں جھانک رہے"

اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور اعصاب کو مجتمع اور خود کو زندوں میں شمار کرانے کے لیے اپنے چہرے پر بھی نیم زندہ سی مسکراہٹ سجانے کی کوشش کرنے لگا۔

Scanned by CamScanner

"روشنیاں میرے اندر اتر رہی ہیں......"

وہ بے آواز ہنسنے لگی۔ شاید اس کی بات اسے اچھی لگی تھی۔

"روشنیوں کا تو سارا کھیل ہے"۔ اس نے اس کے کان میں کہا۔

"کیا تمہیں روشنی اچھی نہیں لگتی......"

یہ ہرے رنگ کے کپڑوں میں لپٹی اور ہرے رنگ کی ٹوپی پہنے ہوئے لڑکی کون ہے۔ میں کہاں ہوں...... یہ سب کیا ہے۔ اس نے خود سے سوال کیے کہ اب اس کی آواز شاید دم توڑنے لگی تھی۔

تو اس رات وہ کیا تھا، جو نہیں ہوا تھا۔ وہ جب بھی یاد کرتا ہے کہ اس رات کیا ہوا تھا تو اسے وہ سب کچھ یاد آنے لگتا ہے، جو نہیں ہوا تھا۔ یا شاید ہو گیا تھا۔ اس ایک رات اور ایک دن میں، جو اس کی زندگی کی کریڈٹ بک میں درج نہیں ہوئے تھے۔ پھر خود ہی سوال کرتا، کیا نہیں ہوا تھا اور اگر کچھ نہیں ہوا تھا تو پھر ڈاکٹروں کی یہ ٹیم کیا تلاش کر رہی ہے، سرچ لائیٹوں کی روشنی میں......؟ کیا کسی نے اس کی شریانوں میں مائنز دبا دیے ہیں جو بروقت تلاش نہ کیے گئے تو بلاسٹ...... اف ایک آگ سی اس کے اندر دوڑ گئی تھی۔ اس نے مانیٹر کی طرف دیکھا دل یوں تڑپنے لگا تھا جیسے مرغ ذبح ہونے کے بعد تڑپتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی لمحے اسے ایک ہاتھ اپنی گردن سے قدرے اوپر اور جبڑے کے نشیب میں محسوس ہوا، جیسے کوئی اس کی شہ رگ سے زندگی کی تصدیق چاہتا ہو۔ اس نے ایک لمبا سانس لینے کی کوشش کی اور سانس کہیں درمیان میں ہی ٹوٹ گیا، پھر مختلف آوازیں ابھریں اور اس کے اندر جلتی ہوئی آگ پر جیسے کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ کچھ آوازیں اس کے کان کے قریب بھی تھیں۔ شاید کوئی نسوانی آواز اسے پکار رہی تھی۔ شاید وہ آواز کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ تیز روشنیوں کے اس جنگل سے جہاں ایک اونچی جگہ پر رکھے ہوئے مانیٹر سکرین پر سب لوگ دل کے تڑپنے کا نظارہ کر رہے تھے وہ تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اس رات کیا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک [illegible] کی کوشش [illegible]

Scanned by CamScanner

ڈاکٹروں کو کسی چیز کی تلاش تھی یا پھر انہیں اس کی تلاش تھی جو ہو گیا تھا، لیکن اس نے تو سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا۔

''تمہارے دل کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم تو خود ہارٹ اٹیک ہو اور کئی دلوں کی دھڑکنیں چھینتے رہے ہو۔ تمہارے پاس دل ہے کہاں کہ اسے کچھ ہو گا''۔

وہ ہنس دیا تھا۔ اس کی باتیں وہ کبھی سیریس نہیں لیتا تھا۔ اسے تو بس لڑنا اور طنز کرنا آتا تھا، سو وہ اس کے ساتھ یہی کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ کچھ ہوا ضرور تھا، کچھ یاد تھا، کچھ اس کو یاد نہیں تھا اور جو یاد نہیں تھا وہ اس کی زندگی کی کریڈٹ بک سے بھی خارج تھا۔ جو اسے یاد تھا وہ بہت واضح تھا۔ کیا نہیں ہوا تھا وہ کوشش کرتا ہے، سوچتا ہے شاید ڈاکٹروں کی ٹیم بھی وہی تلاش کر رہی تھی جو ہو گیا تھا اور اسے اب تک یاد تھا۔

شام کو گلی میں کسی بچے نے پٹاخہ چلایا تھا اور پٹاخے کی تیز آواز اس کے دل پر چل گئی تھی، مگر وہ حیران تھا کہ جس کی زندگی تیز آوازوں میں گزر رہی ہو، ایک پٹاخہ کیوں کر اتھری پھیلا گیا تھا۔ شاید پہلے سے کچھ ہو دل کے اندر...... اور پٹاخے کی آواز محض مہمیز لگا گئی۔ پھر وہ سو گیا تھا اور جب دوبارہ آنکھ کھلی تو رات کے ۲ بج رہے تھے۔ سب لوگ ایر کنڈیشن لگے ڈرائنگ روم میں بے خبر سو رہے تھے۔ ہر طرف ایک خاموشی تھی، سوائے گھڑی کی ٹک ٹک کے...... یا شاید گھڑی بھی چپ تھی، یہ ٹک ٹک اس کے اندر ہی کہیں بج رہی تھی۔

''تم ٹھیک ہو ڈاکٹر......''

بڑے سرجن نے اس کے چہرے کے قریب آتے ہوئے آہستگی سے سوال کیا۔

''یہ ٹک ٹک کیسی ہے''

''ٹک ٹک......'' اس نے حیرت سے دیکھا اور پھر جلدی سے ساتھی سے کہنے لگا۔ ''ریلیف دو''۔

ٹک ٹک پھر بھی سنائی دیتی رہی مگر جسم میں ایک شانت سا آ گیا تھا۔ اس نے

Scanned by CamScanner

ٹک ٹک کی آواز کو سننے کی کوشش کی اور جب پہلی بار سنائی دینے والی ٹک ٹک کو یاد کرنے کی کوشش کی تو سارا منظر اس کی بند آنکھوں میں بھر گیا۔ اس کے کپڑے پسینے سے یوں بھیگ گئے تھے جیسے اس کا پورا وجود کسی موسلا دھار بارش کی زد میں ہو۔ وہ جب کھڑا ہوا تو اس کے اندر ایک آگ لگی ہوئی تھی اور سر کسی نوزائیدہ بچے کی طرح ایک طرف ڈھلک رہا تھا۔ وہ بمشکل اٹھ کر صوفے تک آیا اور چند ساعتوں تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کے سینے میں ایک تندور دہک رہا تھا۔ جس کے سیک میں اس کا پورا وجود جلنے لگا تھا۔ اس نے فریج سے میوکین کے چند قطرے منہ میں ڈالے اور اسے یوں لگا جیسے اس نے جلتی پر تیل ڈال دیا ہو۔ اب پسینہ اس کے بالوں سے نکل کر ٹپ ٹپ یوں گرنے لگا جیسے شاور میں رکے ہوئے پانی کے قطرے بند کرنے کے باوجود گرنے لگیں۔

اچانک وہی تندور جیسی آگ سینے میں بھڑک اٹھی تھی۔ سرجن اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ نظر نہیں آ رہے تھے، مگر ان کی نظریں مانیٹر سکرین تھیں۔ اس نے سکرین کی طرف دیکھنے کی کوشش کی جہاں گوشت کا ایک لوتھڑا بے چین ہو کر بے ترتیب انداز میں تڑپ رہا تھا۔

''اُف ....''

شاید اس کے منہ سے آواز نکل گئی تھی۔ بڑا سرجن فوراً اس کے چہرے کی طرف آیا "few seconds" .... صرف چند سیکنڈ ....''

''میں جلنے لگا ہوں۔ برداشت نہیں ....''

''ریلیف دو ....''

پھر ایک سکون سا آ گیا۔ مگر اسی لمحے اسے وہ آگ یاد آ گئی، جو اس رات لگی تھی۔ جو میوکین کے بعد اینو سے بھی بھڑکتی جوالہ بن گئی تھی۔ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا اور ابھی وہ آگ میں جل رہا تھا کہ اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کا دل جل رہا ہو، جس نے سارے وجود کو بھڑکا دیا تھا۔ اور پھر اس کے اندر ایک جنگ چھڑ گئی تھی۔ کوئی اسے

Scanned by CamScanner

مسلسل اندھیروں کی طرف کھنچ رہا تھا اور وہ خود کو بچانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اسی جدوجہد میں اس کا ہاتھ کال بیل تک گیا، جس کی گھنٹی اوپر کی منزل پر تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کا بڑا بیٹا اس کے سامنے تھا۔ اسے اب یاد نہیں اس نے بیٹے سے کیا کہا تھا۔ مگر جو بات اسے یاد رہ گئی تھی وہ یہ تھی کہ بیٹا وقت بہت کم ہے اور جب وہ نہایت نگہداشت وارڈ کے بیڈ پر تھا تو اس کے چاروں طرف بے پناہ شور تھا۔ اتنا شور کہ اس سے وہ کبھی نہ گزرا تھا۔ اس کے دونوں بیٹوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس نے ڈوبتی نظر سے دیکھا کہ اس کے بیٹے اس کے ماتھے کو چوم رہے ہیں، شور تیز ہو گیا تھا۔ اچانک اس شور میں ڈاکٹر کی آواز سنائی دی پھر وہ باہر نکل گئے یا نکال دیے گئے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔

"ایس کے لاؤ.......... ایس کے"

اور "ایس کے لاؤ" کا شور اتنا بڑا کہ اس میں ساری آوازیں ڈوبنے لگیں اور پھر وہ بھی آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا اور اتنا نشیب میں اترتا گیا کہ رفتہ رفتہ شور دور ہونے لگا اور پھر ختم گیا۔ کہ سارا شور تو خود اس کے اندر کا تھا، شور تھما تو شاید اس کے دل کی حرکت بھی ختم ہو چکی تھی اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو ایک رات اور ایک دن اس کی زندگی سے جست لگا کر آگے بڑھ چکے تھے۔ اسے وہ تو یاد تھا جو ہوا تھا اور جو اس دوران ہو گیا تھا، اس کا حساب اس کے پاس نہیں تھا۔

"ڈاکٹر.......... ڈاکٹر.........."

کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اس نے بمشکل تمام آنکھیں کھولیں، اس کی نظریں سکرین پر پڑیں۔ سرجن اس پر جھکا ہوا تھا۔

"تم ٹھیک ہو.........."

"کون.........." شاید اس کی اپنی آواز تھی۔

"تم بھی.......... کیا محسوس کر رہے ہو.........."

"پتہ نہیں" اس نے ڈوبتی آواز میں کہا تھا۔

Scanned by CamScanner

"wind up، آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے"۔

شاید سرجن نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دی تھی۔ مگر اب اس کی سماعت آوازوں کی متحمل نہ رہی تھی۔ ایک تکلیف بھرا سکون رفتہ رفتہ اس کے اعصاب پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا، جیسے اس کی رگوں میں کوئی ایسی چیز دوڑ رہی ہے جس کا وہ عادی نہیں تھا۔ شاید چیونٹیاں اس کی رگوں میں گھس آئی تھیں جو ایک ناخوشگوار انداز سے چہل کر رہی تھیں۔ اس نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے اپنے پیروں کے قریب کھڑے ہوئے ایک نوجوان سرجن کو دیکھا، جو اس کے بیلون کو گائیڈ کرنے کے لیے مین آرٹریز میں جو تار ڈالی گئی تھی، باہر کھینچ رہا تھا مگر باہر آنے والی تار اپنے پیچھے بند شریانوں میں سٹنٹ چھوڑ آئی تھی جواب خون کے بہاؤ میں سرنگ کا کام دیں گی۔ وہ سوچنا چاہتا تھا مگر سوچ اس کے ساتھ ہی اعصاب کی موج بن کر رہ گئی تھی اسے آپریشن تھیٹر سے آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ کہاں ہے۔ اس نے پہلی بار اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی مگر اس کی ڈوبتی آنکھوں میں سوائے ہرے ہرے گاؤنز کے کچھ بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بڑے سرجن کی "congratulation" کی آواز بھی اس کے ساتھ ڈوب رہی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اس کے گالوں کو تھپتھپا رہا ہے۔ شاید کوئی اس سے زندگی کا ثبوت مانگ رہا تھا، اس کے پاس زندگی کہاں رہی تھی جو پکار سکتی۔

"میں ہوں نا...... زندگی ہوں۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ بھری پری زندگی......"

"تم زندگی کہاں ہو۔ زندگی تو اس ایک رات اور ایک دن نے چرا لی ہے جو مجھ پر گزر گئے تھے۔ روشنی بھی چھن گئی تھی اور آوازیں بھی...... پھر اس کے بعد تو ایک خوف ہے جو چاروں اور گھیرے ہوئے ہے...... اور بس......"۔

"you are a brave man" بڑے سرجن نے ایک لمبی سی تار جو اس نے مین آرٹری سے کھینچی تھی، نرس کو دیتے اور اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "بس آج کا کام ختم ہو گیا۔ تھوڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔ زندگی کے لیے تو ہونا ہی چاہیے...... ہوتا ہے نا"۔

Scanned by CamScanner

سرجن مسکرایا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوسری طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی دوسرے ڈاکٹر بھی چلے گئے۔ مانیٹر سکرین خاموش ہو چکی تھی اور شاید وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ مگر خاموشی اور آوازوں کے درمیان اس نے محسوس کیا تھا، جیسے اس کی ران کے اس حصے میں جہاں سے ڈاکٹروں نے اس کی آرٹریز میں کیمرہ داخل کیا تھا، اس خون کے فوارے کو بینڈج کیا جا رہا تھا۔

''تم میں کتنا خون ہے جو قابو میں نہیں آ رہا تھا''

دوسری صبح بڑی سسٹر ڈیانے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا تھا اور وہ جواباً مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ اب تک اس کے ہسپتال کے کپڑوں پر خوب پھیلا ہوا تھا۔

''روشنی جلا دوں؟''

''جی نہیں.......... اندھیرا ٹھیک ہے..........''

''روشنی سے ڈرتے ہو..........''

''روشنی سے نہیں، اس کی چبھن سے۔ دل کو جلا دیتی ہے......''

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور دوسرے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔

''تم ہمیشہ سے خوفزدہ ہو۔ کیا ان کالے چشموں سے اس روشنی سے بچ سکو گے جو سیاہی کو چیرتی ہوئی تمہارے اعصاب میں اترتی رہے گی''۔

''میں کب روشنی سے ڈرتا ہوں۔ میں تو اپنے آپ سے ڈرتا ہوں۔ یہ روشنی جو ہے نا، رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو ہیمبرز لگا دیتی ہے اور وہ جو ہے نا جو میرے اندر ہے، بے قابو ہو جاتا ہے۔ اور اتنا بے قابو ہوتا ہے کہ دھڑکنا بند کر دیتا ہے۔ مجھ سے ایک دن اور ایک رات چھین کر لے گیا ہے۔ میری زندگی کی کریڈٹ بک کے یہ صفحات سفید رہ گئے ہیں۔ کچھ بھی درج نہیں ہے ان پر۔ کون دے گا حساب ان کا۔ کون...... تم......''۔

وہ اس کے سوال سن کر خود کو جواب دیتا ہے اور وہ سوالوں کے جواب مانگتی ہے۔ اور وہ سوچتا ہے کہ اس رات کیا ہوا تھا، جو ہوا تھا، اسے یاد تھا، جو نہیں ہوا تھا، وہ کیا

Scanned by CamScanner

تھا۔ اس کے پاس اس کا جواب نہیں تھا کہ اس کا جواب تو ان صفحوں پر ہونا چاہیے تھا جو محض سفید رہ گئے تھے۔

وہ ان سفید صفحوں کو دیکھتا اور سوچتا اور جب کچھ نظر نہ آتا تو سیاہ شیشوں کی کاگل آنکھوں پر چڑھا لیتا، کہ اس کی زندگی کے یہ صفحے کاگل اتارنے پر بھی نظر نہیں آتے تھے۔

اس نے سوچا، ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

Scanned by CamScanner

احمد جاوید

تتلی

بھاگتے پھرنا ہی اس کا کام تھا — دن ہوتا تو تتلیاں ہوتیں شام ہوتی تو جگنو۔

تتلی چونکہ مٹھی میں سماتی نہیں تھی اسی لیے چٹکیوں میں لیتی۔ کچھ دیر جھلاتی پھرتی پھر کسی پھول پہ اسی طرح رکھ دیتی جیسے اسے اٹھایا ہوتا۔ جگنوؤں سے اس کی دوستی البتہ اور طرح کی تھی۔ یوں ہی ہاتھ بڑھا کر کسی ایک کو اپنی ہتھیلی پر لے لیتی۔ پھر دوسرے ہاتھ سے اس پر اوٹ کرتی۔ اور جھانک جھانک دیکھتی ایسے کہ جیسے کوئی قیمتی موتی ہاتھ آ گیا ہو۔

میں اسے پنکھ پھیلا کر آتے اور کیاریوں میں داخل ہوتے اکثر دیکھتا۔ دیکھتا اور اپنا کام بھول جاتا۔

میں اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اصل میں اس کا کوئی نام تھا ہی نہیں۔ جب اس کا کوئی نام نہیں تھا تو میں بھلا کیسے جان لیتا۔ مگر کیا کوئی آدمی نام کے بغیر بھی ہوا ہے۔ ہاں وہ تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کی ماں اس کا نام رکھنا بھول گئی تھی۔

جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کے گھر کی چھت گر گئی۔ ایک بھائی تھا ملبے تلے دب کر ہلاک ہوا۔ گھر میں ہلاکت ہوئی تو کہرام مچ گیا۔ مہینوں کسی کو سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ بھلا ایسے میں کسے ہوش تھی۔ کون اس کا نام رکھتا؟

چونکہ اس کا کوئی نام نہیں تھا لہذا جس کا جو جی میں آتا پکار لیتا۔ ہر روز ایک نیا نام ہوتا۔ سو وہ کہ جس کا کوئی نام نہیں تھا کتنے ہی اس کے نام ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ خود اس نے بھی اپنے کئی نام رکھ لیے۔ دن ہوتا تو خود کو تتلی کہتی۔ رات ہوتی تو جگنو۔ اور پھر ہنستی۔

اس کا گھر ہماری گلی میں نہیں تھا۔ سچ پوچھو تو اس کا گھر کسی بھی گلی میں نہیں تھا۔ ہم جس آبادی میں رہتے تھے وہاں ایک خالی قطعہ زمین پر کچھ مزدور پیشہ جھونپڑیاں ڈال کر رہتے تھے بس اسی میں ایک [illegible]

Scanned by CamScanner

جیسے اس کی کوئی گلی نہیں تھی اور اس کا نام نہیں تھا ایسے ہی اس کے سپرد کوئی کام بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں کسی نہ کسی کام سے اسے صدائیں دیتی رہتی مگر وہ طرح دے جاتی۔ اسے کاموں سے کیا غرض تھی۔ ایک عمر میں تتلیوں اور جگنوؤں کے پیچھے بھاگتے پھرنے کے علاوہ بھی کوئی کام ہوا ہے؟

ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہاں گھروں کے اندر پھولوں کی رنگا رنگ کیاریاں تھیں اور گھروں کے باہر چھوٹے بڑے خوشنما سبزہ زار تھے۔ یہ سب میرے دیکھنے کے لیے بھی تھا مگر مجھے ان کے درمیان ہونے کا بہت کم موقع ملتا۔ میرے باپ نے میرے لیے ایک منزل متعین کی تھی مجھے اس کی طرف ہمہ وقت گامزن رہنا تھا۔ صبح ہوتی تو سکول کے لیے روانہ ہونا لازم تھا۔ شام ہوتی تو گھر کے لیے ملا ڈھیروں کام نمٹانے کی دردسری ہوتی۔ جب میں سکول کے لیے نکلتا اور اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے باہر جھانک کر اسے دیکھتا تو دکھ سے سوچتا کہ مجھے ایسی فرصت کیوں میسر نہیں۔ مگر کیا کرتا کسی کسی کو عمر بھر ایسی فرصت نہیں ملتی کہ وہ پھولوں اور تتلیوں اور جگنوؤں کے درمیان بسر کر سکے۔

پھولوں اور تتلیوں کا زمانہ بہت دیر قیام نہیں کرتا۔ عمر کو نکلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ وقت بدلتا ہے تو آدمی اور کا اور ہو جاتا ہے۔

میں ابھی اور کا اور نہیں ہوا تھا۔ عمر بھی ابھی کہاں نکلی تھی۔ وہی ایک متعین منزل تھی جس کا حصول ابھی باقی تھا۔ ہاں شہر ضرور بدل گیا تھا۔ گھر کی جگہ ہاسٹل تھا۔ معمول اب بھی وہی تھا۔ صبح ہوتی تو یونیورسٹی کے لیے نکلتا۔ دن بھر لائبریریوں کی خاک چھانتا۔ رات بھی پڑھنے لکھنے میں سر کھپاتا۔ ستانے کو کچھ دیر باقی تھی۔ تتلیاں اور جگنو ابھی میرا مقدر نہیں تھا۔

تھک کر بیٹھ جانے کا ابھی وقت تو نہیں تھا مگر آدمی خود کو لاکھ روکے کہیں کوئی سایہ دار پیڑ آ جائے تو بیٹھ ہی جاتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ منزل بدلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

Scanned by CamScanner

یونیورسٹی کی نیم تاریک راہداریوں میں چلتے پھرتے میں نے کسی کو ہنستے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے معمول فراموش ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو کوئی آنچل لہرایا جیسے تتلی نے اپنے رنگین پر کھولے ہوں۔ میرے ہاتھوں سے کتابیں اچھل کر نیچے جا گریں۔ جب میں کتابیں اٹھانے کو جھکا بیٹھا سر اٹھائے اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا تو وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ ایسے جیسے اوس سے بھیگے پتوں پر کوئی جگنو جل بجھ رہا ہو۔

وہ جو تتلی کی طرح تھی اس کے رنگین پر ایک دن میری چٹکی میں آ گئے۔ مجھے اپنی قسمت پہ ناز تھا۔ منزل کو فراموش ہوئی۔ مگر اب منزل کی کسے ہوش تھی۔ پھولوں سے بھری کیاریوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے شام ہو جاتی۔

''اس دن تمہیں کیا ہو گیا تھا۔ کتابیں اچھل کر دور کیوں جا پڑی تھیں۔؟'' بہت دنوں بعد جب اس کی قربت حاصل ہوئی تو وہ میری بدحواسی کو یاد کر کے ہنس پڑی۔

''تمہاری ہنسی پر مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔''

''کون یاد آ گیا تھا......'' وہ روٹھ گئی۔

''کوئی بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں......'' میں اس کے روٹھنے پر بدحواس ہو گیا۔

''کوئی تو تھا...... کوئی تو ہو گا۔'' حسد لاحق ہو جائے تو وہ کب جان چھوڑتا ہے۔

''کچھ بھی نہیں تھا...... بس ایسا لگا تھا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو......''

وہ مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ اکثر پوچھتی رہتی تھی۔ اصرار کرتی رہتی تھی۔ مگر صرف اس وقت جب وہ ہنستی ہوتی۔ جب وہ ہنستی ہوتی تو اسے میری آنکھوں میں کوئی اور ہی منظر دکھائی دیتا۔ کوئی بہت ہی اجنبی منظر پھر وہ ہنستے ہنستے رک جاتی۔ مجھے حیرت سے دیکھتی۔

''بتاؤ نا......؟''

میں اسے کیسے یقین دلاتا مجھے کچھ یاد نہیں آتا بس ویسے ہی کچھ بہت مانوس سا لگتا ہے۔ میرا دھرم اگر ہندوانہ طرز پہ ہوتا تو اسے باور کرا سکتا کہ شاید کوئی پچھلے جنم کی بات ہے۔

Scanned by CamScanner

وہ یاد جو کہیں ذات کے نہاں خانے پہ نقش ہوتی ہے وقت اس پر اپنی دھول ڈال دیتا ہے — مٹا دیتا ہے — مگر جو بے چینی دل میں رکھ دیتا ہے وہ تو کسی نہ کسی صورت ہمکتی رہتی ہے۔ مگر بس صرف بے چینی ہوتی ہے یاد کچھ بھی نہیں آتا..... اسے دیکھ کر ایک ہی بے چینی ہوتی تھی — گرد و پیش ہی نہیں اپنا آپ بھی فراموش ہو جاتا۔ آنکھوں کے آگے بس ایک تتلی سی اڑتی پھرتی۔

خود فراموشی کے دن تھوڑے تھے۔ میں نے پھولوں کی کیاریوں کی اوٹ میں اس کے ہمراہ بیٹھے بیٹھے موسموں کے گزرنے کی چاپ نہیں سنی..... بہت برا ہوا — اتنے دن نکل گئے — امتحان سر پہ آ گیا۔ وہ منزل یاد آ گئی جس کا تصور مجھے اپنے شہر سے لے کے چلا تھا۔ زندگی کی رنگینیوں کا دریا سراب ہو گیا۔ میں اس کا اڑتا آنچل چھوڑ کتابیں اٹھا گھر لوٹ آیا۔ بدحواسی نے رکنے نہ دیا۔ تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت تھی۔ یہ ایک ہی بے چینی تھی۔

یہ بس اسی زمانے کے ساتھ ہے کہ بدحواسی اور عجلت زیادہ دیر ستانے نہیں دیتے۔ کسی منزل کے حصول کی خواہش ہر کسی کو اڑائے پھرتی ہے۔ میری صبحیں اور میری شامیں ایک دفعہ پھر کسی منزل کی اسیر ہوئیں۔ میں کتابیں لے کر صبح ہوتے ہی گھر کے لان میں آ بیٹھتا اور پھر سہ پہر ڈھلنے تک بیٹھا رہتا۔

میں بیٹھا رہتا مگر میرے ارد گرد وہ رنگین آنچل لہراتا رہتا جسے میں یونیورسٹی کی نیم تاریک راہداریوں میں چھوڑ آیا تھا۔ جب بے چینی دل میں گھر کرتی تو اٹھ کر گھر سے باہر سڑک پہ آ کھڑا ہوتا۔ آدمیوں اور گاڑیوں اور سائیکلوں کو دیکھتا رہتا۔ اس کے دھیان سے نجات کی بس یہی ایک صورت تھی۔

ہجوم کو دیکھتے رہنے میں میں نے اسے ایک روز پھر دیکھ لیا۔ وہی کہ جسے دن میں تتلیاں اچھی لگتی تھیں اور رات میں جگنو — اتنا عرصہ ہوا اسے تو میں بھلا ہی بیٹھا تھا..... کیا اسے یاد رکھنا ضروری تھا؟..... اگر ضروری بھی تھا تب بھی اب وہ ویسی نہ تھی جیسی ہوا

کرتی تھی ـــ یا جیسا اسے اب ہونا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس تھا کہ اب اسے دیکھنے یا اس پر رشک کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ نہ آنکھوں میں شرارت، نہ ہونٹوں پہ ہنسی، اب تو جیسے اس کی فراغت بھی کہیں رخصت ہو گئی تھی اور کوئی کام آ پڑا تھا۔

جنہیں کوئی کام آ پڑے ان کا ڈھنگ بھی بدل جاتا ہے۔ وہ بھی اب اور طرح کی ہو گئی تھی مگر برا احوال تھا اس کا۔ میلے چکٹ کپڑوں اور الجھے ہوئے بے ترتیب بالوں کے ساتھ وہ ایک گلی سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں داخل ہونے کے عمل میں مبتلا رہتی اور گھروں میں داخل ہوتی نکلتی۔ میں فرصت سے ہوتا تو کھڑا اسے دیکھتا ..... میں اسے دیکھتا اور حیران ہوتا کہ اس کے اندر جو ایک تتلیوں سے بھری پھولوں کی کیاری تھی وہ کیسے کملا گئی ــــ اب تو ایک ملگجا سا پژمردہ دن تھا۔ بس ویسا ہی جیسا جاڑے کی سہ پہروں میں ہو جاتا ہے جب آسمان بادلوں سے بھر جائے .....

مجھے کبھی کبھی خواہش ہوتی تھی کہ عمر کی وہ ننھی سی گھڑی ایک مرتبہ پھر لوٹ آئے۔ وہ میرے سامنے آئے۔ اپنی بند مٹھی میری آنکھوں کے سامنے ..... کھولے اور ہنس پڑے ــــ کوئی کھلکھلاتی ہوئی ہنسی سنے بہت عرصہ گذر گیا تھا۔

مٹھی تو اب بھی اس کی بند رہتی تھی جسے وہ اپنی بغلوں میں چھپائے رکھتی جیسے کوئی قیمتی متاع اس میں چھپی ہو مگر وہ اسے کھولتی نہیں تھی۔

وہ بند مٹھی کو بغلوں میں دبائے جدھر سے بھی گذرتی، اوباش لڑکوں کی سیٹیاں ا سکے ہمراہ ہوتیں، اس پر عمر جو ایک ایسی آ بیٹھی تھی۔ اور وہ جو اس کی عمر کی کشش میں تھے ۔اشارہ کرتے ..... بلاتے .....

اوباش لڑکوں کا اجتماع پڑوس کے کسی گھر میں ہوتا تھا۔ وہ ادھر سے گذرتی تو جیسے طرح دے جاتی مگر وہ کرنسی نوٹ لہراتے سامنے آ کھڑے ہوتے ..... اسے اس کی ماں یاد دلاتے جسے لقوہ مار گیا تھا اور زندگی کا سہل راستہ بتاتے۔ مگر سہل راستے میں دلدل تھی۔ میں اسے دلدل سے بچ کر چلتے ..... لڑکھڑاتے اور سنبھل جاتے، دیکھا کرتا ..... مگر جب

Scanned by CamScanner

فراغت سے ہوتا۔

ان بیزار کن دنوں میں جب لکھنے پڑھنے میں جی نہیں لگتا تھا اور اس کا خیال جسے میں پیچھے کہیں چھوڑ آیا تھا ریشم کے دھاگے کی طرح میرے وجود سے لپٹا رہتا اس میلی کچیلی لڑکی کو دیکھنے اور اس کے بارے میں متفکر رہنے میں کیا حرج تھا...... دھیان بٹانے کی ایک سبیل بھی تو تھی مگر ایک روز ایک خط موصول ہوا۔

''لوٹ آؤ......... ورنہ تاخیر ہو جائے گی......''

بیزاری کے دن یکلخت ختم ہوئے...... ایک اور طرح کی بدحواسی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اب جست بھرنے میں وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں کسی اڑتے آنچل کی خوشبو تھی۔ گرد و پیش کی ہر چیز معدوم ہونے لگی۔

شام ابھی سنولائی نہ تھی بس دن بجھ گیا تھا۔ جب میں نے کتابیں سمیٹیں، بیگ کاندھے سے لٹکایا، گھر کو الوداع کہا اور باہر سڑک پر کسی سواری کے انتظار میں آ کھڑا ہوا۔ باہر سبزہ زار سے تتلیاں ابھی رخصت نہ ہوئی تھیں مگر اوس کے مارے پودوں میں کہیں کہیں کوئی جگنو سا جگمگانے لگا تھا...... مگر مجھے ان منظروں سے کوئی غرض نہ تھی پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی تھی۔

گھروں کے درمیان سے گذرنے والی سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں ہوتی مگر مجھے جلد ہی سواری مل گئی۔ اب مجھے بیٹھنا تھا اور نکل لینا تھا...... مگر اچانک اس میلی کچیلی لڑکی کو عجب وحشت میں دیکھا، وہی جو اپنی مٹھی بند رکھتی تھی...... دیکھا اور تھم گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں اس گھر سے نکلی تھی جہاں اوباشوں کا اجتماع رہتا تھا۔ دوپٹہ کاندھے سے لڑھک گیا تھا۔ ایک بازو سے پھٹی ہوئی قمیض کا چیتھڑا لٹک رہا تھا...... میں حیران تھا اسے کیا ہوا؟

وہ اپنے بکھرے ہوئے احوال سے بے نیاز سرپٹ بھاگے چلی جا رہی تھی...... شاید گھر پہنچ جانا چاہتی تھی...... وہ پہنچ گئی ہوتی مگر مخالف سمت سے آنے والی گاڑی نے

اسے نکلنے نہ دیا —— بچاتے بچاتے الٹ ہی دیا —— وہ اچھلی —— فضا میں لہرائی —— اور ایک دیوار سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو گئی —— سناٹا سا ہو گیا۔

ایک لمحے کو یوں ہوا جیسے کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی ہو —— پھر کہیں بہت دیر بعد واپسی کے سفر پر جاتے پرندوں نے آسمان پر شور کیا تو نیچے ایک ہجوم بن گیا۔ لوگ چاروں طرف سے آ آ کر اس کے گرد اکٹھا ہو گئے تھے۔ ہجوم میں ہر کوئی اس کی سانسیں تلاش کر رہا تھا جو اب شاید باقی نہیں رہی تھیں —— آنا فانا ہوا ہو گئی تھیں۔

وہ بکھری ہوئی پڑی تھی، صرف ایک بھنچا ہوا ہاتھ بغل میں تھا —— جانے اس کی مٹھی میں کیا ہے؟ —— بھیڑ میں سے کسی کو تشویش تھی ایسے کہ جیسے وہ کچھ کہیں سے لے کر بھاگی ہو —— جانے اس کی مٹھی میں کیا ہے؟ —— تھوڑی دیر میں ہر ایک کو یہ تشویش تھی —— تشویش تو مجھے بھی تھی مگر خیال کیا —— تتلی ہو گی یا جگنو

اس کے ڈھیلے پڑے ہوئے جسم میں مٹھی کی گرفت بڑی سخت تھی —— کھولنے والے کو بڑی جد و جہد کرنا پڑی —— مگر پھر ایک ایک کر کے انگلیاں کھل گئیں —— انگلیاں تو کھل گئیں مگر بھنچے ہوئے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہ تھا، بس چند مڑے تڑے کرنسی نوٹ تھے —— مجھے افسوس ہوا —— نہ تتلی تھی نہ جگنو تھا۔

لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ سواری والا ہارن بجا بجا کر مجھے بلاتا رہا پھر وہ بھی رخصت ہوا —— دیر ہو گئی تھی مگر میں تاریکی میں کھڑا عجب مخمصے میں تھا —— جانے مجھے کہاں جانا تھا؟

انور زاہدی

ٹوٹا ہوا ٹرک

سامنے سے گزرنے والا ٹرک بیشک وہ کتنا ہی سجا بنا ہو یا خستہ حال مجھے، گرد و پیش کے سیل رواں سے بہا کر کہیں دور بہت دور لے جاتا ہے ــــــ وہاں جہاں میرے بچپن کے دن نیم کے گھنے درختوں میں سے زمین پر اترنے والی سورج کی اجلی کرنوں کی طرح جھلملاتے ہیں ــــــ جہاں شام پڑتے ہی دن بھر کے جلے ہوئے آسمان پر کبوتروں کے پرے کے پرے سارا دن ادھر ادھر سے دانہ چگنے کے بعد بادلوں کی طرح شہر کے مکانوں پر اترنے لگتے ہیں ــــــ دن بھر جھلسا دینے والی باد سموم ترس کھا کر آہستہ آہستہ خنک ہونا شروع ہوتی ہے ــــــ اور پیروں فقیروں کا شہر ــــــ جہاں ہر سڑک مڑتے ہی کسی نہ کسی چھوٹے بڑے مزار یا وسیع و عریض دور دور تک پھیلے ہوئے بے نام قبرستانوں کی طرف لے جاتی ہے، آہستہ آہستہ ایک پر اسرار تاریکی میں سکوت کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔

کہتے ہیں تاریخ کے مختلف ادوار میں، اس شہر نے بڑی بڑی جنگیں اور ہولناکیاں دیکھیں تھیں۔ تب اس قدر خون بہا تھا کہ کہیں خونی برج قائم ہوا، اور کہیں آج بھی شہیدوں کی یاد میں بنا ہوا چوک، تاریخ کی بربریت کا نشان ہے۔ اسی شہر کے مضافات میں دور کہیں ایک چھوٹی سی بستی، قاسم بیلا ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ محمد بن قاسم کی فوجوں نے جب اس شہر پر حملہ کیا تو اس کی فوجوں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا اور پھر یہیں سے شہر پر فوج کشی کی تھی۔ محمد تغلق نے جب اس شہر کو تاخت و تاراج کرنا چاہا تو ایک روایت کے مطابق، شاہ رکن عالم خود اشرفیوں کے تھال لے کر شہر کو بچانے نکل آئے تھے ــــــ پھر اسی شہر نے وہ دن دیکھے جب حاکم شہر دیوان مولراج کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور شہر کے مرکز میں موجود قلعہ ایک توپچی کی بدولت، مٹی کا ڈھیر بن

گیا..........وہ دن ہے اور آج کا دن اس شہر میں مٹی اڑ رہی ہے..........اس مٹی میں ان شہدا کا لہو بھی شامل ہے، جو حملہ آوروں کی تلواروں کے سامنے سینہ سپر ہوئے..........اور ان کی گرد بھی جو غاصبوں کے ساتھی ٹھہرے۔ کہنے والے کہتے ہیں، شہر میں موجود قبرستان جب شہر چھوٹا تھا تب بھی آبادی کے لحاظ سے کہیں زیادہ تھے جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ یہاں رہنے والوں کے مقابلے میں مرنے والوں کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ رہی۔ شاید اسی عہد نا پرساں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی نے اس شہر کی تعریف میں کہہ دیا ہوگا..........گرد، گرما، گدا و گورستان۔ یہی سوچتے ہوئے میں نہ جانے کہاں نکل آیا تھا..........ابھی ابھی برابر میں سے جو ٹرک گزرا ہے اس کی پشت پہ ایک مشہور گیت کے بول لکھے ہوئے تھے۔

دوری نہ رہے ہم میں آج اتنا قریب آؤ..........میں تم میں سما جاؤں، تم مجھ میں سما جاؤ

اسے کہتے ہیں فنکار کا ذوق جمال، ورنہ عام طور سے ''ہارن دو راستہ لو'' یا پھر ''سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں'' قسم کے پیغامات ٹرکوں کی دیوار پہ درج ہوتے ہیں..........اب بھلا بتایئے ٹرک بھرے ہوئے سامان سے چلا جا رہا ہے اور پیچھے یہ پیغام درج ہے کہ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں..........ممکن ہے یاسیت کا یہ عالم اسی شہر کے ٹرکوں تک محدود ہو لیکن وہ زمانہ..........جس کی یاد مجھے وہ ٹرک دلاتا ہے جو کمشنر کے وسیع و عریض بنگلے کی پشت سے ملحق پولیس والوں کی بارکوں کے نزدیک کھڑا رہتا تھا اور ایک مدت تک شاید جب تک اسکول کے دن ختم نہ ہوئے یا بچپن کے دن جوانی کی گرما گرمی میں گم ہوگئے..........ٹوٹا ہوا..........ٹرک بچپن کے گزرتے ہوئے دنوں کے لیے ایک تھرل۔ ایک کھیل۔ ایک پناہ گاہ کا کام دیتا رہا۔

یہ بھی نہیں کہ ٹرک گھر سے بالکل ہی نزدیک تھا، لیکن ہاں کچھ اتنا دور بھی نہ تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا کرکٹ گراؤنڈ میرے بچپن ہی میں تعمیر ہوا تھا ورنہ سنا یہ تھا کہ یہاں ایک بڑا ریتیلا میدان تھا جس کے مشرقی کونے میں کبھی ایک باولی ہوا کرتی

تھی۔ وہاں کے قدیمی باشندے اسے اندھا کنواں کہتے تھے اور روایت ہے کہ اس اندھے
کنویں میں وقت کے ہاتھوں نہ جانے کتنے ہی معصوم راہی ملک عدم ہوئے تھے۔ اب
وہاں کرکٹ گراؤنڈ کے بن جانے کے بعد سے اکثر و بیشتر کرکٹ کے میچ ہوا کرتے تھے۔
جن دنوں میں کرکٹ کلب والوں کی مصروفیات کہیں اور کسی دوسرے شہر میں ہوتیں تو
علاقے بھر کے بچوں اور جوانوں کا یہاں راج ہوتا .... صبح سویرے ورزش کرنے
والے یا دوڑ لگانے والے نظر آتے، دن میں مالی گھاس کاٹتے یا گراؤنڈ میں رولر پھیرتے
نظر آتے اور شام ہوتے ہی سبز گھاس کا وسیع میدان بچوں اور بڑوں کی آماجگاہ بن جاتا۔
اس زمانے میں جب یہ بھی ریت کا ایک میدان ہوگا شاید تبھی اس سے ملحق کمشنر
کے وسیع و عریض بنگلے کی حدود میں یہ ٹوٹا ٹرک پہنچا ہوگا .... لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہ
ٹرک کہاں سے آیا اور کیسے اس خستہ حالی تک پہنچا .... اور پھر کس لیے یہ کمشنر کے وسیع و
عریض بنگلے کے احاطے میں کھڑا کر دیا گیا .... اپنے بڑوں سے یہ سنا تھا کہ یہ ٹرک
سرکاری تھا اور کسی سرکاری مہم پہ جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں اس حالت کو پہنچا ....
اس کے ڈرائیور کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ جائے حادثہ پہ ہی دم توڑ
گیا تھا .... معلوم نہیں یہ کیسی مہم ہوگی، یا کس مقصد کے لیے اس ٹرک کو استعمال کیا جا رہا
ہوگا .... ؟ کہ وہ حادثے کا شکار ہوا .... لیکن اس سے آگے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ
اسے بھلا کمشنر کے بنگلے سے ملحق اس جگہ لا کر کیوں کھڑا کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ شاید تب کی
بات ہے جب ہم نے کھیلنا شروع نہیں کیا تھا .... یا پھر شاید اس سے بھی پہلے کا قصہ
.... ہم بچوں کو اس سے کوئی غرض نہ تھی۔

ہمیں تو جب وقت ملتا گھر سے بھاگتے اور پہلے کرکٹ گراؤنڈ میں کھیلتے، لیکن
اگر وہاں بڑے لڑکوں کی وجہ سے دال نہ گلتی تو بس اس ٹوٹے ہوئے ٹرک میں جا چڑھتے۔
کوئی کلینر بن جاتا .... اور فرضی طور پہ ٹرک کو آگے پیچھے کرانے کے اشارے اور
آوازیں نکالتا رہتا .... آنے دو .... آنے دو .... اور پھر جانے دو جانے

دو۔ جو اسٹیئرنگ پہ ڈرائیور بنا بیٹھا ہوتا وہ بالکل ڈرائیوروں کے انداز میں کھڑکی سے منہ نکال کر کلینر کو بے نقط سناتا .... میں اکثر ساتھ والی پھٹی ہوئی سیٹ پر بیٹھا ڈرائیور سے منہ ترہوتے ہوئے اپنے آپ میں کھویا رہتا .... کیونکہ مجھے نہ تو ڈرائیور کی طرح کلینر کو بے نقط سنانے کی عادت، بلکہ مہارت تھی اور نہ ہی اس کی طرح اسٹیئرنگ کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے گیئر کو بدلتے ہوئے، کھڑکی سے منہ نکال کر کلینر کو گالیاں دینے کی ہمت .... لیکن ہاں جی میرا بھی چاہتا تھا کہ کبھی ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھوں اور اسٹیئرنگ تھام کر اپنے دوست کلیم کے انداز میں ٹرک کو چلاتے ہوئے کھڑکی سے منہ باہر نکال کر کلینر پہ اپنا غصہ اتاروں .... لیکن ایسا کبھی نہ ہوسکا کیونکہ ایک تو میں اکیلا کبھی اس ٹرک تک گیا ہی نہیں .... ہم جب بھی کھیلنے کے لیے کرکٹ گراؤنڈ یا وہاں سے اس ٹوٹے ہوئے ٹرک تک پہنچے تو یاروں کی ٹولی کے ساتھ تھے .... مگر جن دنوں کی یہ بات ہے تب کمشنر کے بنگلے اور تازہ بنے ہوئے کرکٹ گراؤنڈ کے درمیان بس ایک کلب تھا .... جس میں شام گئے افسر صاحبان، لان ٹینس یا برج کھیلنے کے لیے جمع ہوجاتے تھے .... اور ہم کلب میں سے نکل کر کمشنر کے بنگلے کے پچھواڑے میں داخل ہوجاتے .... جہاں درختوں کے جھنڈ تھے ہمارا دوست ٹوٹا ہوا ٹرک ہمیں دیکھ کے مسکراتا اور کھیلنے کی دعوت دیتا۔

ایک دن جب اسکول سے واپسی پہ ہم سارے دوست گھر جانے کے بجائے کرکٹ گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے تو اچانک آندھی چل پڑی .... دیکھتے ہی دیکھتے چاروں سمت اندھیرا چھا گیا، سہ پہر کا وقت تھا، مگر لگتا یوں تھا جیسے رات پڑگئی ہے .... چاروں طرف گھور اندھیرے میں چیختی چنگھاڑتی ہوئی ہوا میں ایک طوفانی شدت تھی اور آندھی کے تھپیڑے بڑے بڑے تناور درختوں کو ایسے دہرا کیے دے رہے تھے جیسے وہ درخت نہ ہوں، سرکنڈے کی جھاڑیاں ہوں ....۔

ہم سب تھے تو بچے ہی، بجائے اپنے گھروں کی طرف چلنے کے نجانے کس

طاقت نے ہمارا رخ ٹوٹے ہوئے ٹرک کی طرف کر دیا۔ ہم گراؤنڈ سے بھاگتے ہوئے ٹرک میں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ جنہیں آگے جگہ ملی وہ اندر تھے باقی پیچھے کھلے حصے میں۔ لیکن اس دن وہ ٹرک ہمارے لیے جائے امان بنا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے محض ہمارے لیے ہی کھڑا کیا گیا تھا........ اس دن نہ کوئی ڈرائیور بنا........ نہ کوئی کلینز اور نہ ہی کسی کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ کاش آج ہی میں ڈرائیور کی جگہ لے لیتا........ سب کی سٹی گم تھی........ باہر سڑکوں پر طوفان اپنی من مانی پہ اترا ہوا تھا........ صرف پرند چرند ہی دم سادھے ہوئے نہیں تھے........ بلکہ لگتا تھا جیسے سارا شہر ہی اس کالی آندھی کے سامنے بے بس ہو چکا تھا........ اگر کسی میں استقامت تھی تو بس وہ ایک ٹرک تھا، جو بظاہر شکستہ تھا لیکن ہم سب بچوں کو اپنے حصار میں لیے کالی آندھی کے غیض وغضب میں اس بے پناہ طاقتور بحری جہاز کی مثال بنا ہوا تھا جو سمندری تلاطم میں اپنے مسافروں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

کئی بار فضا میں دھماکوں کی ایسی آوازیں گونجیں جیسے بم پھٹ رہے ہوں چاروں جانب ایسا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا........ کلیم کہاں تھا اور حامد کدھر........ نواب اور واحد کا کچھ پتہ ہی نہ تھا........ معلوم نہیں وہ ہمارے ساتھ آئے بھی تھے یا نہیں........ گھر نہ جانے کا خوف الگ سہمائے دے رہا تھا........ لیکن گھر تو جانے کا سوال تب اٹھتا کہ آسمان صاف ہوتا اور کچھ دکھائی دیتا........ اب بجلی چمکنی شروع ہو گئی تھی اور لگتا تھا کہ بارش ہوا چاہتی ہے۔

معلوم نہیں کب آندھی رکی اور کب جا کر آسمان کا رنگ بدلا اور ہم اس ٹوٹے ہوئے ٹرک سے نکل کر گھروں کی طرف چلے۔ شاید کئی گھنٹے ہمیں اس دن اس ٹرک نے اپنی پناہ میں لیے رکھا تھا........ گھر پہنچے پر چونکہ سب ہی پریشان تھے لہذا بجائے سرزنش کے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا........ اگلے دن کے اخبار سے پتہ چلا کہ اس طوفانی سیاہ آندھی نے شہر میں لاکھوں کی املاک کو تباہ کیا، کئی جگہوں پر

Scanned by CamScanner

ہو جانے کی وجہ سے آ گئیں لگیں......... پانچ بچے اور کوئی سات عورتیں اور مرد شہر اور مضافات کے علاقوں میں مختلف حادثات کی وجہ سے مر گئے .... کہیں کسی گھر کی دیوار بیٹھ گئی .... تو کسی مکان کی چھت اڑ گئی .... کہیں ٹین کے سائبان نے اڑ کر تلوار کا کام کیا تو کہیں کسی درخت کے گرنے سے بیچے سواریوں سمیت تانگہ زد میں آ گیا .... بارہ افراد کی موت کے علاوہ ان گنت تعداد میں زخمیوں سے ہسپتال بھر گئے .... اور جب ہم سب نے اپنے اپنے گھروں میں پہنچ کر اپنے بچنے کی وجہ اس تو نے ٹرک کو بتایا جس میں ہم اکثر کھیلا کرتے تھے .... تو ہمارے بزرگ اس طرح ہماری شکلیں دیکھتے رہ گئے جیسے انہیں اس پر یقین نہ آیا ہو ....

کئی دنوں کے بعد جب ہم سب ایک بار پھر اپنے مشترک دوست یعنی اسی ٹرک تک پہنچے .... تو معلوم ہوا کہ اس میں رہنے والا ایک سائیں بابا جسے ہم میں سے بیشتر نے شاید ایک آدھ بار ہی دیکھا ہو گا، چند روز پہلے اسی ٹرک میں خاموشی سے مر گیا .... کچھ کا کہنا تھا کہ اسے کالے ناگ نے ڈس لیا تھا .... جبکہ دوسروں کے بقول وہ بیمار تھا اور بس اپنی بیماری کے ہاتھوں اس انجام تک پہنچا .... لیکن ہمارے ہی ایک ساتھی کلیم کے بقول جو اکثر اسے ملتا رہا تھا اور اس نے سائیں بابا کے بہت سے سانپوں کو بھی اس کے پاس موجود پٹاریوں میں دیکھ رکھا تھا .... ''وہ سائیں بابا تو ایک سپیرا تھا جو جوانی میں ایک دور افتادہ علاقے سے فرار ہو کر یہاں آ بسا تھا'' .... کلیم یہ تو نہ بتا سکا کہ وہ کیوں اس شہر میں آ بسا، لیکن کلیم کی باتوں سے یہ اخذ کرنا دشوار نہ تھا کہ شاید اپنے علاقے کو چھوڑنے کی وجہ یا تو محبت میں ناکامی تھی .... یا اپنی جان کا کسی سے خوف اسے سینکڑوں میل کی دوری پر یہاں لے آیا تھا۔ اسی بابا نے کلیم کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب وہ یہاں آیا تو وہ سپیرا نہ تھا لیکن اول پیٹ کی خاطر اور دوسرے جون بدلنے کے خیال نے اسے جوگیوں کے ایک گروہ سے منسلک کر دیا۔ شب و روز گزرتے رہے اور وہ اپنے گروہ کے ساتھ بستی بستی گاؤں گاؤں سانپ دکھاتا اور بین بجاتا پھرتا رہا .... بین بجاتے

Scanned by CamScanner

بجاتے دن رات مہینے گزرتے گئے اور اسے اپنے ہی گروہ کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا.......... دن بھر سانپوں سے کھیلنا .... بین کی آواز پہ انہیں مست کرنا اور زہریلے ناگوں کو اپنے گلے میں لٹکا کر دیکھنے والوں کو مبہوت کرنا اب اس کے لیے کھیل بن گیا تھا.......... ادھر اپنے گرو کی موت کے بعد وہ ایک سپیرا بن گیا .... ادھر اس کی شادی اس کی لڑکی سے ہو گئی.......... ۔

اب سارا دن وہ شہروں اور بستیوں میں اپنے سانپوں کے کرتب دکھا کر اور سانپ کے کاٹے سے بچنے کی دوائیں بیچ کر روزی کماتا اور شام ڈھلنے پر اپنے گھر پہنچ جاتا۔ لیکن ایک شام کسی طوفان کی طرح اچانک کالی آندھی آئی۔ جو اس کی زندگی کو ایک بار پھر سے اندھیروں میں دھکیل گئی .... اس کی بیوی ایک ناگ کے ڈسنے سے مر گئی۔ تب اس نے ناگیوں کا گروہ چھوڑا .... اور ایک فقیر بن کر مزاروں اور قبرستانوں میں ڈیرے لگا لیے بچھڑ گیا تو کھا لیا .... ان ہی دنوں میں اس ٹرک کو یہاں لا کے کھڑا کیا گیا تھا۔ بس تب سے وہ رات گئے اسی ٹرک میں آ کر سو جاتا۔ معلوم نہیں اگر وہ سپیرا تھا تو ہمیں تو اس ٹرک میں کبھی نہ سانپ دکھائی دیا نہ ہی کوئی ایسے آثار جو اس بات کی شہادت بنتے لیکن یہ ضرور ہے کہ کھیل کے دوران کئی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ اس ٹوٹے ٹرک میں کوئی ایسی مخلوق ہے جو خطرناک ہو سکتی ہے۔ میں نے جب بھی اس بات کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا تو انہوں نے نہ صرف میرا مذاق اڑایا بلکہ اسے ہنسی میں ٹال دیا گیا.......... ۔

اسکول کا زمانہ ختم ہوا .... ہم لوگ کالجوں میں پہنچ گئے .... کئی دوست اسکول ہی کے زمانے میں اپنے والدین کے تبادلوں کی وجہ سے شہر چھوڑ گئے تھے۔ بس وہاں میں اور حامد باقی رہے .... کالج کے مشاغل اور نئی زندگی کی مصروفیات نے سب کچھ بھلا دیا۔ پھر حامد بھی انجینئرنگ کالج میں داخل ہو کر کراچی چلا گیا .... ادھر میں لاء کالج میں پڑھنے کی خاطر لاہور پہنچ گیا .... زندگی ایک نئی ڈگر پر چل

پڑی .... کہاں ہم سارے دوست ہر روز دن میں کئی کئی گھنٹے ایک ساتھ گزارتے تھے، جو اسکول میں گزرے ہوئے وقت کے علاوہ تھے .... اور کہاں اب یہ عالم کہ سب ایک دوسرے سے دور ہی نہیں بلکہ فاصلوں پر دوسرے شہروں میں اپنی اپنی مصروفیات میں گم تھے۔ سب ہی دوست اس شہر کو چھوڑ گئے تھے .... حامد انجینئر بن کے گلاسکو جا بسا تھا .... نواب بھری جوانی میں جگر کی جان لیوا بیماری میں چل بسا۔ ہمارے ٹرک ڈرائیور دوست اور قصہ گو کلیم نے تعلیم کے بعد اپنے آبائی پیشے، ٹھیکداری کو شروع کر دیا تھا .... آج اس کے نجانے کتنے ہی ٹرک ملک کی شاہراہوں پر رواں دواں تھے۔

ادھر اس شہر نے بھی جون بدلی .... ہر طرف تعمیر نے جیسے سارے شہر کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ جہاں گوبھی اور گنے کے کھیت ہوتے تھے وہاں کوٹھیاں بن گئیں، جہاں کھائیاں تھیں اور ان سے ملحق قبرستان، وہاں پکچر ہاؤس تعمیر ہو گئے .... نئی نئی دکانوں نے سر ابھارا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مارکیٹ بن گیا .... برسوں کے بعد میں ایک دن اتفاقاً جب اس شہر میں گیا تو نجانے کس خیال کے تحت کرکٹ کلب کی طرف جا نکلا .... اور دیکھا کہ کرکٹ کلب اب باقاعدہ ایک خوبصورت باؤنڈری وال کے حصار میں تھا .... اس کے ساتھ موجود کلب جس میں افسران کی ٹولیاں سول لائنز سے یہاں لان ٹینس اور برج کھیلنے جمع ہوتیں تھیں اب ایک چار دیواری میں سمٹ گیا تھا۔ اب کلب کا دلکش آہنی دروازہ مقررہ اوقات کے علاوہ بند رہتا۔

کمشنر کے وسیع و عریض بنگلے اور کلب کے مابین کھلا علاقہ جہاں گڑحل کے پھولوں کے جھنڈ میں وہ ٹوٹا ہوا ٹرک کھڑا رہتا تھا، اب وہاں نہیں تھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا .... نہ وہاں گڑحل کے پھولوں کے پودے تھے نہ بیریوں کے درخت اور نہ ہی ہمارا وہ دوست ٹوٹا ہوا ٹرک۔ وہاں کمشنر صاحب بہادر کے نوکروں کی ٹیم میں اضافے کے باعث مزید نئے کوارٹر بن چکے تھے۔ پولیس والوں کی دو بیرکوں کے بجائے اب وہاں چار کوارٹر تھے۔ نئے بننے والے کوارٹروں میں دھوبی اور بنگلے کے کچن میں کام کرنے والے

Scanned by CamScanner

باورچیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ نہیں کہ پہلے کمشنر صاحب کے لیے دھوبی یا باورچی نہیں تھے...... لیکن جب وہ بنگلہ ہی اتنے بڑے رقبے پہ پھیلا ہوا تھا کہ اس کے اطراف میں دو سڑکیں گھومتی تھیں اور تیسری سمت ایک بہت بڑا کرکٹ گراؤنڈ تھا۔ یہ بنگلہ برطانوی نوآبادیاتی نظام کی دین تھا...... جو برصغیر کی تقسیم کے وقت ہمیں بطور ورثے کے ملا تھا...... لیکن وقت کے بدلنے کے ساتھ کوئی بہتر تبدیلی آنے کے بجائے، وہاں موجود درخت اور پھولوں کے جھنڈ غائب کر دیے گئے تھے۔ پرانے کلونیل عہد کی یاد تازہ کرنے کی خاطر آزاد ملک کے استعماری نظام نے...... اس میں نئی تبدیلیاں لا کر اسے مزید استحکام بخش دیا تھا...... ہاں البتہ...... وہ ٹرک...... جس میں ہم سب کے بچپن کے بیتے ہوئے دن گزرے تھے، اب وہاں موجود نہیں تھا...... دیکھنے میں وہ سارا علاقہ انتہائی صاف ستھرا دکھائی دیتا تھا...... لیکن وہ ٹوٹا ہوا ٹرک...... جس نے ہمیں بچپن میں کالی آندھی کے عذاب سے بچایا...... اور جانے کتنے برس تک ہمیں کھیلنے کے لیے اپنے آپ کو ہمیں سونپے رکھا، موجود منظر سے غائب تھا۔ مجھے وہ ٹوٹا ہوا ٹرک یاد آ گیا ہے...... جس نے سوائے دینے کے ہم سے کبھی کچھ نہ لیا تھا...... اور وہ سائیں بابا جسے، ہم میں سے سوائے کلیم کے کسی نے محض ایک آدھ بار ہی دیکھا ہوگا...... کچھ معلوم نہیں...... کون تھا......؟ اپنے علاقے سے بھاگا ہوا کوئی مفرور...... ایک سپیرا...... محبت میں شکست خوردہ انسان...... یا محض ایک فقیر......؟ جس کا گھر وہ ٹوٹا ہوا ٹرک تھا...... جو ہم سب کے لیے بس ایک کھیل تفریح کا ذریعہ بنا رہا۔ کالے ناگ والا قصہ محض ایک کہانی تھی یا کوئی حقیقت......؟ اکثر کھیل کے دوران اس ٹرک میں موجود کسی انجانی مخلوق کا خوف میرا کوئی وہم تھا......؟ یا پھر محض ایک ڈر......؟

اب سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں...... لیکن یہ خیال مزید تیقن کے ساتھ میرے ذہن میں پرورش پاتا ہے...... اور اکثر تنہائی میں سوال کرتا ہے کہ ایک بار اگر بچھڑ جائیں تو کیا پھر کبھی مل سکتے ہیں......؟

Scanned by CamScanner

محمد حمید شاہد

بدن برزخ

فی الحقیقت حضرت مولانا سراج الدین محور ملالوی کے لیے خود اپنی ذات کے توسل سے جنت اور دوزخ کا سوال بے ڈھب پھیلا اونٹ کٹارا تھا' سارے کا سارا کانٹوں بھرا۔ قریب جاؤ تو دامن تھامے رہے' حیلہ کر کے چھڑا لینا چاہو تو زخم بنے اور الجھائے' زور آوری کرو تو دامن ہی تھگلا تھگلی کر دے۔ تاہم یہ سوال ان کے وجود کے لیے یوں تھا جیسے کبوتر کے لیے اس کے پاؤں میں پڑی ججھنی۔ کبوتر چاہے ججھنی وجیرج سے چلے پاؤں کی ججھنی جھن ضرور کرتی ہے۔

یہی وجہ رہی ہوگی کہ شروع شروع میں جب جنت دوزخ کے سوال کی سرعت سے گھومتی پرکار سوئی ان کی چھاتی کو مرکز مان کر پوست ادھیڑتی، ماس چیرتی، عین من کے بیچ کھب جاتی، تو دائرے کی صورت گھومتا، لکیریں ڈالتا مستبہام سراپے ہی ٹھٹھک کر ٹھہر جاتا۔ مولانا ملالوی اس سوال کو سامنے پا کر الجھ جاتے، الجھن سے نکلتے تو سر جھٹک دیتے اور بار بار جھٹکے جاتے۔ بالکل یوں جیسے پہلی جھن پر کبوتر جھل مرے کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، پھر پاؤں جھٹکتا ہے اور جھٹکے چلا جاتا ہے۔

پتہ نہیں وہ کون سا کٹھیان لمحہ تھا کہ ان کی روح پر پڑی چونک کی کٹھنی خود بخود مسک گئی تھی۔ اول اول بس اتنی ہی مسک چاہیے ہوتی ہے بعد ازاں تو روح اسی مسلسل مسک کی چھنک کی اسیر ہو جاتی ہے۔ جنت دوزخ کا سوال غت غوں، غت غوں کرتے اور اپنے ہی محور پر پھلیں ڈالتے کبوتر کی جھن کی طرح مولانا ملالوی کے لیے جھنجھنیاں بن گیا جو جکڑے ہوئے بھی تھا اور حلاوت بھی دیتا تھا۔

پھر جب اسی جکڑ کی حلاوت روح کا وظیفہ بن گئی تو رفتہ رفتہ ان کے بدن کے

جلیے جلیے میں مستی بن بن کر سمانے لگی۔ مولانا ایسے میں بے خود ہو جاتے۔ دستار کلاہ سمیت دونوں ہاتھوں سے تھام کر اتارتے اور اپنے سامنے رکھ لیتے۔ مقتدی سمجھ جاتے کہ حضرت مولانا وجد میں آیا چاہتے ہیں۔ سب خاموش ہو جاتے حتیٰ کہ وہ حال کے جذب سے ابھرتے اور قبلہ رو ہو کر سربسجود ہو جاتے۔

جب مولانا ملالوی اس استغراق حال سے نکلتے تو قال اور صدق مقال کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سبھی کے دل عقیدت کے بوجھ سے چھلک رہے ہوتے۔ لوگ ان کے ہونٹوں سے پھوٹتے حرف حرف کی کرنوں سے اپنے بطون کو اجالتے اور اپنی اپنی نگاہ میں مولانا کا قد اور رتبہ بڑھاتے چلے جاتے۔

پھر یوں ہوا کہ قامت اور مراتب اس قدر عالی ہو گئے کہ خود انہیں بھی یہ سب کچھ سرور دینے لگا۔ مراقبے کی کیفیت طول کھینچنے لگی۔ ایسے میں ان کی خامشی اس قدر گھمبیر ہو جاتی کہ سناٹا بولنے لگتا اور ان کا اپنا کہا، 'ما الانسان لولا اللسان' بھی جھوٹ لگنے لگتا۔ وہ جو بولتے ہیں اور بولے چلے جاتے ہیں، ان کی زبانیں تو ان خاک پتلوں کو منہ کے بل گرا کر پیوند خاک کر دیتی ہیں .... مگر یہ جو چپ ہے، بولتے سناٹے میں چپ .... اور یہ جو مراقبہ ہے، کیف کی جھر جھر میں طویل مراقبہ، یہی تو سارے میں تقدس کی زبان کا رس گھولتا ہے .... ایسا رس جو قطرہ قطرہ دل کی سماعتوں پر ٹپکتا ہے .... ٹپکتا ہے اور ٹپکے جاتا ہے، حتیٰ کہ سب مسحور ہو جاتے ہیں۔

لاریب کہ نہال لمحوں کی اطالت میں بلا کا کیف اور غضب کی مستی تھی مگر مولانا ملالوی کے بدن بیچ پڑا جنت دوزخ کا سوال بھی تو برف سل ایسا نہ تھا کہ طویل مراقبوں کی مدت سے گھل کر خود بخود پانی ہو جاتا۔ یہ سوال تو لوہے کی سلاخ کی طرح روح کے عین وسط میں پیوست تھا اور جہاں یہ پیوست تھا ٹھیک وہیں سے۔ ناقابل برداشت درد کی ٹیسیں ٹپس جما تیں تو وہ بے بس ہو جاتے۔ یہ بے بسی مراقبے کا مزا کرکرا کر دیتی تھی۔ لہذا کسی اور حیلے کی بابت تفکر فرمانے لگے۔ تقویم کی ایسی ہی تسبیح کو رولتے رولتے ایک روز

مطلوبہ چیلے کا دانہ ان کے ہاتھ آ گا۔ یہ حیلہ پہلے کا متبادل نہ تھا' باوصف آزمانے والا تھا۔ وہ جو مولانا کہا کرتے تھے کہ 'الحدید یفلح بالحدید' بہ منگہ انہوں نے اپنی روح میں پیوست لوہے کی سلاخ کو لوہے سے کاٹنے کے لیے اپنی حدید اللسان پر جنت دوزخ کے تذکرے کی کاٹ کو بڑھا دیا۔ اس کے لیے انہیں خاص اہتمام کرنا پڑا تھا۔ پہلے وہ گاہے گاہے بیان فرمایا کرتے تھے، اب تین اوقات مخصوص کر دیے گئے۔ فجر، ظہر اور عشاء کی نمازوں کے بعد مقتدی بیٹھے رہتے، مالا نا ملا لوی دوزانو ہو کر پہلو اس قدر بدلتے کہ اقامت کہنے والے سے لے کر بائیں جانب بیٹھے آخری صف کے آخری مقتدی تک سب کو ان کے چہرے کا کچھ نہ کچھ حصہ جھلک دے جاتا۔ نگہ اٹھا کر دیکھے بغیر دھیمے مگر دلنشیں لحن میں بیان ملاحم عطا فرمانے لگتے۔

پہلے پہل مسجد مائی مصاحب بانو میں نماز جمعہ کا اہتمام نہ ہوتا تھا کہ جامع مسجد مدنی زیادہ دور نہ تھی۔ ملحق محلے کے دوسری طرف سب جانا پڑتا تھا۔ مولانا بھی جمعہ کے روز نماز کے لیے وہیں تشریف لے جاتے تھے کہ ان کا عقیدہ تھا 'صلوۃ جمعہ کا ہر مسجد میں اہتمام ضروری نہیں ہے۔ تاہم اب صورت حال مختلف ہو گئی تھی۔ نہ صرف جمعہ کی نماز کا اہتمام ہونے لگا، مولانا ملا لوی خطبہ بھی دینے لگے تھے۔

عمومی نمازوں کے بعد روزانہ کا سہ گانہ بیان فلک پوش پہاڑوں پر پانیوں سے لدے بادلوں جیسا تھا جو اپنی لپیٹ میں چپکے سے لے لیتے ہیں اور سارے بدن کو طراوت کے احساس سے بھر دیتے ہیں جبکہ جمعۃ المبارک کا خطبہ جل تھل کر دینے والی اور پوری طرح بھگو ڈالنے والی موسلا دھار بارش کا سا تھا جو پہلے پانیوں کو نچڑنے نہ دیتا تھا اور اوپر سے چھاجوں اور برسا دیتا۔ خطبے کے دوران نہایت سلیقے سے منتخب کردہ الفاظ ایک خاص درجے سے ان کے سینے سے ابلتے اور نرخرے پر اچھلنے کے بعد ہونٹوں سے یوں ادا ہوتے کہ پورے ہال میں گونج بھر جاتی۔

مسجد مائی مصاحب بانو کا ہال بڑا نہ تھا۔ عذاب ثواب کے عظیم تذکرے پر تو یہ

اور بھی چھوٹا پڑ جاتا۔ اول اول ان کے لحن میں غضب کی مٹھاس ہوتی ۔ یوں لگتا جیسے ادھر ادھر شیرینی کے چھینٹے اڑ رہے ہوں ۔ جنت کے تذکرے کے بیچ دودھ اور شہد کی رواں نہروں، انواع و اقسام کے میوہ جات، شراب طہور اور خوب صورت آنکھوں والی اٹکھیلیاں کرتی حوروں کی خوب و نفیس آواز میں تصویر کشی فرماتے ۔ یوں کہ جنت کی اس تصویر سے وابستہ تخیل پھیلتا پھیلتا یوں وسیع ہو جاتا کہ جنت کے آٹھوں درجات آنکھوں کے سامنے کھلتے چلے جاتے اور صاف صاف دکھنے لگتا کہ یہ دارالخلا ہے وہ دارالمقام، ادھر دارالسلام، جنت عدن اور دارالقرار واقع ہیں ادھر جنت نعیم، المساوی اور فردوس بریں۔ جب مولانا بتاتے کہ سات درجے تو انسانوں کی قیام گاہیں ہیں اور آٹھویں پر دیدار مطلق ہوگا تو سبھی کے تصور کی نگاہیں جلال کبریائی کے نور سے جگ مگ جگ مگ کر اٹھتیں۔ مولانا سورۂ رحمن کی تلاوت، ترجمہ اور تفسیر فرما رہے ہوتے تو عجب استغراق کا عالم ہو جاتا۔ ایسے میں انہیں سننے اور دیکھنے والے مسحور ہو کر پکار اٹھتے، احسن الاشیاء کلام صحیح من لسان فصیح من وجہ صبیح۔

جب مولانا دوزخ کے طبقات ستہ کی طرف سمائی بیان کا رخ موڑتے تو جہنم، سعیر، حطمہ، لظی، سقر، جحیم اور ہاویہ کا ایندھن بننے والوں کی نشانیاں کھول کھول کر بتاتے۔ پھر جب دوزخ کے لیے النار اور نرک جیسے مترادفات بدل بدل کر استعمال کرنے لگتے تو زبان بھی شعلہ بار ہو جاتی۔ لگتا کہ وہی آگ ہے جو سینوں کی سمت اٹھتی ہے اور بدن کو یوں جلائے دیتی ہے کہ ہڈیوں کی چٹک تک سنائی دینے لگتی ہے۔ خصوصاً جب وہ سورۂ اعراف کی چالیسویں آیت تلاوت فرما رہے ہوتے اور ان لوگوں کی نشاندہی کرتے جن پر آسمان کے دروازے ہرگز ہرگز نہ کھولے جائیں گے تو یوں محسوس ہوتا جیسے مسجد کا چھت مقفل دروازوں والا آسمان بن کر سب کے سروں پر جھک آیا ہے۔ مولانا تجلیلی اور تصریحی اسلوب میں مردود ٹھہرائے جانے والوں کی بابت بتاتے کہ ان کا جنت میں داخل ایسے ہی ناممکن ہے جیسے سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا .... اور یہ کہ دوزخ ہی ان کا اوڑھنا

اور دوزخ ہی ان کا بچھونا ہے۔

جب وہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کے گزرنے یا پھر اوڑھنے بچھونے کی بابت بتاتے تھے تو ان کے وجود میں کہیں نہ کہیں ایک چبھن سی ہوتی تھی تاہم اس چبھن کا احساس اپنے ہونے کے باوصف یوں کافور ہو جاتا تھا جیسے اپنے محور پر بلیں ڈالتا کبوتر رفتہ رفتہ اپنی پنجی کی چبھن کو قبول کر لیتا ہے اور اسے اپنے معمول کے بیچ کہیں نابود کر دیتا ہے۔

مسجد کا صحن بھی کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ جہاں اس کی وسعت ختم ہوتی تھی وہیں تین مکمل اور دو نصف محرابوں والا برآمدہ تھا جس میں طہارت خانہ بھی تھا اور وضوگاہ بھی۔ محرابوں کے اوپر نصب پھولدار جالیوں کے پیچھے خالی جگہوں کے اندر ہنڈیوں کو جوڑ کر کابکیں بنا دی گئی تھیں جن میں بسا دیے جانے والے کبوتر سارا سارا دن مسجد کی منڈیروں پر غٹ غوں غٹ غوں کرتے، پہلو بچا کر ادھر ادھر ہو جاتی کبوتریوں کے گرد گھمن گھیریاں ڈالتے اور موقع پا کر بغبغاتے ان پر سوار ہوتے یا پھر صحن میں ڈالا گیا چوگا چگنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں وہاں بیٹوں کی خشک یا چپکتی ننھی منی گولیاں جو اکثر بہتی یا پھیلتی سفیدی اور سیاہی مائل رالوں کے بیچ ابھری اور جمی ہوئی ہوتیں، اس امر کی نشاندہی کرتی تھیں کہ وہ جہاں چاہتے چلے جاتے تھے اس لیے کہ وہ سب مولانا ملالوی کو اچھے لگتے تھے۔

انہیں کبوتریوں اچھے لگتے تھے کہ وہ ان کی مدد سے اپنے تصور کے پکھیرو کو ایک ہی اڑان میں اس حویلی میں اتار سکتے تھے جو بعد میں جل بھن کر راکھ ہو گئی تھی تاہم یاد کی بستی میں کچھ یوں بسی ہوئی تھی کہ جب وہ وہاں ہوتے تھے تو کہیں نہ ہوتے، بس وہاں ہی ہوتے بالکل لوٹن کبوتر کی طرح جو فلک میں تارا ہو جانے کے بعد اوپر ہی کی فضا میں مست ہو جاتا ہے اور وہیں لوٹنیاں لیے جاتا ہے تاہم جونہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نیچے آ رہا ہے تو مکرر اڑان لیتا ہے اور پھر سے لوٹن بھرنے کو رجھ جاتا ہے۔

اجلے کبوتروں کے وسیلے سے جس حویلی سے ان کے تخیل کا سلسلہ جڑتا تھا اس کی چھتوں کی منڈیروں اور سیڑھیوں ممٹیوں سے بندھی چھتریاں ہمہ وقت اصل کبوتروں سے

Scanned by CamScanner

آباد رہتی تھیں جبکہ اس کا آنگن پیالہ اماں جی کی محبتوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

اماں جی کو دھیان میں لانا اور انہیں ہی سوچے چلے جانا مولانا ملالوی کو اور بھی بھلا لگتا تھا۔ ایسے میں یوں ہوتا کہ ایک رس بھری آواز ابھرتی اور ہر کہیں یوں پھیل جاتی جیسے چاروں طرف بینکڑوں کبوتروں کی ٹولیاں مدھر آواز میں جھن جھن کیے جاتی ہوں۔ اس سرمدی آواز کا سلسلہ رکتا نہ تھا حتیٰ کہ پورے ماحول میں نور سا گھل جاتا۔ اس نور دھارے کے قلب سے اماں جی کا چہرہ ابھرتا تھا جو پوری طرح واضح تو نہ ہوتا تاہم ہونٹوں کی جنبش صاف دکھتی تھی۔

شفیق اماں جی کے نظیف چہرے پر تھرتھراتے مرطوب ہونٹوں کے بیچ دودھ جیسے دانتوں کا لطیف اجالا تب سارے میں بھر جاتا تھا جب وہ انہیں پیار سے ننھے میاں کہہ کر پکارتی تھیں اور قریب آنے پر اپنی گود میں بھر لیتی تھیں۔ گود کی گداز گرمی سے انہیں الجھن سی ہونے لگتی تھی۔ ایک مرتبہ جب اماں جی نے انہیں کسمسا کر گود سے نکلتے پایا تو کہا تھا، ننھے میاں! لگتا ہے اب تم خود کو بڑا بڑا سمجھنے لگے ہو اور یہ بھولے جاتے ہو کہ کیسے دودھ کی دھاریں لینے کو مچل مچل کر یہاں گھسے آتے تھے۔

یہاں' کہتے ہوئے اماں جی نے اپنی گود کی سمت انگلیاں موڑ لی تھیں مگر ان کی نگاہ سیدھی وہاں جا پڑی تھی جہاں سے کبھی دودھ کی دھاریں امنڈتی تھیں۔ ننھے میاں نے دیکھا تھا وہاں قمیض پوری طرح گداز اور سانسوں سے بھر گئی تھی، اتنی کہ اوپر پھیلی اوڑھنی بھی انہیں سنبھال نہ پا رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نظر نہ جما سکتے تھے، شرم سے چہرہ بھی جھک گیا تھا حتیٰ کہ وہاں ٹھہرے رہنا ان کے بس میں نہ رہا تھا۔ لہٰذا کھسک کر آنگن پار کیا اور سیدھے ناغول میں جا بیٹھے تھے۔ تاہم وہیں اکیلے میں بیٹھے بیٹھے اس وقت کا تصور باندھنے کو آنکھیں موند لی تھیں جب اچھلتے دودھ کی دھاریں ان کے حلقوم میں اترا کرتی تھیں۔ لیکن تب انہیں شدید مایوسی ہوئی تھی جب وہ ایسا تصور جما لینے میں بری طرح ناکام ہو گئے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ ہر بار اماں جی کا چہرہ دوسری سمت گھوم جاتا، پورے بدن

Scanned by CamScanner

سمیت، اور ان کی پیٹھ کے اجلے پن اور مطلق پھوڑے میں سے ایک ان کی نگاہوں پر تن جاتا اور دوسرا چھپنے لگتا، بالکل ایسے جیسے سفید کبوتروں کی ڈار آنگن میں اترنے پر بھلی لگتی مگر ان کے ساتھ ہی کوئی سرمئی جنگلی کبوتر آ جاتا تو الجھن ہونے لگتی تھی۔

مسجد کے برآمدے کی کابکوں میں مقیم کبوتر پچاس سے اوپر ہی ہوں گے مگر تھے سارے ہی سفید، مرمر جیسے۔ اس کا خاص خیال رکھا جاتا کہ کسی اور رنگ نسل کا کوئی پرکھرا کبوتر ان میں ملنے نہ پائے۔ یوں نہیں تھا کہ سرخ، چتڑے، چینے، دوبازے، بھنے، شارکے، کل پرے، خاکی سرے، سیاہ دو پوچھے، زاغ، لنگوٹ والے اور مکھی پرے ان اجلے مقدس کبوتروں سے کم معصوم دکھتے تھے بلکہ یوں تھا کہ بے داغ سفید رنگ اور وہ بھی دودھ جیسا مولانا ملالوی کو بہت مرغوب تھا۔

ہر رات سونے سے قبل دودھ بھی وہ رغبت سے نوش فرمایا کرتے تھے۔ آبخورے یا کانچ کے گلاس میں نہیں چینی مٹی کے بڑے پیالے میں۔ شاید اس لیے کہ یوں وہ اس کی زیادہ ہموار سطح کو دیکھ سکتے تھے۔ انہیں دودھ کو حلق میں اتار لینے کی عجلت نہ ہوتی۔ سامنے رکھے اسے دیر تک دیکھتے رہتے۔ جب پیالہ تھامتے تو دونوں ہاتھوں سے بہت احتیاط کے ساتھ۔ جیسے انہیں اس کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔ انگلیوں کی پوروں کو نرمی سے پیالے کی بیرونی چکنی سطح پر پھیلنے دیتے تھے یوں جیسے وہ دودھ کی سفیدی کا لمس جانچ رہے ہوں۔ پھر بے اختیار ہو کر پیالے کے کناروں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتے جیسے دودھ پی نہ رہے ہوں اس کے اجلے پن کو بوسے دے رہے ہوں۔

جب وہ چینی مٹی کے پیالے کو سامنے رکھ کر اسکے گول دہانے کی وسعت میں ٹھہرے دودھ کی ہموار سطح پر نظریں جمائے بیٹھے ہوتے تو تصور میں اماں جی کی شفاف پیٹھ آ جاتی تھی جسے انہوں نے بس ایک ہی بار اور ایک ہی لمحے کو دیکھا تھا مگر اب تک دیکھے جاتے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک روز جب اماں جی بخار میں پھنک رہی تھیں، ابا جی زنان خانے میں آئے تھے اور اماں جی کی ہائے وائے سن کر ہنستے ہوئے مطار مطار کر کہنے لگے

تھے۔ تی بیگم آخر کو مفلّی پھوڑا ہے۔ جب تک رہے گا اس کی سنسناہٹ میں خلل تو ہو گا۔ پھر ایک پڑیا اماں جی کے سرہانے رکھتے ہوئے کہا، حکیم شرف الدین شرف سے منگوایا ہے یہ سفوف، کہتے ہیں نسخہ تیر بہدف ہے۔ اسے سرسوں کے تیل میں آمیز کر کے اوپر پھوا لیں، ایک دفعہ منہ کھل گیا تو سمجھو چین آیا۔ ابا جی نے یہ کہہ کر اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا تھا اور کہا

تھمم میاں، اماں کا دھیان رکھنا اور باہر نکل گئے تھے۔

ابا جی کی عادت تھی کہ جب وہ گھر میں ہوتے تو شوخی سے لفظ چبا چبا کر ادا کرتے تھے اور باہر احباب میں ہوتے تو لہجے میں تمکنت آ جاتی۔ ان کی یہ بھی عادت تھی کہ گھر میں کسی کو اصل نام سے نہ پکارتے تھے، کوشش کرتے کہ نام کا پلیتھن نکل جائے۔ ایسا نہ ہو پاتا تو خود سے کوئی عجیب سا نام تجویز کر دیتے تھے۔ اماں جی کا نام جمیلہ خاتون تھا جسے انہوں نے تی بیگم بنا ڈالا تھا۔ باہر کے کام کاج کے واسطے کلیم الدین تھا، رنگ کا کلسٹ لہذا نام اور رنگ کی مناسبت سے کلو کہلایا۔

کلو کی بیوی گھر بھر کا کام کرنے کو چاروں پہر جھول پھری کی طرح گھومتی رہتی تھی، نام نجمہ ہو گا، بھی تو بجی نجو کہتے تھے مگر ابا جی کے واسطے وہ نجھو تھی۔ اپنے بیٹے کو سراج الدین یا بجی میاں کہنا انہیں نہ بھایا، بیٹا تھمم تھنا تھا، گول مٹول چنانچہ تھمم میاں کہہ کر پکارتے۔

جب ابا جی منظار منظار کر بات کرتے یا ناموں کا پلیتھن نکال رہے ہوتے تو ان کے بیٹے کو شدید الجھن ہوتی تھی۔ اس روز بھی ہوئی تھی مگر دھیان ——— مفلّی پھوڑے میں اٹکا ہوا تھا۔ اماں جی سے اسی بابت پوچھا تھا تو شدید تکلیف کے باعث انہوں نے ڈھنگ سے جواب نہ دیا......... بس اتنا کہا تھا کہ جان کا روگ ہے یہ بھی اور یہ جواب ان کی تشفی کے لیے بہت ناکافی تھا۔ سارا دن بجی میاں الجھن میں رہے اور شام پڑے جب سارے کبوتر چھتریوں پر آ بیٹھے تھے تو بے دھیانی میں ڈیوڑھی سے ہوتے، بڑے کمرے جسے سب محل کہتے تھے، میں جا گھسے تھے تو دیکھا تھا کہ اماں جی کی قمیض پشت سے کندھوں تک اٹھی

Scanned by CamScanner

ہوئی تھی اور صاف شفاف اجلے دودھ جیسی جلد یوں لشک رہی تھی کہ سارا نکھار آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ ماسی نجو بائیں بغل کے پاس، اٹھے بازو کے نیچے سے، قدرے پشت کی جانب پوری طرح بھی ایک کومڑ پر سرخی سا لیپ کیے جاتی تھی۔

جی میاں کو لگا تھا وہاں سامنے اماں جی کی پیٹھ نہ تھی، اجلے سفید کبوتروں کی ڈار تھی اور ادھر بغل کے پاس مغلئی پھوڑا نہ تھا اسی اجلی ڈار میں کوئی سرمئی جنگلی کبوتر آ گیا تھا۔ ان کا جی چاہتا تھا وہ آگے بڑھ کر جنگلی کبوتر کو اڑا دیں، کچھ اس طرح چپکے سے کہ سارے اجلے کبوتر یوں ہی اپنے دھیان میں رہے رہیں مگر دوسرے ہی لمحے لاج سے ان کے کانوں کی لوئیں تک سرخ ہو گئی تھیں اور وہ وہاں سے کھسک کر ناغول میں جا بیٹھے تھے اور دیر تک لک چھپ بیٹھے مغلئی پھوڑے کے کرب سے آنسو بہاتے اور سارے میں مکھیاں بھن بھن کرنے لگی تھیں۔

وہ بھاگم بھاگ اماں جی تک پہنچے اور مطمئن ہوئے کہ وہ اب سکون سے بستر پر دراز تھیں، ماسی نجو جا چکی تھی۔ وہ اماں جی کے سرہانے جا کھڑے ہوئے تو ان کی نظر نیچے کے اجلے لباس کے بھیگے دامن پر پڑی جس پر اب تازہ مٹی جم گئی تھی۔ انہوں نے بے چین ہو کر قمیض کا دامن یوں تھام لیا تھا جیسے یہ داغ نہ ہو ان کی اپنی پشت کا مغلئی پھوڑا ہو۔

مولانا ملا لوی کو اجلا لباس بھلا لگتا تھا تاہم اس بات کا خاص دھیان رکھتے کہ وہ بے داغ رہے۔ اگر کہیں بھولے سے کوئی داغ لگ جاتا تو وہاں سے یوں جھاڑتے چلے جاتے جیسے سفید کبوتروں کی مست ڈار میں سے اکیلے جنگلی کبوتر کو اڑا رہے ہوں۔

سفید اجلا لباس ان کے بدن پر جچتا بھی خوب تھا۔ قد مناسب درازی لیے ہوئے تھا۔ کمر بھی سیدھی تھی۔ بھرے بھرے کندھوں کے بیچ گردن یوں بلند ہوتی جیسے کبوتر چونک کر ٹھہرتا ہے اور سر اٹھا لیتا ہے۔ بھورے مائل سیاہ خضاب میں رنگی داڑھی، قدرے بڑے مگر چہرے کی گولائی کی مناسبت سے جچ جانے والے ہونٹ، اٹھی ہوئی اور ذرا سا آگے کو جھکی ہوئی ناک، تازگی کا احساس دیتی صاف شفاف اور اجلی جلد، سرمہ لگی آنکھوں

Scanned by CamScanner

سے جھانکتی سفیدی میں سرخ ڈورے اور نیلگوں ڈھیلے جن میں فلک جیسی وسعت اور سمندر جتنی گہرائی تھی۔ چوڑی اور بے شکن پیشانی مقدر کی تختی جیسی جو اپنے حصے کی عبارت مانگتی تھی۔ دراز بال، اتنے دراز کہ کنگھی کرنے پر کانوں کی لوؤں سے نیچے آ کر گردن کو چھونے اور بوسے دینے لگتے۔ عام دنوں میں قرینے سے بنی سفید ٹوپی پہنتے جس میں سے لپک کر نیچے آتی اور بل کھاتی زلفیں اور بھی بھلی لگتی تھیں۔ جمعہ کے روز طلا دوز کلاہ پر کلف اور ابرق بھی سفید ململ کی دستار کا اہتمام کرتے تھے۔ دستار کا شملہ دائیں کان کے عین اوپر سے گزرتے بیچ میں یوں اڑسا لیا کرتے تھے کہ بلندی پا کر اور آگے پیچھے تن کر پنکھ سا بن جاتا جبکہ دوسرا اڑ گردن سے ہوتا، دونوں کندھوں کے درمیان پشت پر پھیل جاتا تھا۔ مولانا ملالوی کی اس وجاہت کی تخلیق کے لیے قدرت نے جتنا سلیقہ برتا تھا لگ بھگ اتنے ہی جتن خود انہیں بھی اسے سنوارنے اور سنبھال رکھنے کو کرنے پڑ رہے تھے کہ ان کا ایمان تھا، اللہ جمیل و یحب الجمال۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ فقط اپنے ایمان کے باعث خود کو سنوارنے اور سنبھالنے کے جتن کرتے تھے کہ یہ ایمان تو بس سج دھج کا جواز بن گیا تھا یوں جیسے دو محبت کرنے والے وجودوں کے بیچ سے بغیر کسی تمنا اور طلب کے ایک نیا وجود تخلیق پاتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اول اول ساری تگ و تاز اس سوال سے بچنے کی محض ایک ادائے ناز تھی جو ان کے بدن کی کھنکتی مٹی کے بیچ گونج بھر رہا تھا۔ تاہم بعد ازاں ایسا دکھنا انہیں اچھا لگنے لگا تھا حتیٰ کہ یہ سب کچھ ان کی شخصیت اور معمول کا یوں حصہ بن گیا جیسے اس کے سوا وہ کچھ تھے ہی نہیں، جب کہ جو کچھ وہ تھے خود اپنی آنکھ پر بھی اسے نہاں نہ کرنا چاہتے تھے کہ ان کا ایمان تھا، عین لا تری قلب لا یحزن' کہ جب آنکھ نہیں دیکھتی تو دل بھی غم زدہ نہیں ہوتا۔

ان دنوں کہ جب مولانا ملالوی ننھی میاں اور تھنم کہلاتے تھے اور اپنی اماں جی کی اجلی پیٹھ دیکھنے کے بعد ناغول میں چھپ کر دودھ کی دھاروں کے حلقوم میں اترنے کا تصور جمانے لگے تھے، ان کا دل لا یحزن کے ایمانی حیلے سے قطعاً آگاہ نہیں تھا کہ ان دنوں

Scanned by CamScanner

ایمان تسلیم کر لینے اور مان لینے کا نام تھا۔ اندھیرا یوں اندھیرا تھا کہ وہ اندھیرا تھا۔ اس کی منطق کیا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں اور یہ کیوں ہے۔ اضافی سوال تھے۔ اضافیت اور نسبت والے اضافی نہیں، فالتو فضول اور زائد والے اضافی…… بعینہٖ اجالا اس لیے اجالا تھا کہ بھی اسے اجالا کہتے آئے تھے۔ انہیں تعلیم دی گئی تھی کہ وہ جو سب اپنے اپنے ایقان کے ساتھ کسی ایک بات کو متفق علیہ کہتے ہیں وہ اجماع کہلاتا ہے اور اس پر اعتبار کرنا ایمان ہو جاتا ہے۔ ان دنوں یہی ایمان دانش کی بنیاد ہوا کرتا تھا کہ استاد مکرم نے یہی بتایا تھا لولا الایمان فبطلت الحکمۃ، یعنی اگر ایمان کا عدم ہوتا تو حکمت باطل ٹھہرتی۔

ایمان کے نور کی وہ مستقیم کرن جس کے سامنے کوئی منشور رکھا ہوا نہیں تھا تب تک کالعدم نہیں ہوا تھا جب تک انہوں نے صرف ایک محرم، اجلے مگر ممنوعہ بدن کی پیٹھ دیکھی تھی۔ دوسرے محرم بدن کی اجلی اور ممنوعہ پیٹھ پر نظر پڑنے سے پہلے انہیں بجھے ہوئے بے کیف اور یخ بستہ بدن کو مسلسل دیکھنا، سہنا پڑا تھا…… اور غالباً یہی وہ عرصہ تھا جس کے بیچ کہیں وہ کٹھیان لمحہ پڑتا تھا جب روح پر پڑی چونک کی کنفی پہلی بار مسکی تھی۔

اگرچہ بیشتر گمان گمراہ کرتے ہیں لیکن مولانا ملالوی کا غالب گمان یہی تھا کہ وہ کٹھیان لمحہ عین مین وہی تھا جب وہ قد آدم آئینوں کے بیچ جا کھڑے ہوئے تھے اور ایک ایک کر کے اپنے تمام بے داغ اور اجلے پہناوے جو ساری عمر ان کے جیسے پر قطمیر کی طرح رہے تھے، چھیل اتارنے پر خود کو اس باعث مجبور پایا تھا کہ بچشم خود وہ داغ دیکھ سکیں جو راکھ جیسے وجود سے مسلسل جڑنے کے باعث ان کے تن پر ہو سکتے تھے…… وہ داغ تو کہیں نہ تھے بس ایک سرسبز و شاداب بدن تھا، اجلا اور تر و تازہ، جو آئینوں کے بیچ جگمگا رہا تھا اور اس کی جگمگ آئینہ در آئینہ عکس در عکس ہوتی چلی گئی تھی۔

یوں مکمل صورت میں، ہر پہلو سے اور نظر بھر کر ان گنت عکسوں کے بیچ وہ اپنے بدن کو پہلی بار دیکھ رہے تھے اور کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے کہ ان کی نگاہیں مستلذ ہو رہی تھیں۔ خود کو بہ امر مجبوری اور جبر اعتراف کر لینے کے عمل میں وہ لطف کہاں، جو آنکھ اٹھا

Scanned by CamScanner

کر دیکھنے اور دیکھے چلے جانے میں تھا۔

ملک فہیم ریاست کا عقد ثانی پڑھانے کے لیے دوسرے شہر میں انہیں اگلے روز دوپہر تک ہوٹل میں ٹھہر جانا پڑا تھا۔ یہ وہی ہوٹل تھا جس میں وہ گذشتہ شب بارات کے ساتھ پہنچے تھے اور ملحق واش روم میں قد آدم آئینوں کے سامنے کھڑے اپنے اندر اس مسک کو راہ دے بیٹھے تھے جس کی وجہ سے وہ راکھ جیسا وجود بلاقصد خود پر حرام کر بیٹھے تھے جس کا کوئی داغ ان کے بدن پر نہیں تھا۔

(ناول کا ایک باب)

Scanned by CamScanner

مُبین مرزا

سفید پھولوں کے اُس طرف

صبح سے بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ موسم کے اثر نے فضا کو بوجھل بنادیا تھا۔ ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ سردی کی لہر تھی۔ قرۃ العین نے کھڑکی پر پڑا دبیز پردہ ہٹایا۔ کاریڈور سے لان تک خزاں کا اداس منظر پھیلا ہوا تھا۔ باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا ہوا بڑا سا برگد خاموشی کے ساتھ بھیگ رہا تھا۔ گلاب اور صنوبر کے خالی خالی پودے خزاں کی اداسی میں اور اضافہ کررہے تھے۔ چنبیلی کی سب سے اونچی شاخ نہ جانے کب سے زرد لباس پہنے نئے موسموں کے لیے رنگ بن رہی تھی۔ نئی رُت کے لیے خوش بو چن رہی تھی۔ نئی رُت... جو شاید اب کبھی نہ آسکے ۔ کوئی خوشبو، کوئی رنگ شاید اب کبھی نہ کھل سکے۔ اُس نے خود سے کہا۔ رنگ، خوش بو، بہار، خزاں، دھوپ، چھاؤں یہ سب ہمارے احساس کا روپ بہروپ ہے۔ ہمارے اندر پیدا ہونے والے منظروں کا کھیل ہے۔ اندر خزاں ہو تو ساری کائنات پر اداسی چھائی نظر آتی ہے اور اگر اندر بہار ہو تو دنیا میں ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے۔ سب کچھ ہماری ذات کا بھید ہے۔ اس نے سوچا۔ تھکن کا احساس اس کے جسم و جاں پہ طاری تھا۔

کوئی موسم ہو کوئی رنگ ہو یا کوئی گیت
کسی شے میں بھی نہاں اپنا کوئی لطف نہیں
اصل میں بات تو اک شخص سے منسوب ہوا کرتی ہے
شب ہجراں کی سیاہی... کہ کسی آنکھ میں کاجل کہیے
جو بھی دیں نام اسے، رات تو بس رات ہوا کرتی ہے۔
آدمی ذات کے احساس سے معیار بدل دیتا ہے
اس حقیقت کی تو اے دوست خبر ہے لیکن
...خواہشیں اپنے سوا کوئی حقیقت نہیں مانا کرتیں

Scanned by CamScanner

پر اگر سچ ہے تو خود سوچ ذرا
کس طرح تنہا ولی سے اب ہم
زیست کے جام میں زہراب پیار کرتے ہیں
کہ ترے بعد جیا کرتے ہیں
اب کہاں شام کا وہ گیت وہ چنوں کی مہک
چار اس پیڑ تلے تیرے بنا کیا کیجیے
ہم نے مانا کہ بچھڑ کر بھی جیا جاتا ہے
جانے والے مگر اس جی کا بھلا کیا کیجیے

سردیوں کی دھندلی شام بھیگے ہوئے برگد کے سائے تلے گا رہی تھی۔ ایک سرد لہر قرۃ العین کے جسم میں سرایت کرتی چلی گئی۔ لیکن کھڑکی تو بند ہے، اس نے چھو کر دیکھا پھر پردہ چھوڑ کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر کاریڈور میں آ گئی۔ خنکی کا شدید احساس اس کے بدن میں کپکپی پیدا کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے منھ کھول کر سانس باہر چھوڑا، دھوئیں کا مرغولہ بنا۔ ماضی کے بے خواب دریچوں سے گم گشتہ مہتاب کی ایک کرن جھانکی۔ ''قرۃ! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کائنات میں صرف ایک ہی vital force ہے۔ محبت... اگر محبت کا وجود نہ ہو تو یہ کائنات ایک ہول ناک سناٹا بن جائے۔ محبت کے بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں۔ محبت نہ ہو تو ارض و سما کے مہیب بیاباں میں انسان کی ذات ریت کے ایک ذرّے کی طرح ہو جائے بے وقعت، بے معنی، بے مایہ۔ محبت نے انسان کو اعتبار بخشا ہے... زندگی کو معنی عطا کیے ہیں... اس کو کائنات کی وسعتوں میں پھیلایا ہے۔'' وہ دونوں بازو اس طرح پھیلائے کھڑا تھا جیسے کائنات کی حدوں کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کی نیم خوابیدہ آنکھوں میں سرشاری جھلملا رہی تھی۔

''معاف کیجیے گا! ویسے آپ اس وقت شیکسپیئر کا کوئی عظیم کردار لگنے کی بجائے بالکل احمق لگ رہے ہیں۔'' قرۃ العین نے شوخی سے کہا۔

''احمق لگ رہا ہوں؟''

''احمق! ہا ہا ہا۔ بلکہ اُدت لگ رہے ہیں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ دنیا میں محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ محترم! زندگی اونچ نیچ، گرم سرد، دن رات، غرض متضاد سچائیوں سے

Scanned by CamScanner

عبارت ہے۔ ایک سے دوسری کا اثبات ہوتا ہے۔ اونچ کا تصور ہی نیچ سے قائم ہے ورنہ کیا اونچ کیا نیچ۔ تو بس صاف سی بات ہے دنیا میں..''

''مس صاحب! آپ کا قصور نہیں۔'' اس نے قرۃ العین کا جملہ اچکتے ہوئے کہا، ''آپ اکنامکس پڑھتی ہیں۔ آپ کے ہاں خسارہ اور منافع دونوں لازم و ملزوم گوشوارے ہیں۔ اس لیے زندگی کو بھی آپ گوشوارہ بنا کر دیکھتی ہیں۔''

''نہیں اب ایسی بھی بات نہیں۔ ہر آدمی کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔''

''بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔'' اس نے شرارتاً احترام کے ساتھ گردن کو خم دیا۔ ''یہ بندۂ ناچیز ہر شے کا روشن پہلو دیکھتا ہے۔ ویسے قرۃ تمھیں ایک بات بتاؤں۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا، ''مجھے زندگی میں کبھی بھی یہ کمپلیکس نہیں رہا کہ محبت نہیں ملی۔ اتنی محبت ملی ہے مجھے... اتنی کہ ہر طرف ایک ہی رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ شاید میں دنیا بھیجا ہی اس لیے گیا ہوں کہ لوگ مجھ سے محبت کریں۔ بہت سے لوگ۔ شاید ہی اتنی محبت آج تک دنیا میں کسی دوسرے شخص کے حصے میں آئی ہو، شاید...

Come live with me and be my love
And we will all the pleasures prove

وہ کتابوں کو وائلن کی طرح تھامے ہوئے گا رہا تھا۔ ''قرۃ!'' وہ رُک کر بولا، ''ایسا لگتا ہے کہ کرسٹوفر مارلو کو الہام ہوا تھا کہ چار سو سال کے بعد ایک وجیہہ و جمیل نوجوان ہوگا جسے یونی ورسٹی کے اس خوب صورت سبزہ زار میں love tree کے سائے تلے بیٹھ کر ایک نظم گانی ہے۔ اس لیے اس نے یہ نظم لکھ ڈالی، ہاہا... ہاہاہا... ہاہاہا۔'' اپنی بات پر وہ خود ہی کھلکھلا دیا۔

ہوا کے سرد جھونکے نے یک لخت سارا منظر بدل ڈالا۔ قرۃ العین کو محسوس ہوا کہ وہ مسلسل کئی صدیوں سے شام کے اداس آنگن میں یوں ہی تنہا کھڑی ہے، جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ۔ اس نے پشت پر باندھے ہوئے ہاتھ جو سردی سے سُن ہو رہے تھے، کھول کر گالوں پر رکھے۔ ٹھنڈک کا احساس سارے جسم میں اترتا چلا گیا۔ ''عاطف تم ٹھیک کہتے تھے۔ تمھیں دنیا میں صرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ لوگ تم سے محبت کریں۔ کچھ لوگ اسی لیے پیدا کیے جاتے ہیں کہ انھیں چاہا جائے، ان کی پوجا کی جائے۔ تم انھیں لوگوں میں

Scanned by CamScanner

سے ہو۔" وہ خود سے کہہ رہی تھی۔ ٹھنڈے ہاتھ سہلاتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں واپس آگئی ہے۔ آتش دان میں لکڑیاں دھیرج کے ساتھ سلگ رہی تھیں۔ وہ قریب ہی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

Mater Dolosa کیا ہم ابد تک یوں ہی دکھ اٹھاتے رہیں گے؟ کیا ہمیں کرائسٹ کے بعد بھی اپنی سچائیوں کی گواہی کے لیے اسی کی طرح ہمیشہ دکھوں سے گزرنا ہوگا؟ اس نے آتش دان سے اوپر دیوار پر لگی ہوئی مادرِ غم خوار کی مورتی کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر آنکھیں موند کر کرسی کی پشت پر سر ڈال کر جھولنے لگی۔

یونی ورسٹی کی آرٹ گیلری میں خاصی گہما گہمی تھی۔ پروفیسر درّانی نے لمحے بھر دروازے پر کھڑے ہو کر حسبِ معمول بائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے سر کھجلایا اور ہال پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا، "مائی ڈیئرز! رش ہے، enjoy yourself... ہم سب اکٹھے تصویریں نہیں دیکھ سکتے۔" وہ اسٹیج کی طرف چلے گئے جہاں کئی اور پروفیسر کھڑے ہوئے تھے۔ کلاس ٹکڑوں میں بٹ کر ہجوم میں شامل ہو گئی۔

"بات یہ ہے کہ عبدالرحمٰن چغتائی اگر خود مغل زادہ نہ ہوتا تو اس تصویر میں یہ گہرائی ہرگز پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ بھئی اورنگ زیب عالم گیر جیسے عظیم الشان فرماں رواں کو استغراق کے لمحے میں پینٹ کرنا اور وہ بھی اس سادگی اور نفاست کے ساتھ کوئی معمولی بات تھوڑا ہی ہے۔ واہ۔ سبحان اللہ۔" عاطف نے متفکرانہ انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں جناب! پینٹنگ کی تشریح بھی تو ایک مغل زادہ کر رہا ہے۔ سلطنت سے محروم ہے تو کیا ہوا، ہے تو مغل زادہ۔" امجد نے عاطف پر چوٹ کی۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔

"لیکن جناب! انجمن آرا کی یہ تصویر بھی چغتائی کے سوا دوسرا کوئی آرٹسٹ نہیں بنا سکتا تھا۔" برابر میں کھڑے ہوئے لڑکیوں کے ٹولے سے آواز آئی۔ سب کی نگاہیں بیک وقت تصویر کی طرف اٹھیں۔ یہ تصویر مغل جمالیات کے تصور کی جھلک تھی۔ انجمن آرا جو تصویر کا مرکزی کردار تھی، سبز لباس پہنے، سرخ پتوں کے سائے میں دکھائی گئی تھی اور پتے کچھ ایسی صورت میں وضع ہوئے تھے کہ ایک قدرتی قسم کی ... چغتائی ...

صورت ظاہر ہو رہی تھی۔ چغتائی کے خاص اسلوب اور پسندیدہ موضوع کے باعث یہ تصویر ایک عجیب سحر انگیز جمال و جلال کا تاثر لیے ہوئے تھی۔

''بلاشبہ چغتائی عظیم فن کار ہے اور آپ کی پسند بھی بے مثال ہے۔'' عاطف نے کئی لمحے تصویر کو مبہوت ہو کر دیکھنے کے بعد، تصویر کی نشان دہی کرنے والی کی طرف توجہ کی۔

نمائش میں انجمن آرا کی تصویر سے تعارف ہونے کے بعد جلد ہی عاطف اور قرۃ العین میں بے تکلف دوستی ہوگئی۔ قرۃ العین اکنامکس اور عاطف انگریزی ادب میں ایم اے کر رہا تھا۔ چوتھا پیریڈ اتفاق سے دونوں کا خالی تھا جس میں وہ پائیں سبزہ زار کے برگد تلے بیٹھ کر دنیا بھر کے موضوعات پہ گفتگو کیا کرتے تھے۔ برگد کا یہ پیڑ یونی ورسٹی میں love tree کے نام سے شہرت رکھتا تھا۔ گزشتہ اسی برسوں میں اسlove tree نے نہ جانے کتنے چہرے دیکھے تھے۔ سرگوشیوں میں بات کرنے والے کتنے لوگوں کی باتیں سنی تھیں، کتنوں کو خواب بنتے دیکھا تھا، کتنے گلے شکوے اور کتنے قول و قرار اس کے آغوش میں ہوئے تھے۔ جانے کتنے چہرے اور کتنے نام اس بوڑھے نیم کے حافظے میں محفوظ ہوں گے۔ وہ نام، وہ چہرے جنھیں مرور زمانہ نے بے رنگ کر دیا ہوگا... مٹا دیا ہوگا... لیکن بہت سے نام آج بھی اس پیڑ کے حافظے میں اسی شادمانی اور تازگی کے ساتھ زندگی ہوں گے... ہاں مگر یہ کون دیکھے... یہ کسی کو نہیں معلوم کہ برگد کے اس پیڑ کو کس نے اور کب love tree کا نام دیا تھا لیکن اس سے وابستہ ایک روایت سب کو معلوم تھی، یہ کہ جب کوئی جوڑا اس کے سائے میں آن بیٹھتا تو کوئی شخص، کوئی دوسرا جوڑا وہاں نہیں آتا تھا۔ گویا یہ ایک گوشۂ عافیت تھا جہاں پہنچ کر محبت کرنے والے مطمئن ہو جاتے تھے کہ اب کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی وہم ان کی بزم ناز میں مخل نہیں ہوگا۔

''عاطف! میرا خیال ہے کہ تم ضرورت سے کچھ تھوڑے زیادہ لبرل ہو۔'' وہ کھلکھلائی۔

''یہ آپ فرما رہی ہیں محترمہ! آپ تو پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ تعلیم یافتہ آدمی روشن خیال اور وسیع القلب ہوتا ہے اور میں ایک پڑھا لکھا اور باشعور آدمی ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں لبرل وبرل کچھ نہیں ہوں۔ میں

Scanned by CamScanner

انسان کو انسان سمجھتا ہوں، اسے اپنی علاحدہ سوچ اور نظریۂ زندگی رکھنے کا حق دیتا ہوں اور میرے نزدیک اصل اہمیت انسان کی ہے، اس کے نظریے، عقیدے، مذہب یا فلسفے کی نہیں۔ سمجھیں آپ، مس اکنامکس؟''

''میں آپ کی عظمت کو سلام کرتی ہوں۔''

''ملکہ عالیہ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، بندہ پروری ہے۔'' وہ کورنش بجا لایا۔

''اچھا عاطف ایک بات بتاؤ۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا، ''کیا دو مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے علاحدہ مذاہب کے ساتھ اکٹھے رہ سکتے ہیں؟ ایک مطمئن مشترک زندگی گزار سکتے ہیں؟''

''دیکھو قرۃ! مذہب انسان کا قطعی ذاتی معاملہ ہے اور یہ تفریق کم سے کم انسان کا مرتبہ بحیثیت انسان تو کم نہیں کرتی۔ میں سمجھتا ہوں دو انسان جو دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، ایک خوب صورت، مطمئن اور مشترک زندگی گزار سکتے ہیں... لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری رائے یہ ہے کہ آئندہ زندگی کی خوشیوں کو یقینی تحفظ فراہم کرنے کے لیے دونوں ایک ہی مذہب کے ماننے والے بن جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا اور یہ ایسا مشکل کام بھی نہیں۔ سارے مذاہب انسان سے محبت کا درس دیتے ہیں، اس لیے کسی بھی مذہب کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔'' عاطف نے جواب دیا۔ وہ دونوں حسبِ معمول love tree کے سائے تلے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

سیشن کے آخری دن چل رہے تھے۔

فائنل ایئر کے سب ہی لوگ ایک عجیب سی الجھن کا شکار تھے۔ ایک بے نام سی خلش اندر ہی اندر گھائل کر رہی تھی۔ اداسی نے دلوں میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ زندگی کے تعلیمی سال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہے تھے۔ زندگی کا سنہری دور مالی کی طرح باغ کے آخری چند پھول چن رہا تھا۔ آئندہ زندگی کے لیے یوں تو ہر شخص کے پاس کچھ خواب اور خواہشیں تھیں، نئے منصوبے اور ارادے تھے لیکن ہر دل میں ایک چبھن سی بھی تھی۔ اب یہ چہرے، یہ صحبتیں، یہ کاریڈورز، لان، لیکچر تھیٹرز سب کچھ... گئے زمانے کی باتیں ہو کر رہ جائیں گے، بیتے ہوئے خواب و خیال کا حصہ بن جائیں گے۔ love tree کے سائے میں جیون کے لمحوں کو امر کرنے والے لوگ کچھ زیادہ گرفتہ دل نظر

آتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے نئی زندگی کے خواب اس بیتے لمحے کی خاک سے جنم لیں گے... جیسے قبر پہ پھول کھلا کرتے ہیں۔ پیریڈ تو ویسے ہی اب کم ہوتے تھے، جو ہوتے، ان میں بھی خود پروفیسر صاحبان ضروری نوٹس یا ہدایات کے بعد زندگی کے نئے سفر کا قصہ لے بیٹھتے تھے۔ خالی پیریڈ میں کینٹین کے کارنر یا لان کے دور دراز بینچوں پر بیٹھے ہوئے نفسوں کے جوڑے دھیمے سُروں میں آئندہ زندگی کے منصوبے بناتے، تجدید عہد کرتے اور ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے دکھائی دیتے تھے۔ انگریزی ادب ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے لان میں شمالی کونے کی پشت والی بنچ پر بیٹھے ہوئے عاطف اور قرۃ العین ایسے ہی ایک منظرنامے کا حصہ تھے۔

''عاطف! کیا ضروری ہوتا ہے کہ وہ احساس جسے ہم کوشش کے باوجود لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے، اسے لازماً دوسروں تک منتقل کریں؟''

''قرۃ! زندگی میں کچھ بھی ضروری نہیں ہوتا لیکن وہ ضروری ہو جاتا ہے جسے ہم اہمیت دینے لگتے ہیں۔ بہت سی معمولی باتیں بعض اوقات ہماری زندگی میں بہت ضروری، بے حد اہم ہو جاتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں، کچھ باتیں ہم لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے اور... اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض باتیں لفظوں میں کہے بغیر دوسروں تک پہنچ جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود قرۃ! ہم وہی باتیں لفظوں میں سننا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ انھیں لہجے کی شدت اور لفظوں کی حدت کے ساتھ اپنے اندر جذب کریں اور کبھی کبھی ہمیں وہ ضرور کہنا چاہیے جو ہم نہیں کہہ سکتے!''

''سارے احساسات تو لفظوں میں نہیں آ سکتے تو کیا ہم ادھورے...؟''

''ہاں جذبوں کی حدت کے ساتھ جتنے لفظ ہمارے پاس ہوں وہ ہمیں کہہ ڈالنے چاہئیں۔''

''عاطف! دل کی انگلی تھام کر چلنے والے لوگ، کیسے ہوتے ہیں!''

''ہاں، ہیملٹ ٹھیک تو کہتا ہے، What a piece of work man is!۔''

''ہاں بس اب تم ہیملٹ کا راگ الاپنے لگو گے۔'' وہ ہنسی

''اوہ تو لیڈی میکبتھ!'' وہ بھی اس کے ساتھ کھلکھلایا۔

Scanned by CamScanner

بیت المقدس کے واقعے نے کسی نہ کسی طور سے ایک دنیا کو متاثر کیا تھا۔ کہیں سیاسی اثرات دیکھنے میں آئے تو کہیں مذہبی حالات نے رخ بدلا اور کہیں علاقائی، معاشرتی اور فکری صورت حال نے کروٹ لی۔ مسلمان ممالک کا ردِ عمل قدرے مختلف قسم کا تھا۔ یہودی لابی کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر شدت پسند لوگوں نے عیسائیوں اور ہندوؤں کے خلاف بھی زوردار نعرے بازی کی۔ کئی جگہ فسادات ہوئے۔ سڑکوں پر جلوس نظر آئے، جلسے ہوئے، قرار دادیں پاس کی گئیں۔ مسئلہ اقوام متحدہ میں اٹھائے جانے تک فضا میں گہما گہمی اور گرمی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ صورتِ حال معمول پر آتی چلی گئی اور جلسے جلوسوں کی بجائے یہ موضوع ڈرائنگ روم کی گفتگو بن گیا۔

وہ دونوں کانٹی نینٹل کے مدھم قرمزی روشنیوں والے ہال میں بیٹھے ہوئے، گئے دنوں کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ بات ہوتے ہوتے حالاتِ حاضرہ تک آ گئی۔

"اس معاملے میں مسلمانوں کا ردِ عمل بے حد احمقانہ رہا ہے۔" قرۃ العین نے سر جھٹکتے ہوئے کہا، "بھلا ایک ایسا واقعہ جو دوسرے ملک میں ہو اس پر اپنے ملک میں اس طرح احتجاج بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟"

عاطف کا رنگ سرخ ہو گیا۔ "یہ تمہارا مسئلہ نہیں تھا، اس لیے تم اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔" اس نے جھلا کر جواب دیا۔

"کیا کہہ رہے ہو عاطف!" قرۃ نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے عاطف سے ایسے جملے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر ہم اس موضوع پر بات نہیں کرتے۔" قرۃ نے صورتِ حال سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہمیں اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے۔" عاطف کے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

☆☆

"قرۃ! کیا سو گئی ہو بیٹی؟"

"نہیں ڈیڈی، نہیں تو۔" قرۃ العین آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے،

Scanned by CamScanner

آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ ڈیڈی کی آواز پر اس نے یک دم چونک کر آنکھیں کھولیں۔
آن کی آن میں سارا منظر بدل گیا۔

''باہر بہت کہرا ہے بیٹی۔'' ڈیڈی نے کرسی آتش دان کے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔

''یس ڈیڈی! بہت دھند ہے، بہت دور تک۔''

''یہ سب دسمبر کا کمال ہے۔ دیکھو جیسے جیسے کرس قریب آرہا ہے ہر چیز دھل کر نکھرتی جارہی ہے، پاک ہوتی جارہی ہے۔''

''ہوں... یس ڈیڈی!'' وہ ہاتھ تاپنے لگی۔

''قرۃ! بیٹی میں دیکھ رہا ہوں تم زیادہ خاموش رہنے لگی ہو۔ کیا تمہارے دل پر کوئی بوجھ ہے۔ تمہارے مزاج میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ تم اب گیم کرنے نہیں جاتیں۔ چرچ بھی نہیں جاتیں۔ مجھے بتاؤ بیٹی کیا بات ہے؟'' ڈیڈی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''نو ڈیڈی، نو پرابلم۔''

''نہیں بیٹی! I am your father۔ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔ مجھ سے کہہ ڈالو میری بچی۔ کہنے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''ڈیڈی!'' اس نے ملول نظروں سے انھیں دیکھا۔

''ہاں ہاں، بیٹی کہو۔ کیا بات ہے؟''

''ڈیڈی! عاطف...''

''ہاں ہاں، کیا ہوا اُسے؟ بہت دن سے وہ یہاں نہیں آیا۔''

''ڈیڈی! میرا اور اس کا جھگڑا...''

''لیکن جھگڑا کیوں ہوا بیٹی؟ وہ تمہارا دوست ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔''

''نو ڈیڈی! وہ کٹر قسم کا مسلم ہے۔ لیکن، لیکن ڈیڈی میں اس سے محبت کرتی ہوں۔''

''اوہ شیور۔ دوستوں سے تو انسان محبت کرتا ہی ہے۔''

''نو ڈیڈی، میں اس کے بغیر... ڈیڈی... He is...''

Scanned by CamScanner

"تمھیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو قرۃ! یہ کیسے ممکن ہے؟" ڈیڈی کے چہرے پر تناؤ کے آثار تھے۔

"یس ڈیڈی... میں اس کے بغیر..."

کیا ہوگیا ہے تمھیں... وہ... مسلمان ہے!" ڈیڈی قدرے درشتی سے بولے۔

"میں مجبور ہوں ڈیڈی۔"

"بے وقوف مت ہو بیٹی۔" تم ایک تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہو۔ یہ بچکانہ باتیں تمھیں زیب نہیں دیتیں۔"

"نو ڈیڈی! میری عقل، میری تعلیم، میرا شعور، عاطف کا نام آتے ہی سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ میں بالکل بے بس ہوجاتی ہوں۔ ڈیڈی! I swear، میں تین مہینوں سے مدافعت کررہی ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی ہے، میں اس خیال کو جھٹک دوں، لیکن کوئی راستہ نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم میں چلتے چلتے کہاں تک آگئی ہوں لیکن مجھے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ ڈیڈی! میں مجبور ہوں۔ میں کچھ نہیں کرسکتی۔"

"قرۃ! انسان کا نفس اسے پراگندہ کرتا ہے، اسے خواہشوں کے جال میں جکڑ لیتا ہے۔ خواہشیں انسان کی روح کو آلودہ کرتی ہیں۔ گناہ جنم لیتا ہے خواہش سے۔ انسان کا ازلی گناہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ اس کی روح کو کچل ڈالتا ہے۔"

"نہیں ڈیڈی، یہ گناہ نہیں ہے۔ اس نے کہا تھا کہ..."

"کچھ نہیں کہا تھا اس نے... یہ سب پاپ کے بہکاوے ہیں۔" ڈیڈی نے غصے سے کہا لیکن اگلے ہی لمحے ان کے لہجے میں ملائمت آگئی۔ "بیٹی! تمھیں کنفیشن کی ضرورت ہے۔ تمھاری سوچ پر گناہ کا غلبہ ہے۔ تمھیں چرچ جانا چاہیے فوراً تاکہ تم طہارت سے آسودہ ہوسکو، تمھاری روح کو چین ملے۔"

"ڈیڈی! میں نے اس کے مذہب کا مطالعہ کیا ہے۔ کچھ باتیں وہی ہیں جو کرائسٹ نے ہمیں بتائی تھیں۔ وہ کرائسٹ کا انکار نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا ہولی فادر آخری مذہب لے کر آیا ہے، جو سچا ہے۔ اس پر عمل کرکے انسان کو اس دنیا کی اور heavenly خوشیاں مل سکتی ہیں۔ انسان کی نجات اب صرف ان کے مذہب میں ہے۔ کیوں کہ اور سارے مذاہب لوگوں نے بدل دیے ہیں اور کرائسٹ خدا کا بیٹا نہیں

ہے۔ وہ تو ایک انسان ہے۔''

''قرۃ! تم بہت بہک گئی ہو۔ تم نے گناہ کیا ہے۔ فوراً توبہ کرو اور رجوع لاؤ تاکہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں اور خداوند کے حضور سے تازگی کے دن آئیں۔ تم صبح میرے ساتھ فادر کے پاس چلو گی۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ فوراً تمہیں وقت دیں تاکہ تمہارا کنفیشن ہو سکے۔''

فادر نے قرۃ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''پیاری بچی!'' وہ بہت محبت سے بولے، ''خداوند نے یوحنا میں کہا ہے، اگر ہم اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو وہ ہمارے گناہوں کو معاف کرنے اور ہمیں ساری ناراستی سے پاک کرنے میں سچا اور عادل ہے (یوحنا۔ ۱:۹)۔ پس ہمیں چاہیے کہ جب کوئی گناہ ہم سے سرزد ہو جائے تو ہم سچے دل سے معافی مانگ لیں اور رجوع لائیں اور یاد رکھو یسوع نے کہا ہے:

''راہ حق اور زندگی میں ہوں۔

کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا۔'' (یوحنا۔ ۱۴:۶)

وہ لمحہ بھر رکے پھر نرمی سے بولے، ''باپ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہی ہمارے دل کو سکون ملتا ہے۔ دنیا کے گناہوں سے پاک ہونے اور روح کو منزّہ کرنے کا ذریعہ کنفیشن ہے۔'' فادر کا محبت بھرا لہجہ قرۃ کی روح میں مٹھاس اتارتا چلا گیا تھا۔ وہ ان کے سامنے سر جھکائے، خاموش بیٹھی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بہت جلد ہر دکھ اور ہر پریشانی سے نجات حاصل کر لے گا۔

''بیٹی جاؤ کنفیشن کرلو۔'' ڈیڈی نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ فادر اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ وہ بھی اٹھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی فادر کے پیچھے چلنے لگی۔ ہال میں کرائسٹ کے سامنے پہنچ کر فادر نے صلیب بنائی اور بائیں جانب بنے ہوئے اونچے چبوترے پر قرۃ العین کو کھڑا کر کے خود پردے کے پیچھے چلے گئے۔ چرچ کے اس وسیع ہال میں چند لمحے گہرا سکوت رہا۔ قرۃ العین اپنی بے ترتیب ہوتی ہوئی سانسوں کی آواز سن رہی تھی۔ فادر کی بھاری بارعب مگر ملائم آواز ابھری، ''کہو میری بچی! وہ سب کچھ کہہ ڈالو جس نے تمہارے دل میں گناہ کا بیج بویا اور تمہاری روح

Scanned by CamScanner

کو آلودہ کیا۔ باپ کے سامنے سب کچھ کہہ ڈالو۔ خدا کسی کی ہلاکت نہیں چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ سب کی توبہ تک نوبت پہنچے۔" (۲۔ پطرس۔ ۳:۹)

برآمدے میں رکھی ہوئی وکٹورین طرز کی گول میز پر دونوں کہنیاں ٹکائے اور دونوں ہاتھوں کی مٹھی پر ٹھوڑی رکھے ہوئے ڈیڈی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دور، اس طرف فضا میں ایک سفید کبوتر ابھرا ڈیڈی کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ وہ بہت آہستہ آہستہ پر مار رہا تھا جیسے بہت مضمحل اور تھکا ہوا ہو۔ ڈیڈی کے دل میں یک لخت اس کے لیے ہم دردی اور محبت کے جذبات امڈ آئے۔ کبوتر نے غوطہ لگایا۔ ڈیڈی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ پھر ابھرا اور سامنے بنی ہوئی بڑی سی بلڈنگ کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"خداوندا تمھاری حفاظت کرے۔" ڈیڈی کے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

"خداوندا! میری بچی کی بھی حفاظت کرے، اسے راستی پر لائے، اس کی روح کو قرار دے۔" ڈیڈی نے زیرِ لب کہا۔ ان کا دھیان بیٹی کی طرف پلٹ گیا جو فادر کے ساتھ کنفیشن کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اے خداوند تو ہی بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتا ہے۔ انھوں نے دل میں کہا اور صلیب بنائی۔

"اے یسوع کے باپ!" قرۃ نے دھیرے دھیرے پکارا۔ "اے خداوندا! تو رحیم ہے کہ ہمارے گناہ جو ہماری روح کو آلودہ اور بوسیدہ کرتے ہیں تو مٹا کر ہمیں دوبارہ تازہ کر دیتا ہے۔ اے ہمارے باپ، تیرے حضور اپنا وہ دھیان... جو... جو میری روح کو بھاری کر رہا ہے..." قرۃ کی آواز آنا بند ہو گئی۔

کئی لمحے گہرا سکوت رہا۔

"میری بچی کہو... کہو کہ خدا کسی کی ہلاکت نہیں چاہتا۔" فادر کی آواز ابھری۔

"خداوند خدا! تو دل کی باتیں جان سکتا ہے۔" قرۃ نے پھر بولنا شروع کیا۔ "لیکن تو ہم سے ہمارا اقرار ہمارے لفظوں میں سننا چاہتا ہے، تاکہ ہماری پکار کے جواب میں تو ہم پر رحم کر سکے اور ہمیں کائنات کے اس مہیب سناٹے میں اپنی پکار کا جواب ملتا ہے تو ہمیں نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں، ہمارے گناہ کو دھو دیا گیا۔ اے خداوند خدا! میں تیرے بیٹے کے وسیلے سے تجھے پکارتی ہوں۔ میرے دل کے

Scanned by CamScanner

اس بوجھ کو ہٹا دے۔ میں اقرار کرتی ہوں، میں ایک غیر مذہب کی چاہت کے گناہ کی اسیر ہوئی۔ میں نے یسوع کے حکموں کو فراموش کیا۔ مگر تو رحم کرتا ہے۔ میرے گناہ کو مٹا کر مجھے تازہ کر دے تاکہ میری روح آسودہ ہو جائے۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے کرائسٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے پسینے سے شرابور جسم پر لرزہ طاری تھا۔

چند لمحے سکوت رہا۔

''میری بچی! باپ کے آگے گڑگڑاؤ، اس سے مانگو۔'' پردے کے پیچھے سے فادر کی آواز آئی۔ ''پکارو... اے پکارو! اے خدا اپنی شفقت کے مطابق مجھ پر رحم کر،

اور اپنی رحمت کی کثرت کے مطابق میری خطائیں مٹا دے۔

میری بدی کو مجھ سے دھو ڈال

اور میرے گناہ سے مجھے پاک کر

کیوں کہ میں اپنی خطاؤں کو مانتی ہوں۔ (زبور ۵۱: ۱۔۳)

بچی! خدائے قدوس کے حضور پکارو!

اے خدا میرے اندر پاک دل پیدا کر

اور میرے باطن میں

از سرِ نو مستقیم روح ڈال دے۔'' (زبور ۵۱: ۱۰)

فادر چپ ہو گئے۔ ہال میں خاموشی گونجنے لگی۔

''خداوندا!'' قرۃ العین نے بولنا شروع کیا، ''یسوع نے انسانوں کو بتایا باپ مہربان ہے۔ وہ رحم کرتا ہے، محبت کرتا ہے۔ اس سے رحم اور محبت طلب کرو۔ میں وہی مانگتی ہوں جس کی یسوع نے تلقین کی۔ میں رحم مانگتی ہوں۔'' وہ چپ ہو گئی۔ ہال پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔ اس بار فادر بھی خاموش تھے۔

''مگر خداوند خدا! یسوع نے ہمیں مذہب دیا...'' قرۃ العین نے پھر بولنا شروع کیا۔ اس بار اس کی آواز قدرے اونچی تھی۔ ''...اور کہا یہ تیرا بتایا ہوا راستہ ہے۔ اس نے کہا کہ تو سراپا محبت ہے اور مذہب تیرا پیغام ہے۔ محبت راستی ہے، محبت حق ہے، محبت سچائی ہے۔ محبت خداوند خدا ہے۔ لیکن یسوع کے بندوں کی دنیا میں محبت ایک پاپ ہے خداوند خدا!...'' قرۃ العین کی آواز میں تیزی اور لہجے میں شدت آ گئی۔ ''اگر تیرا پیغام

Scanned by CamScanner

محبت ہے تو محبت باپ کیوں ہے؟ تو اگر سراپا محبت ہے تو پھر محبت سے فساد کیوں جنم لیتا ہے؟ مذہب اگر تیرا پیغام ہے تو یہ انسانوں میں تفریق کیوں پیدا کرتا ہے؟ انسان مذہب کی وجہ سے گروہوں میں تقسیم کیوں ہو جاتے ہیں؟ ایک دوسرے سے دور کیوں ہو جاتے ہیں؟ نفرت کیوں کرنے لگتے ہیں؟ اے خداوندا! مذہب اگر محبت ہے تو اس سے انسانوں کے اندر کی تاریکی دور کیوں نہیں ہوتی؟ اے خداوندا! انسان کی محبت کے درمیان جب مذہب آتا ہے تو محبت نفرت میں کیوں بدل جاتی ہے؟ یہ سب کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تیری دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' قرۃ العین ہذیانی انداز میں چیختے چیختے خاموش ہو گئی۔ اس کی تیز چلتی ہوئی بے ربط سانسوں کی آواز ہال کے سناٹے کی سائیں سائیں کی گونج بڑھا رہی تھی۔

چند لمحوں بعد فادر کی بھاری بھر کم آواز ابھری، ''ہولی فادر! ہم تجھ سے تیرا رحم طلب کرتے ہیں...! ہمیں راستی پر لا... ہماری روح کو سکون بخش۔'' تھوڑی دیر بعد وہ پردے سے باہر قرۃ العین کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرخی اور چہرے پر تناؤ تھا۔ انھوں نے کرائسٹ کی مورتی کے سامنے کھڑے ہو کر صلیب بنائی اور گردن خم کی۔ ''بچی! باہر آجاؤ۔'' ان کے لہجے میں وہی نرمی اور حلاوت تھی۔ قرۃ العین ان کے پیچھے تھکے تھکے قدموں سے باہر آگئی۔

''یہ دنیا ہمارا نفس ہے جو ہمیں باپ سے اور اس کے بتائے ہوئے راستے سے دور کر دیتا ہے۔ پھر ہمیں لوٹ کر آنا دشوار لگتا ہے۔ لیکن اگر ہم کوشش کرتے رہیں تو باپ ہمیں اپنی محبت سے سہارا دیتا ہے اور پھر ساری مشکلیں دور ہو جاتی ہیں۔ ہمیں بار بار رجوع لانا چاہیے۔ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔'' فادر نے دھیرج سے کہا۔ ان کی آواز میں مٹھاس اور چہرے پر شفقت تھی۔ انھوں نے محبت کے ساتھ ایک نظر قرۃ العین اور ڈیڈی پر ڈالی، ان کے ہونٹوں پر ایک غیر مرئی مسکراہٹ کا عکس تھا۔ وہ اندر چلے گئے۔

''آؤ بیٹی! خداوند تمھیں سکون دے۔'' ڈیڈی نے محبت بھری نگاہوں سے قرۃ العین کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیا انسان اپنے احساس سے، اپنی سوچوں سے اور اپنے جذبوں سے بے نیاز ہو کر بھی جی سکتا ہے؟ کیا اس کی زندگی میں دائمی سکون بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ قرۃ العین نے چرچ سے باہر آتے ہوئے فادر کے

Scanned by CamScanner

بارے میں سوچا اور خود سے پوچھا۔

قرۃ العین کو فادر کے پاس چرچ آتے ہوئے دو سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ prayer میں شریک ہوتی تھی۔ کبھی یوں ہی فادر کے پاس باتیں کرنے کے لیے چلی آتی۔ وہ اس سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ دو مہینے پہلے فادر کا بھتیجا ٹامسن انگلینڈ سے ایم بی اے کر کے واپس آیا تھا۔ شام کو اسکواش کھیلنے جاتے ہوئے اکثر اس کا قرۃ العین سے سامنا ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ یہ میل جول دوستی کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ ٹامسن ایک وجیہہ آدمی تھا اور اس کی قرۃ العین سے دوستی کی وجہ سے فادر کی مہربان شخصیت کچھ اور شفیق ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ قرۃ العین کے مزاج کی وہ بشاشت اور شوخی جو حالات کے باعث ختم ہو کر رہ گئی تھی، ایک بار پھر بحال ہو گئی۔

گرمیوں کے بعد حبس کے دن بھی گزرتے چلے گئے تھے۔ موسم بہتر ہو گیا تھا۔ قرۃ العین لان میں بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی تھی جب ٹامسن وہاں آیا۔ ''چلیے جناب ہم آپ کو لینے کے لیے آئے ہیں۔'' اس نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن کہاں...؟''

''ہمارے دوستوں کا ایک چھوٹا سا get togather ہے... وہاں۔''

''میں وہاں کیا کروں گی؟''

''وہی جو میں کروں گا جو اور سب لوگ کریں گے... آپس میں ملیں گے، گپ کریں گے اور جو کچھ بھی ہوگا وہیں چل کر دیکھ لیجیے گا۔''

''لیکن میں تو تیار بھی نہیں ہوں، میرا مطلب ہے ڈریس اَپ نہیں ہوں۔''

''آپ یوں ہی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ آپ کو تیاری کی کیا ضرورت ہے اور پھر یہ کوئی فارمل قسم کی پارٹی نہیں ہے۔ آیئے! یوں ہی آجایئے۔'' ٹامسن نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

واپسی پر خاصی دیر ہو گئی تھی۔

''ڈیڈی بے چارے میرے انتظار میں اب تک جاگ رہے ہوں گے۔''

قرۃ العین نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، آئی ایم سوری، ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا۔'' ٹامسن نے ونڈ اسکرین سے

Scanned by CamScanner

نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''قرۃ! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔ مجھے تمہید وغیرہ کچھ نہیں آتی اور نہ ہی اشاروں اور کنایوں میں کچھ کہنا آتا ہے، اس لیے... میں بس ایسے ہی ڈائریکٹ... آپ سے... میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی...'' قرۃ العین نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، جیسے اس نے جو کچھ سنا ہے، وہ غلط ہے۔

ناسن نے لمحے بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگا۔

قرۃ العین نے کوئی جواب نہ دیا۔ سفر خاموشی سے جاری رہا۔

''مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔'' ناسن نے قرۃ العین کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

قرۃ العین نے اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے گاڑی سے اتر کر چلی گئی۔

رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ گزری ہوئی زندگی کے کتنے ہی واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن پر کوندے کی طرح لپک رہے تھے۔ عاطف سے آخری ملاقات کا منظر ابھرا۔

''عاطف! تم نے تو کہا تھا کہ مذہب کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی بنا پر انسان کے سماجی رشتے اور تعلقات متاثر ہوں۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود دو افراد ایک مشترک زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''غلط کہا تھا میں نے۔ مجھے حقیقت معلوم نہیں تھی۔ مذہب دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔ کوئی انسان اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن مذہب انسانوں کے لیے ہوتا ہے، انسان تو... اور پھر مذہب تو انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا سبق دیتا ہے۔'' قرۃ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''ہمارے درمیان ایک بڑا سمندر حائل ہے قرۃ! ہم دونوں دو مختلف کنارے ہیں جو متوازی تو چل سکتے ہیں لیکن کبھی مل نہیں سکتے۔''

''نہیں ہم دونوں جیتے جاگتے، پڑھے لکھے انسان ہیں جو ایک کنارے پر بھی

اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ ہم میں سے ایک آدمی دوسرے کے پاس پہنچ سکتا ہے؟"

"لیکن کون؟" اس کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ تھی۔ "کون جائے گا دوسرے کے پاس؟ میں اپنا مذہب ترک نہیں کر سکتا۔ تم کر سکتی ہو، تم لڑکی ہو تمھیں کرنا چاہیے۔"

"کیا...؟ لڑکی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ لڑکی کم تر ہوتی ہے؟ لڑکی کا مذہب کوئی اہمیت نہیں رکھتا...؟ تم کیوں نہیں چھوڑ سکتے اپنا مذہب؟"

"میں مرد ہوں۔ میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ اور میرا مذہب افضل ہے۔"

"What a non sense! ایک ہی خدا کے بھیجے ہوئے مذہب بھی برتر اور کم تر ہو سکتے ہیں اور یہ مرد ہونا کون سی بڑائی ہے؟ ہم صرف انسان ہیں صرف انسان۔"

"ہاں ہاں ہم انسان ہیں لیکن مرد عورت بھی ہیں۔ مرد مرد ہے اور عورت عورت ہے۔"

"مجھے کوئی احساس کم تری نہیں۔"

"نہ ہو لیکن میں اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتا اگر تم..."

"عاطف! ہماری دوستی انسانی بنیاد پر ہوئی تھی۔ میں کم تر ہو کر اسے قائم نہیں رکھ سکتی اور نہ رکھنا چاہتی ہوں۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ باہر دیکھنے لگی، شام جیسے یک بیک رات کی تاریکی میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔

اس شام کو گزرے چار سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ اس کی عاطف سے اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سال بھر پہلے اس نے سنا تھا کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا ہے۔

"مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔" اس کے ذہن میں ثامسن کا جملہ گونجا۔

آئی ایم رئیلی سوری ثامسن، تم نے ہارے ہوئے جوکی پر جوا کھیلا ہے، مجھے تم سے ہم دردی ہے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے وہ جھول رہی تھی۔ دریچے میں سے نظر آنے والا آسمان بہت دور اور بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔

Scanned by CamScanner

ہیپی نیو ایئر اینڈ ہیپی برتھ ڈے ٹو می۔ اپنے آفس کی میز پر نیا ٹیبل کیلنڈر دیکھ کر قرۃ العین نے خود سے کہا۔ اس کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے ایک اداس مسکراہٹ ابھری۔ اسے دفتر میں ملازمت کرتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہوگیا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ مجھے فادر کو ہیپی نیو ایئر کہنا چاہیے۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ فون کی طرف بڑھا مگر اگلے ہی لمحے وہ رک گئی۔ اسے ان کی طرف گئے ہوئے کئی مہینے ہوگئے تھے۔ اس پارٹی کی شام کے بعد جو اس نے ٹامسن کے ساتھ گزاری تھی، وہ دوبارہ چرچ نہیں گئی تھی۔ ڈیڈی نے اُسے کئی بار بتایا تھا کہ فادر اسے یاد کر رہے تھے۔ کئی بار اسے ٹامسن کا پیغام ملا تھا مگر وہ مسلسل گریز کرتی رہی تھی۔ اس نے لمبا سانس کھینچ کر سامنے رکھی ہوئی فائل پر نظر ڈالی۔ انٹرکام کی بزر بجی۔

''یس!'' قرۃ نے ریسیور اٹھایا۔

''مس آپ کا فون ہے۔'' آپریٹر نے کہا۔

''ہیلو!''

''ہیلو، گڈ مارننگ میڈم۔ ہیپی نیو ایئر... ہیپی برتھ ڈے ٹو یو!''

''ہیلو... عا... طف'' اس نے بمشکل کہا۔ ریسیور اس کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔

''جی... آپ کا خادم... میں نے سوچا آپ کو سرپرائز وش کیا جائے۔'' اس کے لہجے میں وہی اپنائیت اور مٹھاس تھی۔

''گڈ گاڈ!''

''گاڈ از آل ویز گڈ میڈم!'' وہی شوخی، وہی چہچہاہٹ۔

''اور عاطف تم...؟ مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔ میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا عاطف۔'' وہ بالکل گڑبڑا گئی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے۔

''نہیں نہیں! ہرگز نہیں، یہ ظلم مت کیجیے گا بندہ پرور!''

''تم کہاں سے بول رہے ہو؟''

''...میں آپ کے دیس، آپ کے شہر میں ہوں۔''

''really، تمھیں میرا پتا کیسے ملا؟''

''انسان اگر چاہے تو خدا کو بھی ڈھونڈ سکتا ہے میڈم! یہ بتایئے کہ اس

Scanned by CamScanner

بندۂ ناچیز سے ملنا پسند کریں گی آپ؟"

"کب... کہاں... عاطف... really!"

"ہم آج شام... اسی چائنیز میں مال پر..."

"I will come!، کتنے بجے؟"

"ٹھیک آٹھ بجے..."

"ٹھیک ہے... میں آجاؤں گی۔"

"او کے، باقی باتیں ملاقات پر۔"

اس نے ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ لگا اس کا سر گھوم رہا ہے، ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ جسم پر کپکپی تھی۔ سانس بہت مدھم ہو گئی تھی۔

"میڈم! آپ کی طبیعت خراب ہے؟" چپراسی نے اس کے سامنے پانی کا گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بابا! بس یوں ہی۔ آپ مجھے چائے لا دیجیے۔"

"جی بہتر۔"

"ہوں، تو پہلے سوپ ہونا چاہیے، باقی بعد میں۔" عاطف نے ویٹر کو جواب دیا۔

"عاطف! تم، تم بہت، بہت ظالم ہو۔"

"ہوں، واقعی؟" وہ مسکرایا۔

"تم دوبارہ کیوں میری زندگی میں آگئے؟ میں نے تو خود کو اچھا خاصا دھوکا دے لیا تھا۔ جینے کا انداز بدل لیا تھا۔ میں نے تو یقین کر لیا تھا... میری زندگی میں اب کوئی کم زور لمحہ نہیں آئے گا۔ لیکن پھر، تم عاطف..." وہ روہانسی ہو گئی۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے، آج غلطی ہو گئی۔ آئندہ تمھاری زندگی میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔

"عاطف، تم..."

"یس... یس... یس... آئی نو... آئی نو..."

دونوں یک بارگی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"ڈیڈی کیسے ہیں؟"

Scanned by CamScanner

''ٹھیک ہیں۔ میں نے انھیں بہت بوڑھا کر دیا ہے۔''

''بہت افسوس کی بات ہے۔ تمھیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے آواز سنجیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ قرۃ نے اس طرف دیکھا۔ دونوں کھلکھلانے لگے۔ کیسا قاتل ہے یہ آدمی؟ اور میں...؟ میں خود کیا ہوں... بے وقوف نادان، کم زور۔ برسوں بعد اس سے اچانک ملاقات ہو جانے پر یہ سمجھ رہی ہوں کہ جیسے ساری دنیا کا خزانہ میرے قدموں میں ڈھیر ہے۔ یہ آدمی ہے ہی ایسا۔ یہ اگر چاہے تو پتھر بھی کھلکھلانے لگیں۔ یہ جادوگر ہے اور میں کاٹھ کی بنی ہوئی ایک پتلی جو برسوں بعد اسے دیکھ کر ایک بار پھر جی اٹھی ہے۔ قرۃ العین نے دل میں سوچا۔

''کہاں گم ہو؟'' عاطف نے اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر ٹوکا۔

''ہوں؟ کہیں نہیں۔ بس یوں ہی۔'' وہ چونکی۔

''قرۃ! تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے یہ سوال ضرور پوچھا جائے۔ اس نے نظر اٹھا کر عاطف کی طرف دیکھا۔ ''بس یوں ہی نہیں کی۔'' اس نے کاندھے اچکائے۔ ''عاطف میں اکنامکس کی اسٹوڈنٹ رہی ہوں نا، اس لیے زندگی میں بھی نفع نقصان کا گوشوارہ الگ الگ رکھتی ہوں۔'' وہ دکھ کے ساتھ ہنسی۔

''لگتا ہے تم اب بھی ویسی ہی ہو۔'' اس کی مسکراہٹ بے حد پھیکی تھی۔

''نہیں، نہیں عاطف! میں اب ویسی نہیں ہوں۔ میں نے ہار مان لی ہے۔ تم نے ایک بار کہا تھا جب دو انسانوں کو اکٹھے رہنا ہو تو انھیں چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو مان لیں، تسلیم کرلیں۔ اس طرح آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے تمھیں مان لیا ہے، میں تمھارا مذہب...'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں تمھارے نام پر ساری کائنات بھینٹ چڑھا سکتی ہوں۔ سب کچھ۔ دل، دماغ، آنکھیں، عقل، عقیدہ، عاطف سب کچھ... میں نے ان برسوں میں تمھیں بھلانے کی بہت کوشش کی ہے مگر تمھیں اب بھی مس کرتی ہوں۔ تمھارے بغیر میری زندگی... لگتا ہے... بالکل خالی ہوگئی ہے۔''

''خدایا!'' عاطف کہنیاں میز پر ٹکا کر جھکا۔ ''مگر بہت دیر ہوگئی قرۃ! اب تو میری شادی اور بچے... اب یہ سب...'' وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

Scanned by CamScanner

اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔ پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو یک لخت دامن پر آگرے۔

وہ سر جھکا کر اپنی ہتھیلی کو گھورنے لگی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ بڑے ضبط سے اس نے ہونٹوں تک آئی ہوئی سسکیوں کو روکا۔ ''عاطف! تمھارے مذہب میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔ میں تمھارے بغیر...'' وہ بلک کر رونے لگی۔

☆☆

قرۃ العین اور عاطف کی شادی کو سال بھر ہو رہا تھا۔ دونوں خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ عاطف نے اسے علاحدہ گھر لے دیا تھا۔ عاطف کے گھر والوں سے اس کے تعلقات ٹھیک تھے۔ وہ اس سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ قرۃ العین بھی ان کے پاس جاتی رہتی تھی۔ عاطف سے اسے کوئی شکایت نہیں تھی۔ گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی لیکن کچھ دنوں سے ایک ان جانی سی خلش قرۃ العین کی طبیعت کو بری طرح بوجھل کرنے لگی تھی۔ رات کو دیر تک اسے نیند نہ آتی اور اگر نیند آجاتی تو عجیب عجیب خواب دکھائی دیتے۔ ایک بار خواب میں اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے جس میں ساری دنیا کی مخلوق اکٹھی ہے۔ باری باری لوگوں کا نام پکارا جاتا ہے اور وہ جا کر ہولی کرائسٹ سے ایک لباس لیتے ہیں جو بالکل صاف شفاف سفید ہے اور اس سے مسحور کن خوش بو اٹھ رہی ہے۔ جب اس کا نام پکارا جاتا ہے اور وہ لباس حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے تو کرائسٹ اسے سیاہ لباس دے کر منھ پھیر لیتے ہیں۔ وہ دھاڑیں مار کر رونے لگتی ہے اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

کبھی وہ سوچتی ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بُری عورت ہے جس نے اپنی جسمانی خواہشوں کی خاطر اپنے مذہب سے اور یسوع سے بے وفائی کی ہے۔ کبھی اسے لگتا جیسے اس کے کاندھوں پر شدید بوجھ ہے جو اس سے اٹھایا نہیں جا رہا ہے۔ وہ ان خیالات کو جتنا جھٹک کر خود کو بہلانے کی کوشش کرتی، اتنا ہی اس کا دھیان ان کی طرف زیادہ پلٹتا تھا۔ اس نے ایک دن عاطف سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا، ''ان دنوں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کھانے پینے اور آرام کا خیال رکھیں اور خالی وقت نہ گزاریں،

Scanned by CamScanner

کہیں نہ کہیں مصروف رہیں۔ پریگنینسی کے آخری دنوں میں بعض خواتین کے ساتھ ایسے ہی اُلٹے سیدھے خیالات کا مسئلہ رہتا ہے۔'' ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

عاطف نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازمہ کا انتظام کردیا تھا۔ وہ اسے گھر کے کام کاج سے بالکل منع کرتا تھا۔ قرۃ العین کی دیکھ بھال، تیمارداری میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مگر فراغت نے قرۃ العین کی ذہنی کیفیت کو اور زیادہ خراب کردیا تھا۔ کھانے پینے اور اوڑھنے پہننے سے اس کا دل بالکل اچاٹ ہوگیا تھا۔ عاطف کی پوری توجہ اس پر تھی۔ ہفتے کے وہ دن جو وہ اپنی پہلی بیوی کے ساتھ گزارتا تھا، وہ بھی قرۃ العین کی دل جوئی اور ناز برداری میں صرف ہونے لگے پھر ایک روپہلی صبح اس کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی اور اس کی زندگی میں ایک نئی بہار آگئی۔

''منا بارہ دن کا ہوگیا ہے، ہم نے اب تک اس کا نام نہیں رکھا۔'' قرۃ العین نے کہا۔

''بھئی میں چاہتا ہوں کہ پہلے اس کا زائچہ بنواؤں اور پھر اس کا نام رکھا جائے۔''

''بہت منفرد اور مبارک نام ہونا چاہیے میرے بیٹے کا۔'' قرۃ العین نے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں پتا کیا سوچ رہی ہوں عاطف! کہ منے کو لے کر فادر اینڈریو کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ ہمارے منے کا کوئی پیارا سا نام رکھ دیں۔''

''فادر اینڈریو...؟ دماغ خراب ہوگیا ہے تمھارا۔ کوئی عیسائی میرے بچے کا نام کیسے رکھ سکتا ہے؟'' عاطف نے بُری طرح ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''فادر نیک آدمی ہیں عاطف!'' اس نے دھیمی آواز میں اپنی صفائی پیش کی۔ ''اور پھر میں انھیں بتادوں گی کہ میں مسلمان ہوگئی ہوں۔ وہ میرے بیٹے کا کوئی مسلمان نام رکھیں۔ بچوں کا نام نیک اور برگزیدہ لوگوں سے رکھوانے...''

''پاگل ہوگئی ہو تم...'' عاطف نے اس کی بات کاٹی۔ ''جس شخص کا اپنا مذہب ہی درست نہ ہو وہ کیسے نیک اور برگزیدہ ہوسکتا ہے؟ اپنے بیٹے کے لیے میں خود نام سوچ لوں گا، تمھیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

Scanned by CamScanner

''عاطف! یہ میرا بیٹا بھی تو ہے۔'' وہ قدرے خفگی سے بولی۔

''مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کسی بے دین، بے مذہب اور گم راہ آدمی سے اس کا نام رکھواتی پھرو۔'' عاطف نے کرختگی سے جواب دیا۔

''تمہیں فادر کے بارے میں ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہییں۔'' قرۃ العین نے بھی اسی تیز لہجے میں کہا۔

''تم کہنے کو مسلمان ہوگئی ہو، لیکن اس کا مطلب ہے تمہارے اندر کا عیسائی ابھی ختم نہیں ہوا۔'' عاطف نے زچ ہو کر کہا اور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔

آخری بات قرۃ العین کے دل میں ترازو ہوگئی۔ اگلے روز جب عاطف آیا تو وہ بھری بیٹھی تھی۔ دونوں میں پھر تو تو میں میں ہوگئی اور بات بڑھتے بڑھتے اچھا خاصا جھگڑا بن گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عاطف پہلے تو دو دو تین تین روز غیر حاضر رہنے لگا اور پھر ہفتہ ہفتہ بھر اور آگے اس وقفے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دونوں نے اپنی اپنی طرف سے بچے کا نام رکھ لیا تھا۔ بچہ چار ماہ کا ہوگیا تھا کہ اچانک اسہال کی شدت کا شکار ہوا اور تین روز بیمار رہنے کے بعد چل بسا۔ بچے کی موت نے عاطف اور قرۃ العین کو وقتی طور پر قریب کردیا مگر جلد ہی دونوں طرف کی سردمہری فاصلہ بڑھانے لگی۔ عاطف کی غیر حاضری کا سلسلہ مہینہ مہینہ بھر طویل ہو چلا۔ قرۃ العین پر دوبارہ ڈپریشن کا زور ہونے لگا۔ مگر اس بار عاطف کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کا ازدواجی رشتہ برف کی سل ہوگیا تھا۔

☆☆

سال کا پہلا دن تھا۔ نئے سال کا آغاز۔ قرۃ العین کا جنم دن۔ وہ صبح سے عاطف کی منتظر تھی مگر اس نے آج فون بھی نہ کیا۔ صبح سے دوپہر ہوئی... دوپہر سے شام اور شام بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ عاطف نہیں آیا۔ قرۃ العین پر ڈپریشن کا شدید دورہ تھا۔ کارنس پر رکھے واٹر للی کے سفید پھولوں کو دیکھ کر اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ دریچے سے چھن چھن کر آنے والا اندھیرا اس کے اندر پھیلتا جا رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ اٹھی۔ فر کا گاؤن پہنا اور گھر کو یوں ہی کھلا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ باہر آ کر اس نے ٹیکسی لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ فادر اینڈریو کے دروازے پر موجود تھی۔ دھند برس رہی

تھی۔ سردی سے اس کے ہونٹ کاسنی ہو گئے تھے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحوں بعد اس نے پھر دستک دی۔ پھر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ چند لمحے کھڑی انتظار کرتی رہی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنے کی کوشش کی۔ تیسری بار دستک دیتے ہوئے وہ زور زور سے چلانے لگی، ”فادر! فادر! دروازہ کھولیے! میں آئی ہوں۔ فادر! میں کنفیشن کے لیے آئی ہوں۔ فادر...! فادر! دروازہ کھولیے۔“

❀❀❀

امجد طفیل

اندھا کنواں

اس کا سوال نہایت سادہ تھا لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، آسان اور سادہ سوال کا آسان اور سادہ جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ہماری ملاقاتیں کچھ زیادہ پرانی نہیں تھیں لیکن یہ اندازہ ابتداء میں ہی ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہم کبھی کبھار ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دل کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ اب پتہ نہیں ہم میں یہ اعتماد ایک دوسرے کے لیے کیسے پیدا ہوا تھا کہ جو باتیں ہمارے درمیان ہو گئیں وہ ہمیشہ راز رہیں گی یا پھر شاید چونکہ آج کے دور میں کسی کے پاس بھی اتنا وقت نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی باتیں تسلی سے سن سکے۔ اس لیے ہم ایک دوسرے کو زیادہ نہ جاننے کے باوجود بات کر سکتے تھے۔ پھر اس دن باغ کا ماحول بھی خوابناک تھا۔ سردیوں کی شام میں ڈوبتے سورج کی مدھم پڑتی روشنی اور جھیل سے اٹھتا ہوا دھواں سا اور سب سے بڑھ کر دور تک پھیلی خاموشی۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد ہم رفتہ رفتہ ذاتی سوالات کی طرف آ گئے اور اس نے اچانک مجھ سے پوچھ لیا۔ ''آپ کو خوابوں کے سچے ہونے کا یقین ہے''۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

کیا مطلب؟

مطلب یہ کہ کیا آپ کے خیال میں خوابوں میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ سچ ہو سکتا ہے۔

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اپنی اصل رائے کا اظہار کیا۔ ''بالکل ہو سکتا ہے''

بس وہ ایک خواب ہے، میں جس کی اسیر ہوں۔

اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

Scanned by CamScanner

کیسا خواب؟

یہ خواب مجھے بچپن سے نظر آ رہا ہے۔ کہیں ویران سی جگہ پر ایک کنواں ہے اور کنویں کے کنارے بیٹھا وہ مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ میں اس کے پاس جاتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور باتیں کرنے لگتے ہیں۔

خواب میں جو چہرہ نظر آتا ہے وہ بالکل میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

خواب کے اس مختصر بیان نے میرے اندر تجسس کو ابھارا اور میں نے اس سے پوچھا۔ ''تو کیا تمہیں وہ چہرہ کبھی زندگی میں نظر آیا''۔

ہاں نظر تو آیا تھا لیکن میں کہہ نہیں سکتی کہ کیا واقعی میں نے اسے حقیقی زندگی میں دیکھا۔ ہم لوگ ایک شادی کی تقریب میں شریک تھے۔ مردانہ حصے میں تین چار لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور مجھے لگا کہ ان میں سے نیلی جین پر سفید رنگ کی ٹی شرٹ میں وہی ہے تب میں نے خود کو بڑی مشکل سے اس کے پاس جانے سے روکا۔ مگر کچھ دیر بعد جب میں نے پلٹ کر اس جگہ نگاہ ڈالی تو سیٹ خالی تھی، جبکہ باقی لڑکے اسی طرح باتیں کر رہے تھے اور یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔

''کیا اس کے بعد بھی کبھی وہ ملا؟'' میں نے اس کے چہرے سے اس کے دلی تاثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

بالکل، وہ تو نہیں مگر ایک ایسا ہے تو۔

ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ اس کے خد و خال بدل گئے ہوں۔

اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے یہ خواب کتنی بار دیکھا؟

کہہ نہیں سکتی لیکن میں نے یہ خواب کئی بار دیکھا ہے۔ مکمل تفصیلات کے ساتھ اور اس کی تفصیلات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ہمیشہ ایک سا منظر، ہمیشہ وہی چہرہ، وہی اندھا کنواں۔

تم یہ بتاؤ کہ یہ خواب تم نے اپنے بچپن میں بھی دیکھا؟

Scanned by CamScanner

دراصل میں یہ خواب صرف اپنے بچپن ہی میں دیکھتی رہتی ہوں، اب تو صرف اس کا چہرہ ہی حافظے میں رہ گیا ہے۔

کچھ اس جگہ کی شناخت ہوتی ہے؟

ہاں، یہ تو میں بتانا ہی بھول گئی، جگہ ایک فیکٹری کی تھی ـــــ جہاں میں بچپن میں رہتی تھی اور جب میں نے اردگرد کے لوگوں سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ برسوں پہلے اس فیکٹری کے دروازے کے پاس ایک ویران کنواں تھا، جسے بھر دیا گیا۔ مگر یہ تو میرے ابا کے فیکٹری میں کام شروع کرنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

اس بات پر میں ایک بار پھر چونکا اور مجھے ایسا لگا کہ جس کنویں کی طرف یہ اشارہ کر رہی ہے وہ اس فیکٹری کا کنواں بالکل نہیں ہے بلکہ میرے محلے میں واقع وہ کنواں ہے جو مدت ہوئی بند ہو چکا تھا اور اب اس کی منڈیروں پر چراغ جلائے جاتے تھے یا پھر میرے گاؤں والے گھر کے بالکل ساتھ واقع کنواں، جہاں جانے کی مجھ پر سخت پابندی تھی کیونکہ وہ پانی سے بھرا رہتا تھا اور گرمیوں کی شکردوپہروں میں جب سب لوگ سو جاتے تو میں چپ چاپ اٹھ کر باہر آ جاتا۔ کنویں میں جھانکتا اور پھر اپنا عکس دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ جاتا۔ وہ کنواں بھی سالوں پہلے بند کر دیا گیا کیونکہ آب رسانی کے نئے طریقوں نے ان کنوؤں کی افادیت ختم کر دی تھی۔ مگر ہو سکتا ہے کہ جو کنویں ہم نے اپنے باہر بند کر دیے ہوں وہ کہیں ہمارے اندر رواں ہو گئے ہوں۔

کیا وہ مجھے کبھی ملے گا۔

میں اپنے خیالات سے چونکا۔

کیا مطلب؟

میں نے آپ سے پوچھا ہے کہ کیا وہ خواب چہرے والا مجھے کبھی ملے گا؟

اب اس کی آنکھوں اور لہجے میں شوخی تھی۔ میں نے یونہی رواروی میں کہہ دیا۔ اگر یہ خواب سچا ہے تو اس سے ملاقات ضرور ہو گی لیکن کب اور کہاں، اس بارے میں کچھ نہیں کہا

جا سکتا۔

اس ساری صورت حال نے میرے اندر ہلچل مچا دی تھی اور اب مجھے خیال آنے لگا تھا کہ مجھے اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔ اصل میں اس وقت میں عجیب سی اداسی میں گھرا تھا اور میں نے اس سے ویسے ہی پوچھ لیا تھا کہ کیا اس نے کبھی محبت کی ہے۔ جس کے جواب میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ اب تک تین بار محبت کر چکی ہے۔ پہلی بار خواب میں نظر آنے والے چہرے سے، دوسری بار اپنے ایک رشتے کے بھائی سے، مگر تیسری بار کس سے، یہ اس نے بتانے سے انکار کر دیا۔ میں نے بھی اپنی ترنگ میں کہہ دیا کہ میں نے ایک بار محبت کی ہے اور اب تک اسی کے حصار میں ہوں بلکہ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ برسوں، اور آج اگر وہ مجھے دوبارہ ملے اور اپنے ساتھ چلنے کو کہے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے ہمراہ ہو لوں گا۔ بظاہر اس نے میری بات سنی ضرور تھی لیکن لگتا تھا کہ یا تو اس نے میری بات پر یقین نہیں کیا یا اس نے میری بات میں زیادہ دلچسپی نہیں لی کیونکہ اس کے فوراً بعد وہ اپنے خواب کو تفصیل سے بیان کرنے لگی تھی اور میں بھی اس کے خواب کی حیرت میں گم ہو گیا تھا۔

باتوں باتوں میں رات کے سائے ہمارے گرد پھیل چکے تھے۔ درختوں پر پرندوں کے چہکنے کی آوازیں مدھم پڑتی جا رہی تھیں اور اب مجھے بھی لگتا تھا کہ اس کی باتوں سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ میں بھی اپنے خیالوں میں کھو چکا تھا اگرچہ اس کی باتوں کے جواب دیے جا رہا تھا لیکن اس بات کا مجھے زیادہ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا پوچھ رہی ہے اور میں کیا بتا رہا ہوں۔ شاید ہم دونوں اپنے اپنے اندھے کنویں کی منڈیر پر بیٹھے اس میں اپنی ذات کا کاٹھ کباڑ ڈالتے جا رہے تھے۔ اس بات سے بے نیاز کہ سامنے والا کیا کر رہا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو ہی اپنا اندھا کنواں سمجھ رہے ہوں۔

Scanned by CamScanner

محمد عاصم بٹ

سایہ کہانی

اس رات ایک اور واقعہ بھی ہوا تھا جسے شاید اس کی ماں بھی نہ جان پائے کہ کمرے میں بھرے دیئے کے دھویں کے اثر سے بستر پر پڑا اس کا جسم تحلیل ہوا اور دھواں بن کر سارے میں پھیل گیا۔ اگلے روز دن چڑھے اس کی ماں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہی سایہ جو اپنے برسوں کے معمول کے مطابق رات بھر اس کے سرہانے کھڑا رہا اور خاموشی سے ہونے والے اس واقعے کا واحد عینی شاہد بھی تھا اور آج حیرت انگیز طور پر دن کا اجالا پھیلنے کے باوجود غائب نہیں ہوا تھا، آگے بڑھا اور چٹخنی کھینچ کر نیچے گرائی۔ اس کی آنکھوں میں برسوں کی شب بیداری کی سرخی تھی اور اس کے بال یوں الجھے ہوئے تھے جیسے کوئی پریشان خواب ہو۔ اس نے دروازہ کھولا اور قدرے برہمی سے اس کی ماں سے بولا ”آتا ہوں، ابھی تو دن چڑھا ہے“۔ ماں جانتی تھی بیٹا دوپہر تک بغیر کھائے پیے سوتا رہے گا۔ وہ اصرار کرنے لگی تو سایہ اس کے بیٹے کے لیے شدید نفرت محسوس کرتے ہوئے طیش بھری آواز میں بولا ”کھانا ابھی آتا ہوں۔ مجھے کیا ویسا ہی سمجھا ہوا ہے۔ ویسا ہی اس جیسا“۔

اسے یاد تھا اس کے سکول کے ایک دوست رحیمے کی دادی سے وہ سارے بچے بہت ڈرتے تھے، خود رحیما بھی۔ وہ بالکل ایک سائے کی مانند دکھائی دیتی تھی۔ بیٹھی ہوئی ہو یا کھڑی ہو، وہ دیوار پر بنے کسی نقش کی مانند ساکت اور بے روح معلوم ہوتی، اور اگر چل رہی ہو تو ایسا غیر معمولی لطیف وجود معلوم ہوتی جو ہوا سے ہلکا ہو، بالکل ایک سائے کی مانند۔ اسے بولتے چالتے بھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ نہ وہ ہنستی تھی، نہ وہ روتی تھی۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ پتھر معلوم ہوتا۔

وہ کونڈوں والا دن اسے کبھی نہیں بھولا۔

رجیا اچی گلی میں مائی لاڈو کی مسجد کے سامنے گھر میں رہتا تھا۔ وہ اس کے ہاں کونڈے کھانے گیا تھا۔ لوگ فجر کی نماز پڑھ کر مسجدوں سے لوٹے نہ ہوں گے کہ اس نے جا کر گھر کی کنڈی کھڑکائی۔ ہر سال اس رات رجیے کا باپ گھر کے صحن میں بڑے پتیلوں میں حلوہ اور چنے پکاتا۔ نماز کے بعد پوریاں تلی جاتیں۔ ابھی تھی کڑاہے میں گرم ہو رہا تھا۔ اس کی دستک سے ہلکا سا دباؤ پڑا تو دروازے کا ایک پٹ اندر کھسک گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو سامنے رجیے کی دادی کھڑی تھی۔ بے جان آنکھوں' جن میں سدا کی چپ بھری تھی' سے وہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور یوں ساکت تھی جیسے دم سادھے ہو۔ وہ اس کے پرے ہٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چاہتا تو دائیں بائیں ہو کر نکل سکتا تھا لیکن اس کے پیر جیسے مٹی نے جکڑ لیے تھے۔ وہ یوں جامد ہو گیا جیسے کسی نے اسے وہاں گاڑ دیا ہو۔ رجیا یا اس کا کوئی گھر والا اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اس منظر نے اسے اتنا دہشت زدہ کیا کہ وہ الٹے قدموں وہاں سے بھاگ آیا۔ پھر کبھی اس کے گھر نہ گیا۔ حتیٰ کہ دادی کے فوت ہو جانے کے بعد بھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رجیے کی دادی کا چہرہ اس کی یادداشت کے آئینے میں دھندلا گیا بس ایک سایہ سا باقی رہ گیا۔ خاموش' ساکت اور بے جان سایہ۔ اس سائے میں اس کی باپ نے زندگی ڈالی تھی' گو عارضی طور پر ہی سہی۔

اس کا باپ ایک بنک میں درجہ دوم کا افسر تھا۔ واجبی سی تنخواہ پاتا جس سے اس کے تین بھائیوں' ایک بہن' ایک ماں' ایک دادا اور ایک دادی پر مشتمل خاندان جیسے تیسے گزارہ کرتا۔ چالیس پچاس کے پیٹے میں تھا جب ایک روز شام کو موٹر سائیکل پر گھر لوٹتے ہوئے ویگن نے اسے ٹکر ماری۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہسپتال پہنچنے سے پہلے جان بحق ہو گیا۔ اپنے باپ سے وہ بہت ڈرتا تھا۔ وہ کڑکا مارتا تو اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگتا۔ ماں اس سے کہتی کہ شام کو اس کا باپ آئے گا تو وہ اس کی شکایت کرے گی۔ وہ ڈر کے مارے ماں کی ہر بات مان لیتا۔ سکول کا کام ہمیشہ باپ کے گھر آنے

سے پہلے مکمل کر لیتا۔ پہلوانوں کے میدان سے وقت پر جا کر دودھ بھی لے آتا لیکن پھر بھی ماں کو کوئی نہ کوئی ایسی بات مل ہی جاتی کہ وہ اس کے باپ سے شکایت کرتی۔ باپ کی دیکھا دیکھی بڑے بھائی بھی بات بے بات اسے پیٹ ڈالتے۔

لیکن اس کے باپ کے مرنے کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ اچانک جیسے سٹیج پر پردہ گرانے یا اٹھانے سے پرانا منظر نظروں سے اوجھل اور نیا سامنے آ جاتا ہے۔

کچھ پنشن ہر ماہ ماں کو ملتی۔ کچھ وہ سینا پرونا وغیرہ کر کے یافت کر لیتی۔ دونوں بڑے بھائی ٹیلرنگ کے کام پر لگ گئے اور تھوڑے عرصے بعد جب سلائی کرنا سیکھ گئے تو انھیں مہینے کے مہینے جیب خرچ کے نام پر کچھ رقم ملنے لگی۔ یہ سب کچھ مل ملا کر گھر کی گاڑی چلتی رہتی۔

سبھی زندہ رہنے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ وہ ابھی چھوٹا تھا اور اسے بڑوں نے اس جنگ سے مبرا کر دیا تھا لیکن شاید بھیں کوئی خرابی پیدا ہوئی تھی اور وہ ان کی زندگیوں کے دائرے سے باہر ہو گیا۔ چیزیں بہت تیزی سے اور بالکل غیر متوقع انداز میں بدلی تھیں۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ اس کی روز روز ڈانٹ پھٹکار سے تو بچا لیکن اس کے بغیر تنہائی اور عدم تحفظ کا شکار ہو گیا۔ وہ باپ کی مار سے ڈرتا بھی تھا لیکن اگر وہ دفتر سے لوٹنے میں دیر کرتا تو بے چین ہو جاتا۔ وہ موڈ اچھا ہونے پر اسے گھمانے لے جاتا تھا۔ بازار سے اسے کریم والے بسکٹ لے کر دیتا اور اس کے ساتھ 'لیو پچو بار کوتز' بھی کھیلتا تھا۔

اپنے باپ کی موت کے بعد کسمپرسی اور اداسی کے طویل برسوں میں جب ہمیشہ مسکراتے دکھائی دینے والے بہت سے چہرے یا تو منظر پر ہی باقی نہ رہے یا ویسے نہ رہے جیسے پہلے تھے اور جب اس کی ماں نے ہمیشہ کے لیے اپنے چہرے پر بیوگی کی کرختگی اور جھریاں اوڑھ لیں تھیں تو چہروں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔ چہرے جو بظاہر جیسے بھی ہوں ہوتے ایک جیسے ہیں، انجان، بے حس اور چھوڑ جانے والے۔

Scanned by CamScanner

رات کو وہ دادی سے [illegible]
[illegible] روشنی میں [illegible]
دیئے [illegible] روشنی میں [illegible]
[illegible] کے پیچھے چھپ [illegible]

وہ باپ بیٹا [illegible]
کے بیچ میں [illegible]
ایک دوسرے سے [illegible] ہو گئے۔

اس کی ماں جانتی تھی کہ اس گھر میں ایک سے زیادہ [illegible] علاوہ بھی تھیں جن میں وہ اپنی دادی کو جمعرات کے جمعرات گھر میں دو کونوں میں دیئے جلاتے دیکھتا۔ دیوں میں تیل بھرتی اور دادی روئی کی بتی کو اسے اچھی طرح تیل میں بھگوئی جاتی۔ یہ سارا عمل بہت خاموشی کے ساتھ ہوتا جیسے یہ بھی کوئی عبادت ہو۔ وہ دیئے کے سامنے بیٹھ جاتی اور بڑبڑاتے ہوئے دعا مانگتی کہ اس گھر میں رہنے والی ارواح اس کی آل اولاد کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ ہوا سے دیئے کی لو کپکپاتی تو دادی کا سایہ دیوار پر طرح طرح کی شکلیں بناتا جو اسے خواب میں بھی ڈراتی تھیں۔ کبھی یہ سایہ بن کر چھپنے والی دیوہیکل کی صورت بناتا، کبھی غراتے ہوئے کتے کی اور کبھی غصے میں چیختے اور ہاتھ اٹھا کر اسے مارنے کو دوڑتے اس کے باپ کی۔ وہ ڈر کر خوابوں سے روتا ہوا اٹھ بیٹھتا۔ ماں آیت الکرسی پڑھ کر اس پر پھونکیں مارتی اور اسے تھپک دیتی۔ بعض اوقات اسے لگتا کہ خوف کلاؤں میں رہنے والی روحوں کی طرح کوئی جاندار شے تھا جو ماں کے اس عمل سے دبک کر بھاگ جاتا۔ وہ روتے روتے چپ ہو جاتا اور سو جاتا۔ ماں کی آیت الکرسی کی بڑبڑاہٹ اور پیار بھرا تھپتھپانا ایک گہرے احساس کی مانند تھا جو اس کے خوف کے دکھوں پر مرہم کا کام کرتا۔

دادی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئیں تو انہوں نے اس

کی ماں کو حکم دیا کہ اس معمول میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ تب سے وہ ماں کو دیا جلاتے دیکھ رہا تھا۔ اپنی ماں کو اس نے کبھی اس سائے کے بارے میں نہیں بتایا۔ یہ واحد خوف تھا جو اس نے ماں سے چھپایا۔ اصل میں اسے ڈر تھا وہ یہاں بھی دیا جلانا شروع کر دے گی۔ اسے دیئے کے دھوئیں سے کھانسی اٹھتی اور وہ جانتا تھا پھر اس کا یہاں سونا ممکن نہیں رہے گا۔ اسے دیئے کے دھوئیں اور دیوار پر کریہہ شبیہیں بناتے اس کی لو کے سایے سے گھن آتی تھی۔

اسے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں تھا لیکن شاید میٹرک کے امتحانات کے بعد میسر آنے والے فراغت کے چند مہینوں کے دوران ایسا ہوا تھا کہ وہ سایے سے مخاطب ہوا' جب سایہ محض دیوار پر بنا نقش نہیں تھا' ایک جیتا جاگتا وجود تھا جو سانس لیتا، حرکت کرتا اور سنتا تھا۔ وہ اس کی بات سننے کے لیے بے آہٹ چلتا ہوا اس کی چارپائی کی پائنتی آن کھڑا ہوتا۔ وہ پہروں اس سے روبینہ کے بارے میں باتیں کرتا۔ روبینہ جس کا سوچ کر اس کے دل میں محبت کی سحر آسا گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ یہ اس کا عنوان شباب تھا۔

وہ اس کی دور پار کی رشتہ دار تھی۔ ایک رشتہ دار کی شادی میں اسے دیکھا۔ ایک بار دیکھا تو پھر کچھ اور نہیں دیکھ پایا وہاں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ڈھولکی تھاپ پر ناچ رہی تھی۔ کبھی وہ سب اکٹھی ناچنے لگتیں، کبھی ایک ایک کر کے۔ لیکن اسے بانہیں لہراتے' پیروں پر چکر کھاتے دیکھ کر اس کے حواس کی بتی گل ہوئی۔ اسے یاد نہیں رہا کب تک ناچ کا عمل جاری رہا۔ کب کون لڑکی آئی۔ کب وہ سب ناچیں۔ اسے تو بس وہی دکھائی دیتی رہی۔ خود کو پنجوں کے بل کھڑا کیے جسم کو ایک لے پر چکر دیتے ہوئے۔

اس کے بعد بہت سے برسوں میں جب تک کہ وہ بی اے کر کے نوکری نہ لگ گیا اور عملی زندگی کی مصروفیات نے اس کے ذہن میں پچھلی تمام یادوں پر دھند کا سایہ نہ کر دیا' وہ اس سے ملنے کی شدید خواہش کی آگ میں جلتا' راتوں کو اٹھ اٹھ کر آہیں بھرتا۔ کمرے کی تاریکی میں بے خواب آنکھیں کھولے سپنے بنتا اور سایے سے دل زار زار کی کیفیات بیان

کرتا رہتا تھا لیکن اس لڑکی سے پھر کبھی نہ مل پایا۔

بی اے کے بعد اس نے ایک ٹریڈنگ کمپنی میں ڈسپیچنگ آفیسر کے طور پر نوکری کر لی۔ عملی زندگی کے نئے پن نے اسے اپنی پچھلی زندگی کے بیشتر معمولات سے آزاد ہو جانے کی ترغیب دی اور یوں عارضی طور پر ہی سہی' وہ خود کو سایے کی گرفت سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

سارا دن دفتر میں اور شام کو دوستوں کے ساتھ۔ رات کو تھکا ہارا گھر آ کر کمرے کی بتی بجھاتا تو سایہ اسے دکھائی دیتا۔ اسکے لیے جانے کیوں اتنی نفرت یکبارگی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی کہ فوراً ہی ایک زیر خند مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہویدا ہوتی۔ "کبھی یہ مجھے ڈرایا کرتا تھا" وہ غصے اور نفرت کے ساتھ سوچتا اور آنکھیں میچ لیتا۔ دفتر کی اگلی صبح کی مصروفیات کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں کے پیالے نیند کے آب سے بھرنے لگتے اور وہ سو جاتا۔ اس معمول کے ساتھ جو اسے راس آیا تھا اس نے کئی سال خاموشی سے بتا دیے تھے جب ثمینہ اس کی زندگی میں آئی۔

وہ اسی کے ڈیپارٹمنٹ میں اس کے وہاں ملازم ہونے کے کوئی چار ایک سال بعد آئی تھی' کمپیوٹر آپریٹر کے طور پر۔ اس سے پہلے وہ تھی تو اسی ادارے میں لیکن اس کا ڈیپارٹمنٹ مختلف تھا۔ وہ اسے اسسٹ کرتی تھی۔ اس سے پوچھتی کہ فلاں انٹری کو کہاں ڈالنا ہے تو وہ کہتا میرے دل میں۔ شروع میں تو وہ یہ سب کچھ شاید نہ سن پائی لیکن پھر ہر بات اسے صاف سنائی دینے لگی اور وہ دونوں ایسے چینل سے چاہے باآواز بلند کی باتیں کرنے لگے کہ جنہیں کوئی دوسرا چاہے وہ ان کے کتنے قریب بیٹھا ہو نہ سن پاتا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے خوشگوار اور میٹھی یادوں سے لبریز دور تھا۔ وہ مسکراتی تو اسے لگتا اس مسکراہٹ میں سارے فسوں پنہاں ہیں۔ فطرت اگر ایک ساز ہے تو وہ ایک مسکراہٹ' ایک مضراب تھی' جس نے اس کے تاروں میں سروں کی بازگشت پیدا کی۔ یہ بازگشت اتنی بلند آہنگ تھی کہ اس شور میں وہ بہت سی ایسی باتیں یکسر نہیں سن پایا جو وہ لڑکی گاہے بگاہے

اپنی غربت، اپنے ریٹائرڈ باپ، بوڑھی ماں اور بیوہ بہن کے بارے میں اسے بتانے کی کوشش کرتی تھی۔ سو اسے پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس معاملے کے شروع ہونے کے کوئی سال بھر بعد ثمینہ ایک ایسے شخص سے بیاہی گئی جس کے بڑے بھائی سے اس کی بیوہ بہن کی شادی اس شرط پر ہوئی تھی کہ دونوں بہنیں ایک ساتھ اس گھر میں آئیں گی۔

وہ تو اپنے تعلق کی خوشگوار یادوں کے ساتھ بیاہ کر چلی گئی لیکن اسے ایک اندھے خلا میں معلق چھوڑ گئی۔ اندھا اور گہرا خلا جس میں بس وہ تھا اور یہ سایہ۔ وہ اپنے محبت اور نفرت کے رشتے سے اس سائے سے جڑا تھا کہ زندگی کے ہر اہم واقعے کے بعد یہ تعلق اور گہرا ہو جاتا' اس خواہش کے ساتھ ساتھ کہ وہ کسی طور اس سے اپنا پنڈ چھڑائے۔ اس نے سونے سے پہلے کمرے کی بتی بجھانے کی بچپن کی عادت ترک کر دی تو سایہ کمرے سے باہر کی دنیا میں پھیلی تاریکیوں میں جگہ بناتے ہوئے ظاہر ہونے لگا اور یوں پہلی بار وہ محض اس کے کمرے تک محدود نہ رہا۔

یونہی سڑک کا موڑ مڑتے ہوئے کسی درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے یا کچھ دیر آنکھیں میچے بیٹھے رہنے کے بعد اچانک کھولنے پر وہ اسے وہاں تاریکی میں کھڑا دکھائی دیتا۔ چپ چاپ' ساکت اور بے روح۔ وہ جھنجھلا جاتا۔

وہ دفتر سے چھٹی کر کے پارک میں گھومتا رہتا لیکن سائے کی نظروں سے بچ نکلنے کا مکمل احساس اسے لائبریری میں آ کر ہی ہوتا۔ یہ رات آٹھ بجے تک کھلی رہتی۔ وہ سب سے آخر میں وہاں سے نکلتا۔ آٹھ بجنے میں دو ایک منٹ پہلے ہی لائبریری کے ملازمین کمروں کی بتیاں بجھانا شروع کر دیتے۔ یہ عمل چونکہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ اب اسے پھر سے باہر جانا ہوگا' وہ جھنجھلا جاتا۔ ریڈنگ روم کی بتیاں آخر میں گل کی جاتیں' وہ تب تک تیزی سے کتاب کے صفحات پڑھتا۔ چاہے کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے لیکن یہ ان لوگوں کے خلاف جو اسے یہاں سے اٹھانے کے درپے تھے اور تیزی سے اس کی اور بڑھ رہے تھے ایک احتجاج تھا۔ عجلت میں سطروں پر نظر پھیرتا ہوا وہ لفظوں کے مطالب سمجھنے کی کوشش

Scanned by CamScanner

کرتا جس سے اس اس کا دماغ ہانپ جاتا اور کسی چوٹ کھائے ہوئے باکسر کی طرح ہے
دھتا جاتا۔

آخر جب بتیاں گل کرنے والا ریڈنگ ہال میں آتا تو وہ کتنے ہی صفحے اور بعض اوقات کتابوں کی کتابیں پڑھ چکا ہوتا لیکن ایک لفظ بھی یاد نہ رہتا کہ کیا پڑھا تھا۔ کیوں وہ سب کچھ اسے بھول جاتا تھا؟ کون تھا جو اس کے حصے کا پڑھا ہوا خود بھی لیتا اور اسے اس سے محروم رکھتا تھا؟ بونا یہ اگاتا تھا اور اس کا پھل وہ کھا جاتا تھا۔ کون تھا وہ؟ اور جب اس کی نظر سایے پر جاتی۔ نفرت کی جوالا مکھی اس کے دل میں بھڑکتی اور اس کا جی چاہتا وہ اسے نوچ ڈالے نیست و نابود کر ڈالے لیکن ایسا کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ زیاں اور بے مائیگی کا احساس اس میں سوار ہو جاتا۔

سو یوں ہوا کہ دفتر جانا اس نے آہستہ آہستہ موقوف کر دیا۔

گھر سے دفتر کے لیے نکلتا تو اپنے قدموں کو کچہری کا موڑ مڑتے ہی یونیورسٹی روڈ کی طرف ہو لینے سے نہ روک پاتا جدھر پبلک لائبریری تھی۔ کبھی کبھار سارا دن کتابیں پڑھنے اور پھر آخر میں یہ احساس دل میں جاگزیں پانے کے بعد' کہ وہ کچھ بھی نہ پڑھ پایا تھا' وہ شدید غصے اور مایوسی کے ساتھ اپنے آپ کو نوچتا اور کاٹتا۔ ''یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟'' وہ بے خواب آنکھوں سے اندھیرے میں اسے گھورتے ہوئے بستر پر کروٹیں بدلتا۔ نیند اس سے روٹھ جاتی۔ تمام رات دل میں نفرت اور غصے کی گھمسن گھیریاں چلتیں۔

جانے ہمیشہ سے بند ہونٹوں کا یہ قفل کھلے تو کیا ہو؟ اس بند در کے عقب میں کیا تھا' کسے معلوم؟ اس نامعلوم کو جاننے کی خواہش میں اس نے کتنی ہی بار ان بند پٹوں سے اپنا سر پٹخا۔ لیکن بے سود۔ ''تم کون ہو۔ کیا ہو۔ سنتے ہو پر بولتے کچھ نہیں''۔ جانے کیسے کیسے سوالوں کے سانپ اس کے دماغ سے لپٹے پھنکارتے۔ ''تم مجھے آزاد کیوں نہیں کرتے۔ میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے''۔ وہ سایہ ہولے سے اپنی جگہ سے سرکتا اور ہوا میں تیرتا اس کی پائنتی تک آتا۔ خاموش...

ہوئے اسے سنتا۔ کبھی کچھ نہ بولتا' کوئی تاثر ظاہر نہ کرتا' سوائے انہماک کے تاثر کے۔ جیسے اس میں صدیوں کی ریاضت سے دریاؤں کا سا ٹھہراؤ اور اندھی غاروں کا سناٹا اتر آیا ہو۔

اس کا خاموش کھڑے رہنا' ہولے ہولے سانس لینا' چالاکی سے اس کی سنتا مگر اپنی نہ کہنا' یہ سب باتیں اس کے دل میں زہر کا چکر چلاتیں۔ زہر جو اس کی نس نس میں بھر چکا تھا۔ اس کے جسم کو اندر سے کاٹتا اور اسے اذیت دیتا جو اس سے سہاری نہ جاتی۔

اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس گھر میں کسی شے کا سایہ ہے جو اسے ستاتا ہے۔ ماں نے آیۃ الکرسی پڑھ کر سارے گھر میں اور خاص طور پر بیٹے کے کمرے میں پھونکیں ماریں۔ اسے ایک سے زائد خواب ایسے یاد آئے جن میں اس آسیب کی نشاندہی کرنے والے ان گنت اشارے موجود تھے۔ اس نے چالیس دنوں کا وظیفہ پڑھا تا کہ معلوم کر سکے گھر کا کون سا کونہ بھاری تھا اور کس شے کا آسیب وہاں مقیم تھا۔ پڑھا ہوا پانی گھر بھر میں اور خاص طور پر بیٹے کے کمرے میں چھڑکا۔ بیٹے کو نظر بد سے بچانے کے لیے اسے تعویذ پہنا دیا اور ایسا ہی ایک تعویذ اس کے کمرے کے دروازے کے ساتھ لگا دیا لیکن بیٹے کی بے کلی میں افاقہ نہ ہوا۔

آخر ایک روز اس نے ماں کو اپنے کمرے کی وہ نکڑ دکھائی جہاں دیوار پر پچھلے سال کا کیلنڈر ٹنگا ہوا اور پاس ہی لکھنے کی میز اور کرسی پڑی تھی اور بتایا کہ یہیں ہوتا ہے وہ آسیب۔ ماں نے نکڑ میں سے کرسی میز پرے سرکایا۔ دیوار پر سے کیلنڈر اتار کر آیۃ الکرسی والا قطعہ ٹانگا۔ کونے میں فرش پر ایک چھوٹی چوکی رکھی اور اس پر دیا جلا کر رکھ دیا۔ کمرے میں سرسوں کے جلتے تیل کا دھواں پھیلا تو اس نے دیکھا سایہ اس کی اوٹ میں ہو کر غائب ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں کی اوٹ میں وہ شبیہیں بھی گم ہو گئیں جو دیئے کی لو دیوار پر بنا رہی تھی اور یہ اپنے ذائقے میں ایسا میٹھا اور مزاج میں ایسا بے ضرر تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ بھی نہ پڑا جس کا اسے خوف تھا۔ نیند کسی دنیائے دیگر سے نازل ہونے والے پیغام کی صورت اس کی آنکھوں میں اتری اور وہ گہرے اطمینان سے ایسی مکمل نیند سو گیا جیسی طویل برسوں میں اسے کئی رات نصیب نہیں ہوئی تھی

ارشد چہال

صحرا کی رات

سورج جب صحرا کی ریت میں روپوش ہو گیا تو اپنے پیچھے افق پر ایک ایسا رنگ چھوڑ گیا جس کے قرمزی سائے ناہموار ریت پر خوابوں کی طرح سرسرانے لگے تھے۔ کامران نے جیپ روک کر افق سے بہتے ہوئے رنگوں کو یوں دیکھا جیسے وہ ان رنگوں کی مدد سے اپنا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر یہ رنگ افق پر اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ ان میں راستہ ملنا تو دور کنار کسی اور سمت کھو جانے کا خدشہ پیدا ہونے لگا تھا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے اللہ وسایا کی آنکھوں میں دیکھا جہاں وہی قرمزی رنگ دیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

دن بھر شکار کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ دونوں تھک گئے تھے۔ جس ہرن کا پیچھا کرتے کرتے وہ صحرا کے اس حصہ میں نکل آئے تھے وہ بھی سورج کی طرح ناہموار ریت میں کہیں روپوش ہو چکا تھا اور وہ راستہ بھی بھول چکے تھے۔ اللہ وسایا صحرا کا رہنے والا تھا اور اس کے تمام بڑے راستوں سے واقف تھا۔ دن کے وقت وہ ایک اچھے گائیڈ کے فرائض انجام دیتا رہا تھا مگر سورج کے غروب ہوتے ہی صحرا نے ایک ایسی پراسراریت طاری کر لی تھی کہ اللہ وسایا جیسا تجربہ کار آدمی بھی اس کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں دور افق تک گھرے ہوتے ہوئے سایوں میں اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر صحرا اپنا روپ تبدیل کر چکا تھا اور اللہ وسایا کے چہرے پر مایوسی چھلنے لگی تھی۔ اس نے کامران کو بتایا کہ اب مزید آگے جانا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ اگر جیپ سورج کی طرح کسی صحرائی دلدل میں اتر گئی تو ان کے لیے مشکل ہو جائے گی۔

کامران نے تھوڑی دور جانے کے بعد جیپ روک دی۔ صحرا کے کینوس پر

Scanned by CamScanner

بکھرتے ہوئے قرمزی رنگ تیزی سے سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان دونوں نے مل کر تیزی سے خیمہ لگایا۔ ان کے خیمہ لگاتے لگاتے صحرا پوری طرح اندھیرے میں روپوش ہو گیا تھا۔ اللہ وسایا نے لالٹین روشن کر لی تھی مگر لالٹین کی روشنی میں وہ صرف اللہ وسایا کا چہرہ دیکھ سکتا تھا جو صحرا کی ریت کی طرح ناہموار دکھائی دے رہا تھا۔

اللہ وسایا نے خیمے کے دہانے پر لالٹین لٹکانے کے بعد کامران کو بتایا کہ یہ اندھیرا زیادہ دیر نہیں رہے گا ابھی تھوڑی دیر میں چاند طلوع ہوگا اور صحرا کی ریت پر دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی۔ کامران کو صحرا کی چاندنی رات دیکھنے کا بہت شوق تھا مگر یوں راستہ کھو جانے اور صحرا میں رات گزارنے کا اس کے ساتھ پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اللہ وسایا جیپ سے خشک لکڑیاں نکال کر آگ جلانے میں مصروف ہو گیا تھا اور وہ پانی کی بوتل میں بچے ہوئے پانی کے چند گھونٹ پیتے ہوئے چاندنی رات کا تصور کرنے لگا تھا۔ اللہ وسایا نے آگ جلا کر اس پر قہوے کی کیتلی رکھ دی تھی۔ کامران کو آج پہلی بار زندگی کا ایک مختلف روپ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک شکاری کی حیثیت سے وہ پہلے بھی زندگی کے مختلف روپ دیکھ چکا تھا مگر آج کی پراسرار ریت ان سب سے جدا تھی۔ کامران کا تعلق پنجاب کے ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تھا۔ اس کے بھائی اپنا اپنا کاروبار سنبھال چکے تھے اور اب اپنے اپنے گھروں میں معمول کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک ناکام آدمی تھا جو نہ تو اپنا کاروبار سنبھال سکا تھا اور نہ ہی اپنی گھریلو زندگی کو قائم رکھ سکا تھا۔ نجمہ کے ساتھ شادی کے بعد اس نے گھر بسانے کی پوری کوشش کی تھی مگر اسے معمول کی وہ زندگی اس قدر مصنوعی محسوس ہونے لگی تھی کہ وہ چند سالوں سے زیادہ اسے نہیں نبھا پایا تھا۔ وہ زندگی میں ایک ایسے تجسس کا قائل ہو گیا تھا جو قدم قدم پر اسے ایک نئے خوف میں مبتلا کر دے۔ اس کا خیال تھا کہ خوف کی صورت میں ہی اس کی تمام تر حسیات بیک وقت بیدار ہو سکتی تھیں اور جب تک تمام حسیات ایک ساتھ بیدار نہ ہوں وہ زندگی کو پوری طرح سے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر صحرا میں وہ اکیلا ہوتا تو

Scanned by CamScanner

زندگی کے بدن کو اپنی تمام تر حسیات کے ساتھ چھو سکتا تھا مگر اللہ وسایا کے ہوتے ہوئے اسے یہاں کسی طرح کا کوئی خوف نہیں تھا۔ صحرائی درندوں سے نمٹنے کے لیے اس کے پاس شکاری بندوق تھی۔ اندھیرے سے بچنے کے لیے لالٹین جبکہ صحرا کی ریت پر نصب خیمہ اسے ایک محفوظ قلعے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

اللہ وسایا جب اس کے لیے قہوہ لے کر آیا تو اس نے کامران کو بتایا کہ چاند افق پر آ چکا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہر طرف چاندنی کے پھول کھلنے لگیں گے۔ کامران نے پہلی بار ذرا مسکرا کر اللہ وسایا کو دیکھا جو راستہ کھو جانے پر ذرا بھی پریشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صحرا کے لوگ راستہ کھو جانے پر پریشان نہیں ہوتے بلکہ صحرا سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں، یہاں تک کہ صحرا انہیں خود ان کے راستے کا ادراک عطا کر دیتا ہے۔ وہ صحرا کو اپنا رہبر خیال کرتے ہیں جو بھٹک جانے کی صورت میں انہیں راہ راست پر لے آتا ہے۔

قہوہ پینے کے بعد کامران جب خیمے سے باہر چاند کو دیکھنے کے لیے نکلا تو اسے صحرا کا ایک نیا روپ دکھائی دیا۔ چاند ابھی زیادہ روشن نہیں ہوا تھا مگر صحرا کی ریت ہر شے سے بے خبر سانس روکے چاندنی کے اترنے کی منتظر دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی حسین دوشیزہ اپنے محبوب کے پہلے بوسے کے انتظار میں اپنی محبت کی فراوانی کو تھامے کھڑی ہو۔ چاند جیسے جیسے روشن ہوتا جا رہا تھا صحرا کے بدن کا رواں رواں بیدار ہوتا دکھائی دینے لگا تھا یہاں تک کہ چاندنی کا دودھیا نور صحرا کی دن بھر کی پیاس بجھانے کے لیے اس کے ہونٹوں میں جذب ہونے لگا تھا۔

کامران چاندنی اور صحرا کے ملاپ میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اسے اللہ وسایا کے قریب آنے کا بھی پتہ نہیں چلا۔ اللہ وسایا اسے بتانے آیا تھا کہ صحرا کی چاندنی رات بہت خطرناک ہوتی ہے۔ وہ اسے چاندنی رات سے ڈرانے کے لیے اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی حکایات سنا رہا تھا۔ کامران ان حکایات سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ان کے خوف سے اپنی تمام تر حسیات کو بیدار ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا اور اس کے پاؤں سفر کے

لیے بے تاب ہونے لگے۔

اللہ وسایا نے اسے کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی مگر صحرا کی چاندنی رات اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ اس چاندنی سے دھلی ہوئی ریت پر دور تک پیدل چلنا چاہتا تھا۔ اس خوف کے لمس کو اپنے اندر پوری توانائی کے ساتھ بیدار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اللہ وسایا کی ایک نہ مانی اور اپنی شکاری بندوق اٹھا کر چاندنی کے دریا میں اتر گیا۔ اسے دور تک اللہ وسایا کی آواز آتی رہی۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ صرف وہاں تک جانا جہاں تک اسے خیمے کے دہانے پر لگی لالٹین دکھائی دیتی رہے۔ اگر اس سے آگے چلا گیا تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آسکے گا۔

کامران کے اندر کا خوف اسے ایک ایسی سمت لیے جا رہا تھا جہاں لذت کی انتہا ہمیشہ فنا پر ہوتی ہے۔ صحرا کی نرم ریت اسے اپنے پاؤں کے نیچے یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ کہیں خواب میں چلتا جا رہا تھا۔ وہ جب بھی مڑ کر دیکھتا تھا اسے خیمے کے دہانے پر لگی لالٹین کی روشنی دور صحرا میں ایک ستارے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس روشنی سے دور ہونا چاہتا تھا۔ اس کی موجودگی میں خوف پوری طرح اس کے اندر بیدار نہیں ہو رہا تھا۔ آج وہ خوف کی...... اس انتہا تک جانا چاہتا تھا جہاں اس کے جسم کا آخری رواں تک اس کیفیت سے بیدار ہو جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو لالٹین کی روشنی صحرا میں گم ہو چکی تھی۔ اس نے سمت کا اندازہ کرنا چاہا تو اسے بالکل بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کس طرف سے آیا تھا۔ اس کے چاروں طرف صحرا کی ریت پر چاندنی کے بھنور بن رہے تھے۔ اسے صحرا سے ایک عجیب طرح کی خوشبو آنے لگی تھی جیسے دور دور تک چاندنی کے پھول کھل گئے ہوں۔ خوشبو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی شکاری بندوق ریت میں گاڑ کر ریت کے نرم بستر پر لیٹ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چاند آہستہ آہستہ صحرا کے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ اسے صحرا میں قریب ہی کسی جانور کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ یکایک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاندنی رات میں اسے دو چمکتی ہوئی آنکھیں ایک سامنے

کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ اس نے ریت سے بندوق نکالی۔ وہ ابھی چمکتی ہوئی آنکھوں کا نشانہ لینے کی سوچ رہا تھا کہ خوف کا ایک نیا کوندا برقی رو کی طرح اس کے جسم سے گزر گیا۔ وہ چاندنی میں اتنا محو تھا کہ خیمے سے نکلتے ہوئے کارتوس اٹھانا بھول گیا تھا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر جب چمکتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا تو وہ اس کے قریب تر آ رہی تھیں اور ان کے پیچھے پیچھے کچھ اور سایوں پر چمکتی آنکھیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ جان چکا تھا کہ بھیڑیوں کا غول صحرا میں اس کی خوشبو سونگھ کر اسے شکار کرنے کے لیے آ گیا تھا۔ اس نے بندوق نالی کی طرف سے پکڑ لی اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا مگر بھیڑیے تعداد میں اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ ان سے بچنا ناممکن تھا۔ وہ سب اس کے قریب ایک فاصلے پر جمع ہو کر مسلسل غرا رہے تھے۔ خوف اس کے جسم میں پوری طرح روشن ہو چکا تھا اور اسے اپنا جسم ایک الاؤ کی طرح دہکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا اس سے پہلے کہ بھیڑیے جمع ہو کر اس پر حملہ کر دیں کیوں نہ وہ خود ان پر ٹوٹ پڑے۔ مگر وہ خوف کی اس انتہا پر تھا جہاں سوائے موت کے کوئی دوسری کیفیت اس الاؤ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ شکاری نہ ہوتا تو شاید خود کو آسانی سے ان کے حوالے کر دیتا مگر ایک شکاری کی حیثیت سے اسے زندگی کے آخری لمحے تک اپنی بقاء کی جنگ لڑنا تھی۔

بھیڑیوں کی غراہٹ اور ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں، موت کا بے رحم خوف لیے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ شاید حملہ آور ہونے کے لیے اپنے باقی ساتھیوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کامران کے سامنے اس کی موت کا منظر تھا۔ خوف کا الاؤ اس کے اندر پوری طرح روشن ہونے کے بعد اب بجھنے لگا تھا اور اس کی جگہ ڈر کے سائے اس پر پھیلنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ ڈر کے مہیب سائے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے وہ اپنے خوف کو دوبارہ روشن کرنا چاہتا تھا مگر ڈر اس پر غالب آنے لگا تھا۔

بھیڑیوں کے آخری ساتھی بھی ان کے غول میں آ ملے تھے اور اب ان کی

غراہٹ صحرائی بگولے کی طرح اس کے گرد چکر کاٹنے لگی تھی۔ اسی بگولے میں اسے اپنے قریب سے کہیں اونٹوں کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ صحرا سے کوئی قافلہ گزر رہا تھا یا زندگی امید کے آخری چراغ روشن کر رہی تھی۔ بھیڑیوں کی غراہٹ میں اسے کچھ سجھ نہیں آ رہا تھا۔

کامران نے جب بھیڑیوں کو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی قافلہ اس کے قریب پہنچ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ غراہٹ دور ہو رہی تھی اور اونٹوں کی گھنٹیاں قریب آ رہی تھیں۔ اونٹوں کو قریب آتے دیکھ کر بھیڑیے اپنا راستہ بدل کر صحرا میں گم ہو گئے تھے۔ موت پیچھے ہٹ گئی تھی اور زندگی قریب آ رہی تھی۔ اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز میں زندگی تھی۔ امید تھی، ایک دلاسہ تھا جس نے اس کے شل ہوتے ہوئے بازوؤں میں ایک بار پھر خون کو رواں کر دیا تھا۔ وہ چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ اگر گھنٹیوں کی آواز اس کے قریب نہ آتی تو بے رحم بھیڑیے اب تک اسے چیر پھاڑ چکے ہوتے اور ریت پر بکھرے اس کے اعضاء پر جھپٹ رہے ہوتے۔ اس تصور سے ہی اس کے جسم میں ایک بار پھر خوف سے جھرجھری آئی اور اس نے ڈر کی اوٹ سے نکل کر اونٹوں کے سائے چاندنی رات میں اپنے قریب آتے دیکھے۔

ساربان نے اونٹ روک کر کچھ دیر کامران کو دیکھا۔ پھر اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس وقت صحرا میں کیا کر رہا ہے۔ کامران کو قریب سے دیکھا، اس سے ہاتھ ملایا اور اسے بتایا کہ وہ پیر خانے جا رہے ہیں۔ ان کا بیٹا پنوں آگے جا چکا ہے اور وہ صبح ہونے سے پہلے اس سے جا ملیں گے۔

ساربان جو بڑی عمر کا آدمی دکھائی دیتا تھا جس نے صحرائی انداز میں پگڑی باندھ رکھی تھی۔ جب دوبارہ اونٹ پر سوار ہونے لگا تو کامران نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ دن چڑھنے پر وہ اپنے ساتھی اور اپنے خیمے کو تلاش کرے گا۔ ساربان نے بتایا کہ ان کے قافلے میں ایک اونٹ خالی ہے۔ اگر وہ ان کے ساتھ جانا چاہتا ہے تو وہ اس پر سوار ہو سکتا ہے۔ ساربان کامران کو اپنے آخری اونٹ

Scanned by CamScanner

کے پاس لے کر گیا اور اسے اس پر سوار کرتے ہوئے بتایا کہ اگلے دونوں اونٹوں پر اس کی بیوی اور بیٹی سوار ہیں اس لیے وہ اونٹ کو اپنی مرضی سے سفر کرنے دے۔ کامران کو اونٹ پر بیٹھنے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی محفوظ قلعے میں پہنچ گیا ہو۔ کامران اونٹ کو جب بھی دیکھتا اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے یہ بھی صحرا کا ہی حصہ ہے۔ جیسے صحرا کی ریت گوندھ کر ہی اسے بنایا گیا تھا۔ یہ وفادار جانور جو اپنی آخری سانس تک صحرا کی ریت پر چلتا رہتا ہے اور پھر ایک روز اچانک چلتے چلتے گر کر پھر ریت میں مل جاتا ہے۔

چاندنی رات میں قافلہ اونٹوں کی خاص رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اونٹوں کے سائے بھی ان کے ساتھ ساتھ ریت پر سفر کر رہے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے سواروں کے سائے بھی ایک ردھم کے ساتھ آگے پیچھے حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

کامران کچھ دیر تو اپنے خیمے کے دہانے پر لٹکی لالٹین کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر صحرا میں دور دور تک اسے روشنی کا کوئی نشان دکھائی نہ دیا۔ کافی دیر چلنے کے بعد کامران کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے خیمے سے بہت دور ہو گیا ہے۔ کافی دیر چلنے کے بعد قافلہ ایک جگہ رک گیا۔ سب لوگ اونٹوں سے اتر کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کامران ان سے ذرا فاصلے پر ایک ٹیلے پر بیٹھ کر صحرا کی وسعت کا اندازہ کرنے لگا۔ وہ اجنبی تھا اور قافلے میں خواتین بھی تھیں اس لیے اسے ذرا فاصلے پر ہی بیٹھنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک لڑکی اپنے قریب آتی دکھائی دی۔ جس نے چاندنی کی طرح سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے ایک طشتری اٹھا رکھی تھی جس میں کانچ کی پیالیوں میں کتھئی رنگ کا قہوہ رکھا تھا جس سے بھاپ نکل رہی تھی۔ لڑکی نے قریب آ کر بتایا کہ اس کے بابا نے مہمان کے لیے قہوہ بھیجا ہے۔ کامران نے اس لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی جو چاندنی کی روشنی میں دودھیا دکھائی دے رہا تھا اور اس کی دونوں آنکھوں میں پورے چاند کا عکس جھلملا رہا تھا۔ لڑکی اپنا لباس سنبھال کر اس کے سامنے بیٹھ گئی اور اس نے قہوے کی

Scanned by CamScanner

طشتری اس کے سامنے ہموار ریت پر رکھ دی۔

کامران کا تعلق ایک بڑی فیملی سے تھا جس میں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ جو فیشن اور سلیقے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں مگر اس لڑکی کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے وہ اس سے خوبصورت لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کامران کے پوچھنے پر اس لڑکی نے اپنا نام چنبیلی بتایا اور قہوے کی ایک پیالی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ قہوے کی پیالی لیتے ہوئے کامران نے لڑکی کے تخروطی دودھیا ہاتھ کو دیکھا اور اس کے نام پر غور کرنے لگا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کا نام چنبیلی ہی ہو سکتا تھا۔

قہوہ پیتے ہوئے وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ باتیں کرتے کرتے لڑکی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ کامران نے ان آنسوؤں کی وجہ پوچھی تو چنبیلی نے بتایا کہ اس کا خاندان پیر خانے جا رہا ہے جہاں کل اس کی شادی کر دی جائے گی۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا جیسے وہ اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ چنبیلی نے بتایا کہ وہ اس آدمی سے شادی نہیں کرنا چاہتی جو پہلے سے شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔ کامران کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو کسی کی سوتن بنایا جا رہا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کی جا رہی تھی۔ مگر وہ اس کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ اس صحرا میں جہاں اسے اپنے گرد و پیش کا بھی علم نہیں تھا وہ چنبیلی کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ چنبیلی نے تو رات کے سفر میں ایک اجنبی مسافر کو قریب پا کر اپنے دکھ کے پھول اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے مگر وہ ان پھولوں کی اداس خوشبو کو اپنے دامن میں کیسے سمیٹ سکتا تھا جبکہ وہ خود ان کے خاندان کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر وہ لوگ زندگی بن کر اسکے قریب نہ پہنچ جاتے تو اب تک بھیڑیے اس کی ہڈیوں سے گوشت کی آخری بوٹی تک نوچ کر کھا چکے ہوتے۔

کامران ابھی اسی سوچ میں گم قہوے کے جاں بخش گھونٹ لے رہا تھا کہ چنبیلی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہی سوال کہہ ڈالا جس کا اسے خوف لاحق تھا۔ چنبیلی اپنے خاندان کے ساتھ پیر خانے نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ کامران پر فریفتہ ہو گئی

Scanned by CamScanner

تھی اور اس کے ساتھ صحرا میں بھٹک جانا چاہتی تھی۔ اس کی محبت کی چاندنی رات میں کھو جانا چاہتی تھی۔

کامران کے اندر ایک بار پھر خوف کا الاؤ روشن ہو گیا تھا جس نے اس کے جسم کے روئیں روئیں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک چنبیلی کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے چاند کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی طشتری میں رکھی اور چنبیلی کا ہاتھ پکڑ کر ٹیلے کی دوسری جانب چلا گیا۔ وہ دونوں کسی سمت کا تعین کیے بغیر صحرا میں بھاگنے لگے یہاں تک کہ اپنے قافلے سے بہت دور چلے گئے۔ وہ جانتے تھے کہ صحرا کی وسعت میں اب انہیں کوئی تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ بہت دیر تک بھاگنے کے بعد وہ دونوں ایک جگہ ریت کے نرم بستر پر گر گئے اور اپنی سانسوں کا توازن بحال کرنے لگے۔ چاند کی روشنی میں چنبیلی کے بالوں کے سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیر اثر ناچ رہے تھے اور صحرا کی مست ہوا کے جھونکے نئی زندگی کے گیت گانے لگے تھے۔ کامران نے چنبیلی کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے خوف کا الاؤ اس کے جسم سے باہر نکلنے لگا تھا اور اس کی سنہری حدت کے سائے چنبیلی کے دودھیا چہرے پر پڑنے لگے تھے۔ کامران نے وفور شوق سے بے اختیار ہو کر اپنے ہونٹ چنبیلی کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سارے صحرا کی چاندنی یکایک اس کے ہونٹوں میں سمٹ آئی ہو۔ چنبیلی کی آنکھوں میں ابھی تک چاند جھلملا رہے تھے اور ان کی چاندنی کا رس کامران کے ہونٹوں میں اتر رہا تھا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ چاند دوسرے افق پر پہنچ کر اپنی تابانی کھو رہا تھا اور اس کی نقرئی رنگت پر زردی چھانے لگی تھی۔ کامران اور چنبیلی ریت کے نرم بستر پر لیٹے ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے زندگی کے ان گنت پیغام تھے۔ وہ صبح کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہے تھے جب انہیں ایک نئی منزل کو روانہ ہونا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر محو تھے کہ انہیں کسی کے قریب آنے کا احساس تک نہ ہوا۔

Scanned by CamScanner

چنبیلی نے اپنے قریب کھڑے ایک اونٹ کو جب دیکھا تو اچانک اس کے منہ سے اپنے بھائی بنوں کا نام نکلا۔ کامران چونک گیا۔

بنوں اونٹ پر بیٹھا غصے سے پھنکار رہا تھا اور پردیسی کو کوس رہا تھا کہ اس کے باپ نے تو اسے راستہ دکھانے کے لیے اپنے قافلے میں شامل کر لیا تھا مگر وہ بددیانت نکلا اور اسی کی بیٹی کو ورغلا کر یہاں لے آیا۔ مگر شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ صحرا بددیانت لوگوں کو اپنے حصار سے کبھی باہر نہیں جانے دیتا۔ بنوں نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اپنی رائفل نکالی اور چنبیلی پر فائر کر دیا۔ وہ کامران کے سامنے درد کی شدت سے تلملانے لگی۔ کامران غصے سے اٹھ کر بنوں پر وار کرنے لگا تھا کہ دوسری گولی اس کے سینے سے پار ہو گئی اور وہ منہ کے بل ریت پر اوندھا ہو کر گر گیا۔

سورج جب طلوع ہوا تو صحرا میں چاندنی رات کا پراسرار منظر ریت میں کہیں روپوش ہو گیا۔ اللہ وسایا نے دور سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ ایک فاصلے پر اسے کامران ریت پر اوندھے منہ پڑا دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا کامران کے پاس آیا۔ ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھا پھر اسے ریت پر سیدھا کیا۔ کامران نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں جیسے وہ ایک بار پھر موت سے زندگی کی طرف آ رہا ہو۔ اس کے سامنے اللہ وسایا بیٹھا تھا۔ کامران نے اٹھتے ہوئے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر کانپتے ہونٹوں سے اللہ وسایا کو گہرے دکھ کے ساتھ بتانے لگا کہ بنوں نے چنبیلی کو قتل کر دیا۔ اس ظالم نے میرے سامنے اس لڑکی کو گولی مار دی۔ اللہ وسایا نے کامران کو اٹھاتے ہوئے بتایا کہ یہ بات تو بہت پرانی ہو چکی ہے۔ چلیے میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ صحرا کی چاندنی رات میں اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ کامران نے اللہ وسایا کو حیرت سے دیکھا اور مزید کچھ بتائے بغیر اس کے ساتھ خاموشی سے اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

Scanned by CamScanner

حافظ محمد شفیق انجم (4th سمسٹر)

مندری

شہر سے ذرا باہر ایک جھونپڑی بنی تھی۔ جھونپڑی کیا تھی، چار لکڑیوں گاڑ کر اوپر گھاس پھونس ڈال دیا گیا تھا۔ چماروں کا کنبہ تھا۔ بوڑھا ماجھا، اس کا بیٹا 'سونا' اور ایک لڑکی 'مندری'۔ ماجھے کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی ...... ٹی بی کا مریض، سیاہ کالا رنگ، سوکھا سڑا جسم، پچکے بے نور چہرے پر بھوک اور بیماری کی پرچھائیاں ہویدا...... رات دن ایک کونے میں ایک میلا چیکٹ کمبل اوڑھے پڑا کھانستا رہتا۔ آس پاس جگہ جگہ تھوک اور بلغم کی پڑیاں جن پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ سونا پچیس کا ہوگا، لمبا تڑنگا مگر پتلا سوکھا اور روکھا پھیکا۔ رنگت میں اپنے باپ ماجھے سے بھی گیا گزرا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، لمبی ناک، پتلی سی مونچھیں، کائی کی طرح کے بے ڈھنگے بال، کچھ کام ملتا تو کر لیتا ورنہ دن بھر آوارہ پھرتا اور رات کو آ کر ایک طرف پڑ رہتا۔

مندری سونے ہی کی عمر کی چھوٹے قد اور دوہرے بدن کی عورت تھی۔ کئی برس پہلے جب ماجھا دھندے پر جاتا تھا تو کسی ڈھیر سے ترس کھا کے اٹھا لایا تھا۔ تبھی سے یہاں تھی۔ کچھ مانگ تانگ لاتی اور کھا پی لیتی، بچ رہتا تو بوڑھے اور سونے کو بھی دے دیتی۔ تینوں کی زندگی عرصے سے یوں ہی گزر رہی تھی۔ بوڑھا ماجھا تو اب بہت ساری فکروں سے آزاد ہو چکا تھا۔ بس فرشتہ اجل کے انتظار میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ لیکن مندری اور سونے کے دل میں کبھی کبھی اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی آرزو سر اٹھاتی۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر اکثر سوچتے لیکن کچھ بن نہ پڑتا۔ کرتے بھی تو آخر کیا۔ کوئی ڈھنگ کا کام انھیں آتا ہی کب تھا اور اگر آتا بھی ہو تو کوئی بھلا انھیں کام پر کیونکر لگانے لگتے۔ چمار جو ہوئے، پلید، پاپی، گندے

آج وہ دونوں اکٹھے بیٹھے تھے۔ مندری سائیں بابا کے

Scanned by CamScanner

مزار سے تھیلا بھروا کر سلو نے چاولوں کا لائی تھی۔ ماجھے کو تھوڑے سے دے کر باقی وہ دونوں کھا رہے تھے، یوں جیسے بھوکے گدھ۔ سونا کہہ رہا تھا

''واہ مندری واہ، آج مجھے آ گیا —— تو واقعی بڑی سندر ہے''

—— کل ابا کہہ رہا تھا کہ میں تم سے بیاہ کر لوں۔

—— تو راجی ہے نا مندری!

مندری چہک اٹھی۔

—— اب جو ماجھے کی مرجی وہی اپن کی مرجی

پھر دونوں کا بیاہ بھی ہو گیا۔ بیاہ کیا تھا بس ایک دن ماجھے نے مندری کا ہاتھ پکڑا اور سونے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بس اللہ اللہ۔ نہ مولوی آیا، نہ لوگ جمع ہوئے، نہ کپڑے بنے، نہ کھانے پکے۔ کئی کئی دن فاقوں رہنے والے چمار بھلا یہ سب کیونکر کر سکتے تھے۔ شادی کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ماجھا چل بسا۔ کفن دفن کے لیے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ دن بڑی مشکل سے گزرا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو دونوں اسے چپکے سے اٹھا، پاس والے قبرستان میں دبا آئے۔ اب دونوں جھونپڑی میں گم صم بیٹھے اندھیرے میں گھور رہے تھے۔ مندری کو رونا آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کے روئے، عجب وحشت سی ہو رہی تھی، ساری جھونپڑی سونی سونی سی لگ رہی تھی۔ ماجھا تھا تو چلو، کھانستا تو تھا۔ زور سے آئے وائے تو کرتا تھا، اس کی سانسوں کی آواز تو آتی تھی۔ اب وہ نہیں تو کتنی بے رونقی ہے۔ ہائے اللہ اس نے مجھے پالا پوسا لیکن میں اسے کچھ بھی نہ دے سکی۔ اس کا کفن تک نہ بن سکا۔ کچھ اسی طرح کے خیالات سونے کے بھی تھے۔ کیا ہمارے ساتھ بھی یہی ہوگا، ہم بھی یونہی کھپ مریں گے۔ کیا ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ نہ نہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

پھر دونوں نے مل کر عہد کیا کہ وہ کام کریں گے، محنت کریں گے اور پیسے کمائیں گے۔ پھر کام بھی سوجھ گیا، پورا منصوبہ ترتیب پا گیا۔ ہاں کل سے کام شروع۔ کل سے ہم

Scanned by CamScanner

شہر سے کوڑا اکٹھا کر کے یہاں لائیں گے۔ بلدیہ والے دس روپے فی من کے حساب سے خرید رہے ہیں تاکہ بھنگیوں کو رغبت ہو اور وہ شہر کی صفائی صحیح طور پر کریں۔

پھر اگلے دن سے کام شروع بھی ہو گیا۔ دونوں صبح نکلتے اور شام تک شہر کی سڑکوں اور گلیوں سے کوڑا اٹھا اٹھا ایک جگہ ڈھیر لگاتے جاتے، خوب ڈھیر لگ چکتا تو بلدیہ والوں کا ٹرک آتا، وزن ہوتا اور پھر ایک نئے ڈھیر کے لیے کام شروع ہو جاتا۔ اب ہر ہفتے سونے کی جیب میں ایک لال نوٹ آنے لگا۔ وہ ان نوٹوں کو سنبھال کر رکھتے جاتے۔ اکثر کوڑے سے کھانے پینے کی اشیا، چھانٹ کر پیٹ بھر لیتے اور اگر کچھ نہ بھی ملتا تو سائیں بابا کے مزار سے چاولوں کا لفافہ بھر والاتے۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔

ایک دن جب وہ کوڑا اکٹھا کر رہے تھے تو مندری چکرا سی گئی۔ سونا قریب نہ ہوتا تو شاید گر جاتی۔ سونا پوچھ رہا تھا، اری مندری تجھے کا ہوا رے۔ وہ بولی سونے مجھے گھر لے چل۔ میرے پیٹ میں کچھ ہووت ہے، سر گھومے ہے۔ اتنے میں اسے زور کی قے ہوئی۔ سونا اسے فوراً گھر لے گیا۔ پانی پلایا، سر دبایا لیکن وہ رات بھر تڑپتی رہی، آئے وائے کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہی سونا اسے قریبی ہسپتال لے گیا۔ کسی نے اسے منہ نہ لگایا۔ کافی دیر سونا مندری کو لیے ہسپتال کے برآمدے میں بیٹھا رہا۔ مندری کی کراہیں دل دہلا رہی تھیں۔ بہت منت سماجت کے بعد چپراسی نے اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے دیا۔ مندری کو فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے دوائیوں کی ایک لسٹ اسے دی گئی۔ وہ دوائیاں لینے گیا تو پورے آٹھ مہینوں کی کمائی ایک پل میں ہوا ہو گئی۔ مندری درد سے بلبلا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، سونے میں نہ بچوں ہوں، میری جندگی اب بس ہے اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کی آہیں، کراہیں اور چیخیں دم توڑ گئیں۔ اب اسے آپریشن کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اسے چپ چاپ کندھوں پر اٹھائے واپس جھونپڑی میں آ گیا اب وہ سوچوں میں گم تھا۔ مندری کے کفن کے لیے، قبر کی کھدائی کے لیے، مولوی صاحب کی خدمت کے

Scanned by CamScanner

لیے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ بجھی بجھی آنکھوں سے وہ اس کی لاش کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کیوں نہ ماجھے کی طرح اسے بھی گڑھا کھود کر دبا دے لیکن اچانک ایک اور خیال نے اس کے دل میں کروٹ لی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اٹھا اور ایک پرانے بورے میں مندری کی لاش ڈال کر اوپر سے گرہ لگا دی .... صبح بیٹنے بھر کے جمع شدہ کوڑے کا وزن ہوتا تھا .... وہ سوچنے لگا .... بہت کم ہوئی تب بھی دو من تو ہوگی۔

❁❁❁

میمونہ فاطمہ

ڈھلتے سورج کا غم

افشاں نے آتے ہی بیگ زور سے ٹی۔وی لاؤنج میں رکھا اور کچن میں آئی جہاں امی کام کر رہی تھیں۔

''آ گئیں تم! کیسا دن گذرا؟''

''بس امی آج پھر وہی شادی کا موضوع اور بڑی عمر کی باتیں ہوتی رہیں''۔

امی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولیں۔

اچھا بھلا رشتہ تھا...... آصف کا۔ مگر تمہیں ہی اس وقت انکار کا جوش چڑھا ہوا تھا۔ اب دیکھو خوش باش ہے دو بچوں کا باپ ہے۔ گھر ہے، گاڑی ہے، عیش کرتی ہے تیرا۔ تمہیں تو بہت سمجھایا تھا مگر تم تھیں کہ ماننے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ اب وہ بھی تو اسی نند کے ساتھ رہ رہی ہے یا نہیں؟ باپ کو الگ کہہ دیا کہ دو وقت کی روٹی بھاری پڑ رہی ہے اس لیے مجبور کر رہے ہیں۔

امی آپ بھی بس شروع ہو گئیں پرانے قصے لے کر۔ کوئی بہتری ہی ہوگی نا ہونے میں۔

امی نے پیار سے افشاں کو اپنے قریب کیا اور سمجھانے لگیں۔

''دیکھو بیٹا!'' میں تم پر غصہ اس لیے کرتی ہوں کہ جوانی کا سورج ایک دفعہ ڈھل جائے تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور پھر کبھی صبح نہیں ہوتی۔ دیکھو جو بھی آتا ہے چھوٹی کو پسند کر کے چلا جاتا ہے جبکہ تم میں کیا کمی ہے۔ بس عمر کا سن کر لوگ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو کوئی سبب بنا دے۔

رہنے دیں امی، آپ یہ بھی بڑی تیز ہے جو کوئی آتا ہے۔ انکار کر دیتی ہے۔ نہ اپنا

کرواتی ہے اور نہ میرا ہونے دیتی ہے۔ کروا لے — کم از کم لوگوں کے پاس چوائس تو نہیں ہوگی۔

بیٹا فیاض آگئے تم؟

جی امی! السلام علیکم! ''کھانا تیار ہے؟''

ہاں بس تم ہاتھ دھولو، میں لگاتی ہوں۔

''آپی آگئی؟''

ہاں اوپر گئی ہے۔

بیٹا! میں تو اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ سب کوششیں کرلی ہیں مگر'' ہاتھ پھر بھی خالی کے خالی ہیں''۔ بیٹا تم ہی کہیں بات کرو۔ لمبی سانس لیتے ہوئے، ''میں تو بہت تھک گئی ہوں''۔

امی میں بھی کیا کروں اب دکان پر بیٹھا لوگوں سے بہنوں کے رشتے کی بات کروں؟ — امی آپ بھی بس عجیب باتیں کرتی ہیں۔ ہر طرح کا بندہ آتا ہے وہاں۔

''فیاض تم آگئے؟''

ہاں آپی، کیسا دن گذرا؟

ابو کا فون آیا تھا کب آئیں گے؟

ہاں امی بتا رہی تھیں کہ Tour ختم ہوگیا ہے۔ کل تک اسلام آباد آجائیں گے۔

اتنے دن ہوگئے انور کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ جب سے امریکہ گیا ہے، میرا تو دل پریشان رہتا ہے۔'' جانے پردیس میں کیسا ہوگا''۔

امی پریشان نہ ہوں، مجھے باتوں میں یاد ہی نہیں رہا۔ بھائی جان نے مجھے موبائل پر فون کیا تھا۔ خیریت سے ہیں اور سب کو سلام کہہ رہے تھے۔

مجھے تو اس کی بھی بہت فکر ہے۔ عمر گذرتی جارہی ہے اور کوئی سبب نہیں بن رہا۔ اس دفعہ آئے گا تو شادی کر کے ہی بھجواؤں گی۔ امی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بے بسی

Scanned by CamScanner

کے عالم میں کہنے لگیں کہ

''اللہ نے جانے کس آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ دعائیں تو بہت کرتی ہوں جانے کب قبولیت کا وقت آئے گا''۔

اچھا امی میں دکان پر جارہا ہوں۔

امی میں سونے لگی ہوں، جب آسیہ آئے گی تو چائے بناؤں گی۔

''اسلام علیکم''

آگئیں آسیہ تم؟

چلو بیٹا کپڑے بدل لو پھر چائے پیتے ہیں۔

جی امی! ابھی آئی۔

آسیہ ناشتہ کر کے جایا کرو۔ بہت دبلی ہو رہی ہو۔

چھوڑیں امی کچھ نہیں ہوتا۔

آپی آپ کا کالج کیسا جارہا ہے؟

ہاں ٹھیک ہے! تم سناؤ تمھاری انٹرن شپ کتنی رہ گئی ہے۔

بس آپی اب تو گذر گئی، آخری ہفتہ رہ گیا ہے۔ سوچ رہی ہوں وہیں پر جاب کر لوں۔ اتنے میں امی کی آواز آئی۔

''چلو لڑکیو! اب شام کے کھانے کا بھی کچھ کرلو''۔

امی کرلیں گے ابھی بہت ٹائم ہے۔

☆

میں نے فیاض کو کتنی دفعہ کہا ہے کہ جلدی آجایا کرے، مگر یہ لڑکا نہیں سنتا۔ اپنی مرضی کرتا ہے۔

افشاں بھائی کو فون کرو دس بج رہے ہیں، ابھی تک نہیں آیا۔

آپی فیاض کو فون کرو، جب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔

آسیہ بہت اچھا آلو گوشت بنایا ہے۔ آسیہ فخر سے بولی

''آخر بنایا کس نے ہے، مزے کا تو ہونا ہی تھا''۔

بھئی میں تو بہت تھک گئی ہوں اور سونے جا رہی ہوں۔ تم دونوں بھی جلدی سو جانا۔

بس امی ہم بھی اب سونے ہی جا رہے ہیں۔

آسیہ لائٹ بند کر دو۔

آپی میں نے تمھیں صائمہ کے متعلق بتایا تھا نا کہ اس نے مجھ سے بات کی تھی کہ:

تین بھائی ہیں اور ایک بہن ہے۔ بہن کی شادی ہو چکی ہے باقی دو بھائی پڑھتے ہیں۔ باپ ریٹائرڈ ہے۔ میں نے صائمہ کو اپنا موبائل نمبر دے دیا تھا اور کہا تھا کہ سوچ کر جواب دوں گی۔ آج پوچھ رہی تھی۔

''کیا جواب دوں؟''

ہاں کر لو، رشتہ تو مناسب ہے لیکن وہ تمھیں یہاں رکھے گا یا فیصل آباد میں؟

یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔ بات کروں گی اس سے۔

''ہاں ضرور کرنا''

فیاض بیٹا جلدی کرو، آجاؤ۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

تم دونوں بھی آجاؤ۔

''جی امی ابھی آئے''

فیاض ابو نے آج آنے کا کہا تھا نا؟

ہاں آپی کہہ تو آج کا ہی رہے تھے۔

گیارہ بج گئے ہیں۔ ابھی تک کام ختم نہیں ہوا۔ پہلے تو ان کے جانے کے بعد دس ساڑھے دس بجے تک ختم ہو جاتا ہے۔ اتنے میں بیل بجی اور امی دروازے تک آئیں۔ کھولا تو آگے ابو کھڑے تھے۔

''آ گئے آپ...... کیسا رہا Tour ؟

اچھا تھا، بہت عزت کی لاہور والوں نے۔ میری غیر موجودگی میں سب بچے اور باقی کام صحیح تو چلتا رہا نا؟

ہاں...... سب صحیح تھا۔ آہ بھرتے ہوئے۔ امی نے کہا۔

''مجھے تو بس ان کے رشتوں کی فکر لگی ہوئی ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ آج ہیں..... کل نہیں۔

ہاں یاد آیا میں نے کسی سے بات کی تھی۔ اس نے ایک رشتہ بتایا ہے۔ لڑکا امریکہ میں ہوتا ہے۔ کافی پڑھا لکھا ہے اور عمر بھی مناسب ہے۔ میں نے دونوں کا بتا دیا ہے کہ ایک کالج میں پڑھاتی ہے اور دوسری ڈپلومہ کر رہی ہے۔

اللہ خیر کرے، میں تو سجدے میں جا جا کر دعائیں کرتی ہوں کہ یا اللہ کوئی رحمت کا سبب بنا دے تو چین آئے۔

دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ مایوس نہ ہو، اللہ بہتر ہی کرے گا' انشاء اللہ۔

کہہ رہے تھے کہ آنے سے پہلے اطلاع کر دے کر آئیں گے۔

کہا تو انھوں نے آج کا ہی تھا مگر ابھی تک فون نہیں آیا۔

آپ کہہ کر تو آئے تھے نا؟...... ایڈریس وغیرہ سمجھایا تھا یا نہیں؟

ہاں ہاں، میں نے تو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

اتنے میں فون کی بیل بجتی ہے۔ ابو اٹھاتے ہیں۔

بیگم لاہور سے فون ہے..... بھابھی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔

ہاں ہاں ضرور۔

''اسلام علیکم بھابھی''

کیسی ہیں آپ؟

وہ آج ہم لوگ لڑکیاں دیکھنے آ رہے ہیں۔ شام تک پہنچیں گے۔

''جیسے آپ کی مرضی''۔

Scanned by CamScanner

اللہ حافظ پھر ملاقات ہوتی ہے شام کو۔

''جی ضرور''

آسیہ، افشاں دونوں اچھے کپڑے پہن لو۔ آج شام کو لوگ تمھیں دیکھنے آ رہے ہیں۔

پانچ بجے کے قریب گھنٹی بجی، انکل آنٹی آئے۔ سلام دعا کے بعد دونوں کو بلایا اور باتیں کرتے رہے۔ لیکن زیادہ سوال وہ آسیہ سے کر رہے تھے اور افشاں خود ایک سوال بنی بیٹھی تھی۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ جاتے ہوئے آنٹی نے آسیہ کو پیار کیا اور کہا۔

''بھابھی میں آپ کو فون کروں گی''۔

میرا خیال ہے کہ وہ آسیہ کا ہی رشتہ مانگیں گے کیونکہ رجحان زیادہ اس کی طرف ہی تھا۔

لیکن بیگم انہوں نے ابھی کچھ بھی ظاہر نہیں کیا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟

صبح جاتے ہوئے امی نے ابو سے کہا۔

''آپ خود فون کر کے پوچھ لیجیے گا''۔

اوہو! صبر تو کرو..... شاید ان کا خود ہی فون آ جائے۔

شام کو فون کی بیل بجی۔ امی نے فون اٹھایا۔

''اسلام علیکم''

کیا حال ہیں بھابھی؟

وہ میں نے آپ سے کہنا تھا کہ ہمیں چھوٹی پسند ہے۔ ایک تو وہ بڑی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ دوسرا یہ کہ افشاں کا تو صرف ایک سال کا ہی فرق ہے۔ آپ خود سوچیں، یہ بھی کوئی فرق ہے۔ ہمیں تو آسیہ پسند ہے۔ آپ کی مرضی ہو تو رشتہ پکا کر لیں۔

جی میں آپ کو مشورے کے بعد ہی کوئی بات بتا سکتی ہوں۔

اچھا، تو آپ سوچ لیں۔ میں انتظار کروں گی۔

Scanned by CamScanner

وہ........ آج ان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے آسیہ کے لیے ہاں کی ہے۔'' آپ کا کیا خیال ہے''۔

تو دیر کس بات کی ہے۔ کر دو۔

میں نے آسیہ سے بات کی تھی۔ مگر وہ کہتی ہے کہ پہلے آپی کا ہوگا پھر میرا۔۔۔

افشاں نے تو آسیہ کو سمجھایا ہے کہ کرلو کیونکہ ایک دفعہ وقت نکل جائے تو کبھی واپس نہیں آتا۔ اللہ نے سبب بنایا ہے تو شکر کرو۔

امی! آج organization میں بھائی کی mail آئی تھی۔ وہ وہی رشتے کی بات کر رہا تھا کہ تمہاری وجہ سے افشاں کا رشتہ نہیں ہوتا۔ اب وہ مجھے پسند کر جاتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں تو انہیں نہیں کہتی کہ تم مجھے پسند کرو۔

اچھا اگر میں ہی قصوروار ہوں تو مجھے منظور ہے۔'' ہاں کہہ دیں''۔

آسیہ کا رشتہ طے ہو چکا ہے، وہ اس رشتے سے خوش نہیں لیکن مجبوراً مان گئی ہے۔

دوسری طرف افشاں خوش تو ہے مگر شاید مجبوری میں۔

آج آسیہ کی تاریخ مقرر ہو رہی ہے۔ سب کے چہروں پر ایک عجب سی خوشی کے تاثرات جھلک رہے ہیں۔ لیکن افشاں کی خوشی اپنی بہن کے لیے تو اصلی ہے لیکن اپنی ذات کے لیے ظاہری ہے۔ شاید وہ اپنے آپ کو فریب دے رہی ہے۔

آسیہ نے ہرا اور پیلا جوڑا پہنا ہوا ہے۔ آج اس کی مہندی ہے۔ تمام لوگ اس کے گرد جمع ہیں اور اس سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔

وہ آج واقعی ایک کھلی ہوئی کلی کی مانند لگ رہی ہے۔

افشاں کے دل سے اس کے لیے یہی دعا نکل رہی ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح ہنستی مسکراتی رہے۔

آسیہ اپنی شادی والے دن سرخ جوڑے اور زیور میں بالکل ''حور'' دکھائی دے رہی ہے۔ سب لوگ لڑکے کی قسمت پر رشک کر رہے ہیں۔

Scanned by CamScanner

آسیہ تو آج بہت خوش ہے جبکہ افشاں کی بے چینی اور اس کے اندر کا کرب اسے شدت سے تنگ کر رہا ہے۔

آسیہ بخیر و عافیت رخصت ہو گئی۔ آج افشاں اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ اس سے ہر بات کرنے والی آسیہ اب اپنی نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہے جبکہ افشاں جانے کیا کیا سوچ رہی ہے۔

اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اس کے سر کے نیچے رکھے تکیے کو بھگو رہی ہیں۔ یہ نجانے آسیہ کے جانے کا غم ہے یا پھر اس سمندر کا پانی ہے جو اس کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

Scanned by CamScanner

رشید امجد

بگل والا

یہ کہانی مجھے اس نے سنائی جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں لیکن اسے اصرار ہے کہ اس کہانی سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک عام آدمی ہے اور ایک عام سی جگہ پر مجھے اچانک ہی مل گیا تھا۔ شاید اچانک نہیں کہ میں اس کا منتظر تھا اور اس سے یہ کہانی سننا چاہتا تھا۔

کہانی کا زمانہ بیسویں صدی کی پہلی، دوسری، تیسری یا کوئی بھی دہائی ہو سکتی ہے۔ انیسویں صدی بھی ہو سکتی ہے اور شاید اکیسویں صدی بھی۔ بہر حال زمانے سے کیا فرق پڑتا ہے، جگہ بھی کوئی سی ہو سکتی ہے۔ یہاں وہاں، کہیں بھی، لیکن نہیں یہ کہانی وہاں کی نہیں یہیں کی ہے۔ کرداروں کے نام بھی ا، ب، ج کچھ بھی ہو سکتے ہیں کہ نام تو شناخت کی نشانی ہیں اور ہماری کوئی شناخت ہے ہی نہیں تو پھر نام ہوئے بھی تو کیا، نہ ہوئے تو کیا۔

ایک چھوٹی سی چھاؤنی میں کہ اس وقت چھاؤنیاں چھوٹی ہی ہوتی تھیں، آج کی طرح پورے کا پورا شہر چھاؤنی نہیں ہوتا تھا، تو اس چھوٹی سی چھاؤنی میں ایک بگل چی رہتا تھا، اس کے بگل پر چھاؤنی جاگتی تھی، صبح سویرے گہری نیند سوتے فوجی بگل کی آواز پر چونک کر اٹھتے، جلدی جلدی کپڑے پہنتے اور نیم غنودتے، قطاروں میں آ کر کھڑے ہو جاتے، بگل کی لے اور اس کے اتار چڑھاؤ پر ڈرل شروع ہوتی۔ سپاہی سے افسر تک سب اس بگل کی آواز پر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہوتے اور جب تک بگل بجتا رہتا، ان کی بھاگ دوڑ بھی جاری رہتی۔ بگل بجاتے ہوئے، بگل والے کی آنکھوں میں تفاخر کی ایک شان ہوتی، اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کے بگل کی آواز پر پوری

Scanned by CamScanner

پلٹون ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے اور وہ اکثر اپنی بیوی سے بھی اس کا ذکر کرتا۔

''بھلی مانس، میرا بگل نہ بجے تو پوری پلٹون سوئی رہ جائے۔''

بیوی بے نیازی سے شانے ہلاتی تو وہ کہتا، ''جھوٹ نہیں ہوتا، سپاہی کی تو کیا حیثیت ہے، بڑا افسر تک میرے بگل کے تابع ہے۔ پھر خود ہی اس کا سر بلند ہو جاتا ''میں کوئی معمولی چیز نہیں۔''

وہ اپنے بگل کو تھپتھپاتا ''پوری پلٹن کیا، ساری چھاؤنی اس کی ماتحت ہے۔''

اب بیوی کی آنکھوں میں خاوند کے لیے ایک سرشاری کی نمی سی آ جاتی ـــــ واقعی وہ سچ ہی کہتا ہوگا اور اسے بگل والے کی بیوی ہونے پر ایک فخر کا سا احساس ہوتا۔

بگل والا کبھی کبھی اپنے دوستوں سے بھی کہتا ''یہ بگل نہیں اس کی آواز میں ایک جادو ہے اور اس کا جادوگر میں ہوں۔''

اس کا سینہ پھول جاتا ـــــ ''اس کی آواز پر تو کمانڈنٹ بھی اپنے بستر کی گرمی چھوڑ کر گراؤنڈ میں آ جاتا ہے۔''

چھاؤنی میں چھوٹی موٹی پارٹیاں ہوتی ہی رہتی تھیں جس میں میاں بیوی دونوں کو دعوت دی جاتی۔ افسروں کی پارٹیوں میں تو عام سپاہیوں کو شرکت کی اجازت نہ تھی لیکن سال میں دو ایک بار بڑے دربار منعقد ہوتے جس میں سب کو دعوت دی جاتی۔ بگل والے کی بیوی کبھی کسی پارٹی میں نہ گئی، اسے احساس تھا کہ وہ ایک عام سپاہی کی بیوی ہے لیکن اب ایک عرصے سے بگل والے نے اپنی اہمیت کے ایسے ایسے قصے سنائے تھے کہ وہ اس بار بڑے دربار میں شریک ہونے پر تیار ہو گئی۔ بگل والے نے کہا: ''بھلی مانس کوئی اچھا جوڑا پہننا، تم کوئی معمولی عورت نہیں، بگل والے کی بیوی ہو جس کے بگل کی آواز پر کمانڈنٹ بھی اٹینشن ہو جاتا ہے۔''

شادی کے ابتدائی دنوں کا ایک جوڑا ایسا تھا جسے وہ ایک بار ہی پہن گیا تھا۔

Scanned by CamScanner

کہیں جانے کا موقع ہی کب ملتا تھا۔ بیوی نے جوڑا نکالا، اسے کئی رخوں سے دیکھا، خوب جی لگا کر استری کیا، پہنا تو اس کی چھب ڈھب ہی بدل گئی۔ بگل والا خود دم بخود رہ گیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی بیوی بہت خوب صورت اور بڑی پروقار ہے۔ اسے اکثر افسروں کی بیویوں کو دیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

''ایک افسر کی بیوی بھی ایسی نہیں۔'' اس نے سوچا۔

''اس کے تو پاؤں کی خاک بھی نہیں۔'' اور اسے یک دم ایک فخر کا احساس ہوا۔ ''اور میں بھی تو بگل والا ہوں جس کے بگل کی آواز پر پوری پلٹن اٹینشن ہو جاتی ہے۔

بیوی غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

''اچھا نہیں لگ رہا؟''

''اچھا — بھلی مانس، اتنا اچھا کہ بڑے سے بڑے افسر کی بیگم بھی تمہارے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔'' وہ لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا، ''تم اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہو، پروقار۔''

بیوی کے چہرے پر شفق کے کئی رنگ ابھرے۔

اسے ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اگر یہ کسی افسر کی بیوی ہوتی اور اس طرح لش پش پارٹی میں آتی تو سارے اس کے گرد ہو جاتے اور طرح طرح سے اس کی تعریفیں کرتے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو پرے پھینک دیا...... ''ٹھیک ہے، میں سپاہی سہی لیکن معمولی سپاہی نہیں بگل بردار ہوں، میرے بگل پر تو کمانڈنٹ بھی سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔'' اسے ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ اس نے بیوی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی...... ''ٹھیک، بالکل ٹھیک، فٹ۔''

پنڈال میں عورتوں اور مردوں کے راستے الگ الگ تھے۔ وہ پہلی بار اس طرح کی کسی محفل میں آئی تھی، اس لیے گھبرائی سی تھی۔ الگ الگ راستے دیکھ کر بولی، ''

Scanned by CamScanner

تم اور میں الگ الگ ہوں گے۔''

''تو اس میں کیا ہے؟ تمھارے ساتھ اور عورتیں بھی تو ہوں گی۔'' پھر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ''اور تم کوئی معمولی عورت تو نہیں، بگل بردار کی بیوی ہو، جس کے بگل پر...''

اس نے باقی بات نہیں سنی اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ ابھی بہت کم لوگ آئے تھے۔ کرسیاں تقریباً خالی تھیں۔ وہ سب سے اگلی قطار میں جا بیٹھی جہاں صوفے لگائے گئے تھے۔ تین چار لوگ جو انتظام پر مقرر تھے، اسے اگلے صوفے پر بیٹھتے دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نے اشارے سے دوسرے سے پوچھا، ''یہ کون ہے؟'' دوسرے نے نفی میں سر ہلایا۔ کچھ دیر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک نے آگے بڑھ کر بڑے مؤدب انداز سے پوچھا، ''آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟''

''یہیں سے۔'' اس نے اپنے انداز میں جواب دیا۔

اس کے لہجے سے پوچھنے والے کا مؤدب انداز یک دم بدل گیا۔ اس نے قدرے روکھے انداز میں پوچھا، ''آپ کی تعریف۔''

''تعریف''، اسے سمجھ نہ آیا کہ تعریف کے کیا معنی ہیں۔

پوچھنے والے کا رہا سہا مؤدب انداز ختم ہو گیا۔ اب کے اس نے سرد لہجے میں پوچھا، ''آپ کس کی مسز ہیں؟''

مسز کے معنی اسے معلوم تھے۔ اس نے کہا، ''بگل وار۔''

اس نے اپنی طرف سے بگل وار پر بہت زور دیا تھا لیکن سننے والا ذرا متاثر نہ ہوا بلکہ اس کے چہرے پر ایک کرختگی آ گئی، ''آپ پیچھے آ جائیں ... یہ کمانڈنٹ صاحب کی بیگم اور ان کے مہمانوں کی نشستیں ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے اسے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے یا کیا کرے، پھر جیسے کوئی مشین حرکت کرتی ہے، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پچھلی قطار میں جا بیٹھی۔ تھوڑی دیر میں بیگمات کی

آمد شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے سے سلام دعا کرتی وہ کرسیوں پر بیٹھنے لگیں۔ آدھی سے زیادہ کرسیاں بھر گئیں۔ اتنے میں ڈپٹی کمانڈنٹ کی بیگم اندر آئی۔ انتظام کرنے والے ان کی طرف دوڑے گئے۔ جھک جھک کر آداب بجا لائے اور ان کے لیے نشست تلاش کرنے لگے۔ گھومتی نظریں اس پر آن ٹکیں۔ وہی شخص جس نے اسے صوفے سے اٹھایا تھا، پاس آیا اور بولا۔ "یہاں ڈپٹی صاحب کی بیگم بیٹھیں گی، آپ پیچھے چلی جائیں۔" اسے لگا جیسے کسی نے اسے تالاب میں غوطہ دے کر باہر نکال لیا ہے۔ کچھ کہے بغیر پسینہ پونچھتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ آدھی سے زیادہ قطاریں بھر گئی تھیں۔ وہ ایک خالی قطار کے کونے میں جا بیٹھی۔ فنکشن شروع ہونے میں ابھی دیر تھی اور مہمان آ رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے یہ قطار بھی بھر گئی۔ اس سے پچھلی دو قطاروں میں بھی خواتین بیٹھ گئیں۔ اب صرف آخری قطار خالی رہ گئی۔ اتنے میں کوارٹر ماسٹر کی بیوی اندر آئی۔ عہدے کے اعتبار سے تو اس کا خاوند نائب صوبے دار تھا لیکن راشن اور دوسری چیزوں کے لیے سب کو کوارٹر ماسٹر کی خوشامد کرنا پڑتی تھی۔ اسے دیکھ کر انتظامیہ کے سارے لوگ اس کی طرف بڑھے اور ساتھ ہی اس کے لیے نشست کی تلاش شروع ہو گئی۔ ایک بار پھر اسے اپنی جگہ سے اٹھایا گیا۔ اب صرف آخری قطار تھی۔ وہ پسینوں پسین شرم سے گردن گردن زمین میں ڈوبی اپنی جگہ سے اٹھی اور آخری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ساری خواتین مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہی ہیں اور ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کر رہی ہیں۔

بگل بردار ...... بگل بردار ...... بگل بردار، جیسے آواز سیٹیاں بجاتی اس کے کانوں میں بگل بجا رہی تھی۔ اسے بالکل معلوم نہ ہوا کہ کب فنکشن شروع ہوا، کب ختم ہوا۔ چائے کب پی گئی اور کب لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں، یوں لگ رہا تھا، کسی نے اس کی آنکھوں کو پتھرا دیا ہے اور ٹانگیں پتھر کی سلیں بن گئی ہیں۔

بہت دیر ہو گئی اور وہ باہر نہ نکلی تو بگل بردار اسے تلاش کرتا اندر آ گیا۔ وہ

طرح چپ اپنی کرسی پر بیٹھی تھی جیسے کسی نے اسے اور کرسی کو ایک ہی پتھر سے تراشا ہے۔

''بھاگوان اب چلے گئے اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔''

وہ کچھ نہ بولی، دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

''خیر تو ہے نا — تم ٹھیک تو ہو نا؟'' بگل بردار گھبرا گیا۔

''کچھ نہیں'' وہ تیزی سے اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ آگے آگے اور بگل بردار پیچھے پیچھے۔ راستے بھر اس نے کوئی بات نہ کی لیکن گھر کی دہلیز پار کرتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اتنی تذلیل — اتنی تذلیل۔''

بگل بردار کے بار بار پوچھنے پر وہ ہچکیوں کے درمیان بس اتنا ہی کہہ پاتی —

''اتنی تذلیل۔''

''آخر ہوا کیا؟'' اب بگل بردار کو غصہ آنے لگا۔ ''کچھ کہو بھی تو۔'' معلوم نہیں کیسے توڑ توڑ کر، وقفوں وقفوں سے اس نے ساری بات سنائی۔ بگل بردار چپ ہو گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ چھت پر چلا گیا اور منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ بس ایک چپ تھی جو اس کے اردگرد سرسرا رہی تھی۔ منڈیر پر کہنیاں ٹکائے وہ چھاؤنی کی طرف دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، پھر اچانک اس کے جی میں جانے کیا خیال آیا کہ وہ تیزی سے مڑا، نیچے آیا۔ بیوی کپڑے بدلے بغیر چارپائی پر لیٹ گئی تھی۔ سوتے میں بھی لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے ہیں۔ وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے دیوار سے بگل اٹھایا اور تقریباً دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔

چھاؤنی کا سارا علاقہ سنسان تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اس چبوترے پر چڑھ گیا جہاں کھڑے ہو کر روز صبح بگل بجایا کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوئی ہوئی بیرکوں اور بنگلوں کو دیکھا اور پوری توانائی سے بگل بجانے لگا۔

کچھ ہی دیر میں ساری چھاؤنی میں ہلچل مچ گئی۔ بیرکوں میں سوئے ہوئے سپاہی

ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھڑیوں پر نظر ڈالی۔ ایک دوسرے کو دیکھا۔ بگل کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ جوان افسر سب پتلونیں چڑھاتے، تسمے کستے پریڈ میدان کی طرف بھاگے چلے آرہے تھے۔ کمانڈنٹ، ڈپٹی کمانڈنٹ سب آگے پیچھے۔ ایک دوسرے سے پوچھتے "کیا ہوا —— اس وقت کیوں؟"

قطاریں بن گئیں۔ بگل مسلسل بج رہا تھا۔ چھوٹے افسر نے بڑے سے، بڑے نے اپنے بڑے سے، ڈپٹی نے کمانڈنٹ سے پوچھا، "سر یہ ایمرجنسی کیسی —— ؟"

کمانڈنٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ بگل تھا کہ مسلسل بج رہا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ سینہ دھونکنی بن گیا تھا لیکن بگل —— جب کمانڈنٹ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے بگل چھینا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، بے جا رہے تھے، پچھ کہے بغیر وہ چبوترے سے اترا اور روتے روتے دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔

❀❀❀

مترجم: عابدہ حنیف

عمر سیف الدین

اَنمٹ خواہش

لامحدود افق کے مالک بحیرۂ روم کے کنارے، خوبصورت پھولوں کی وادی کی سج بجی ہوئی تھی۔ بادام کے درخت کی ٹہنی اور بھی شاخیں ساحل کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر اپنے نقوش بکھیر رہی تھیں۔ ساحل سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے پرندے موسم بہار کا لطف اٹھاتے ہوئے پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے اس موسم سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ بادام کے درختوں کے جھنڈ کے ساتھ انگوروں کا باغ تھا۔ سفید پتھروں سے بنی ہوئی چھوٹی سی فصیل کی دوسرے طرف زیتون کے درخت تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے۔ باغ کے درمیان بغیر دروازے کی جھونپڑی سے ایک مفلوک الحال بوڑھا باہر نکلا۔ داڑھی اور مونچھ برف کی مانند سفید تھی۔ جسم کو اکڑایا جیسے کمر کے خم کو ٹھیک کرنا چاہتا ہو۔ ضعیف العمری کی وجہ سے سارا جسم کانپ رہا تھا۔ آسمان کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے کہا ''انشاءاللہ'' سب ٹھیک ہے''۔

بوڑھے نے دیوار کے کنارے پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر پر اپنے آپ کو ڈھیر کرتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لے لیا۔ پھٹی پرانی بوری سے اس نے اپنا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ ننگے پاؤں مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ سوکھا ہوا بازو، سورج کی حدت سے تانبے کی رنگت اختیار کر چکا تھا۔ بوڑھے نے وہاں بیٹھے ہوئے حد نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو غور سے دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ ہر روز اس بوڑھے کا معمول تھا کہ وہ سمندری جہازوں اور ان کے سائرن کی آوازیں سننے کے لیے اپنی آنکھیں سمندر پر گاڑ دیتا تھا۔

اپنے جہازوں کی آمد کا انتظار کرنے والا یہ ایک بوڑھا ایک ترک تھا۔ اسے

Scanned by CamScanner

قیدی بنے ہوئے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جب وہ تیس سال کا گریل اور قوی جوان تھا تو وہ مالٹا کے قزاقوں کے ہاتھوں اسیر بنا۔ تیس سال تک ایک ملاح کی حیثیت سے ان کی کشتیاں کھیتا رہا۔ بقیہ تیس سال تک وہ جہاز کے نچلے والے حصے میں بیڑیاں پہنے پڑا رہا۔ تیس سال کی اذیت ناک قید کی گرمیاں، سردیاں، طوفان اور بارشیں اس کے مضبوط و قوی وجود کو نہ پگھلا سکیں۔ نمی کی وجہ سے زنجیریں زنگ آلود ہو کر ٹوٹ گئیں۔ قزاق اس طویل عرصہ قید میں کئی دفعہ نئی بیڑیاں پہناتے رہے لیکن اس کے لوہے سے بھی مضبوط بدن کو گزند نہ پہنچا سکے۔ اس کو صرف وضو نہ کرنے کا دکھ تھا۔ وہ ہمیشہ قبلہ رخ ہو کر قزاقوں سے چوری چھپے پانچ وقت کی نماز ادا کرتا تھا۔ جب اس کی زندگی کی پچاس بہاریں بام عروج کو پہنچیں اور اس میں کام کرنے کی سکت باقی نہ رہی تو قزاقوں نے اسے ناکارہ سمجھتے ہوئے جزیرے کے ایک بڑے کاشتکار کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ کاشتکار دس سال تک سوکھی روٹی کے عوض کام لیتا رہا۔ وہ بڑے صبر و شکر سے حکم بجا لاتا تھا۔ کیونکہ اب وہ بیڑیوں کی قید سے آزاد تھا۔ آزادانہ وضو کر کے خدا کے حضور سجدہ شکر بجا لا سکتا تھا اور خدا تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر اپنی واپسی کے لیے دعا کرتا تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش اپنے شہر واپسی تھی۔ ان سالوں میں ایک مرتبہ بھی امید کی کرن ماند نہ پڑی تھی۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتا تھا بلکہ اسے کامل یقین تھا کہ وہ ایک دن ضرور اپنی مقدس مٹی کے بوسے لے گا، بے شک یہ دوسرے جنم میں ہی ممکن کیوں نہ ہو۔

یہ بوڑھا اپنے زمانے کا مشہور جہاز ران تھا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے آبنائے فاسفورس کو عبور کیا۔ مہینوں تک اکیلا جہاز چلاتا رہا۔ دشمنوں کے کئی چھوٹے جہازوں کو تباہ کر چکا تھا۔ اس کی بہادری کی کہانیاں ہر زبان پر تھیں۔ بادشاہ نے خاص طور پر اسے دربار میں بلا کر اسے انعام و اکرام سے نوازا کیونکہ وہ حضرت خضر علیہ السلام کے دیار کی زیارت کر چکا تھا۔ وہ ایسے ایسے سمندروں کی سیر کر چکا تھا۔ جہاں پہاڑ کے برابر گلیشیر پائے جاتے تھے۔ وہ جگہیں ہماری دنیا سے قطعی مختلف تھیں۔ وہاں چھ مہینے رات

Scanned by CamScanner

اور چھ مہینے دن ہوتا تھا۔ اس نے قطب شمالی کی ایک لڑکی کو اپنی شریک حیات بنانا چاہا۔ ہیرے جواہرات اور قیدیوں سے لدے ہوئے جہاز میں وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے اور اسی جہاز میں اس کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اب اس کے بیٹے کی عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ ہوگی، کیا خبر۔ وہ دونوں زندہ ہیں یا نہیں؟ چالیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ استنبول کی مسجدوں کے میناروں کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ اگر مجھے جہاز ملے تو میں اسے قباتاش کی بندرگاہ پر لنگر انداز کروں۔

جب اس نے عمر کی چودہائیاں پوری کیں تو کاشتکار نے اسے آزاد کر دیا۔ کہنے کو تو یہ آزادی تھی لیکن اس نے دنیا میں بھوک پیاس اور فاقے کرنے کو آزاد کیا تھا۔ اس بوڑھے قیدی کو اس ویران باغ میں سر چھپانے کے لیے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی مل گئی۔ کبھی کبھار وہ قصبے کا رخ کرتا۔ اس کی حالت پر رحم کھانے والے اسے روٹی دے دیتے۔ وہ اسی طرح دس سال مزید پیٹ کا دوزخ بھرتا رہا۔ اب اس میں کچھ کرنے کی سکت بالکل نہ تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس کی خوابوں میں وطن واپسی کا عنصر موجود تھا۔ اس کی امید کا محور، ترک جہازوں کی آمد اور اس کی وطن واپسی پر گھومتا تھا۔ اسی آس پر وہ زندگی کی ناؤ بہائے لے جا رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں کو اچھی طرح رگڑا، سمندر اور آسمان کو ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے افق پہ نگاہ جمائی۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ سال ہا سال سے متواتر دیکھا جانے والا یہ خواب ایک روز ضرور حقیقت کا روپ دھارے گا۔

بوڑھے نے جھونپڑی کی دیوار کے سائے میں لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ موسم بہار کی چمکتی صبح اس کے روحانی عقیدے کو زیادہ روشنی دے رہی تھی۔ بوڑھے کو پرندوں کی چہچہاہٹ ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے سب مل کر یک زبان ہو کر کہہ رہے ہوں۔ ''وہ آ رہے ہیں۔ وہ آ رہے ہیں'' جھونپڑی کے پتھروں میں بسیرا کرنے والی چھپکلیاں اس کے جسم پر رینگ رہی تھیں۔ کبھی اس کے پرانے بوری لباس میں گھس جاتی اور کبھی اس کی گرد آلود

Scanned by CamScanner

داڑھی میں گدگدی کرتی رہتیں۔ بوڑھا خواب میں ترک بحری بیڑے کو دیکھ رہا تھا جو بہ
آہستہ ساحل سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاز سے ترک فوجی سرخ پرچم کے سائے تلے
اتر رہے تھے۔ سورج کی کرنیں پرچم کی شان کو دوبالا کر رہی تھیں۔

اچانک بوڑھا میرے بچے، میرے ترک کہتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اٹھنے کی وجہ
سے اس کے جسم پر کھیلنے والی چھپکلیاں بھاگ کر پتھروں میں چھپ گئیں۔ بوڑھے نے
ساحل سمندر پر نظر دوڑائی۔ ساحل سمندر پر ترک بحری بیڑہ لنگر انداز ہو رہا تھا۔ بوڑھے
کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آنکھیں پھاڑ کر دوبارہ دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین
نہیں آ رہا تھا اسے شک گزرا کہ شاید ابھی تک وہ عالم خواب میں ہے۔ جاگنے کا ثبوت
حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹا۔ زمین سے ایک
نوکیلا پتھر اٹھا کر اپنی پیشانی پر مارا۔

ہاں! وہ درد کی شدت محسوس کر رہا تھا۔ ہاں ہاں! وہ جاگ رہا تھا۔ عالم
بیداری میں تھا۔ خوشی اور مسرت کی وجہ سے اس کے جڑے ہوئے ٹخنوں میں جان آ گئی۔
بحری فوج ہاتھوں میں سرخ پرچم تھامے قلعہ کی رخ پیش قدمی کر رہی تھی۔ بوڑھے نے انتظار
کے والہانہ جذبے سے پگڈنڈی سے بھاگنا شروع کیا۔ فوجیوں نے بوڑھے کی اپنی طرف
بھاگتے ہوئے دیکھا تو چلائے۔

"رکو" لیکن بوڑھے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بالکل نہ رکا۔ بلکہ اونچی آواز میں
چلایا۔

"میرے بچو! میں ترک ہوں، ہاں میں ترک ہوں۔"

بوڑھا فوجیوں کے قریب پہنچ کر فرط جذبات سے انہیں چومنے لگا۔ اس کی
آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں جاری تھیں۔ یہ جذباتی منظر دیکھ کر فوجیوں کی آنکھیں بھر
آئیں۔ انھوں نے جذباتی انداز میں بوڑھے سے پوچھا،

"تم کتنے سال سے یہاں قید ہو۔"

Scanned by CamScanner

''چالیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے''۔ بوڑھے نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دے دیا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''ایدریت'' خوشی کے مارے اس کی زبان پورے الفاظ ادا کرنے سے قاصر تھی۔

''نام کیا ہے؟ ایک اور سپاہی نے سوال کیا۔''

''کھارامبش''۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

''کیا تم کپتان تھے؟'' سپاہی نے انٹرویو کی شکل میں سوال کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔

بوڑھے کے اقرار کو سن کر سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرانگی سے دیکھا اور فوراً اسے کپتان کے حضور پیش کرنے کے لیے بازوؤں پر اٹھا لیا اور پرندے کی سی تیزی سے ساحل سمندر کے کنارے کھڑی کشتی میں بٹھا کر جہاز پر لے گئے۔ سپاہیوں نے اس کی شہرت سن رکھی تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے درمیان اپنے آپ کو پا کر بوڑھا خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ سپاہیوں نے اس کا لباس تبدیل کروایا۔ سر پر ٹوپی پہنائی اور کپتان کے حضور پیش کیا۔

کپتان ایک کڑیل جوان تھا۔ اس نے زرہ بکتر پہن رکھی تھی۔ اس نے بوڑھے کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

''کیا تم کپتان کھارامبش ہو''؟

''بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔''

''کیا تم وہی ہو، جو حضرت خضر علیہ السلام کے دیار میں گئے تھے؟''

''ہاں میں وہی ہوں''

"قمیض کا دایاں بازو اوپر کرو"۔ کپتان نے کہا۔

بوڑھے نے قمیض کا دایاں بازو اوپر کر کے بازو کپتان کی طرف بڑھایا۔ اس کی کہنی کے نزدیک چاند کی شکل کا ایک زخم تھا۔ یہ زخم قطب شمالی کا تحفہ تھا۔ جب وہ اپنی بیوی کو اغوا کر کے لا رہا تھا۔ کپتان نے زخم پر نگاہ پڑتے ہی بوڑھے کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا، اور اسے فرط جذبات سے چومتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا بیٹا ہوں"۔

"کیا تم ترگت ہو؟"

"بوڑھے نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے پوچھا"۔

"ہاں! میں تمہارا بیٹا ترگت ہوں"۔ کپتان نے خوشی سے جواب دیا۔

بوڑھا خوشی سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا گیا۔ ہوش میں آنے پر بیٹے نے باپ سے کہا:

"میں خشکی پر جنگ کرنے جا رہا ہوں۔ آپ جہاز میں ٹھہریں۔ اگر زندگی ہوئی تو دوبارہ دونوں مل کر وطن لوٹیں گے"۔

لیکن بہادر بوڑھے نے بیٹے کی اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں بھی تمہارے ساتھ جنگ پر جاؤں گا"۔

لیکن ابا حضور۔ آپ بہت کمزور اور بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کیسے سفر ——— بیٹے نے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا دل ابھی جوان اور طاقتور ہے، میرے حوصلے بلند ہیں"۔ بوڑھے نے بیٹے کی بات کو درمیان میں سے اچک کر دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپ یہاں آرام کریں اور ہماری فتح کے لیے دعا کریں"۔ بیٹے نے دوبارہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

"چالیس سال سے میرے دل میں حسرت موجود ہے کہ وطن جاؤں اور اس کی

خاطر جان کی بازی لگا دوں''۔ بوڑھے نے جوش سے کہا۔

''اگر خدانخواستہ آپ جنگ میں شہید ہو گئے تو وطن کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی''۔ بیٹے نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

کھارابمش چیتے کی سی پھرتی سے اٹھا۔ تلوار اور زرہ بکتر مانگی اور جہاز پر لہرانے والے پرچم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اگر میں شہید ہو گیا تو یہ پرچم میرے جسم پر لپیٹ دینا، کیا سرخ پرچم اپنے وطن کی ترجمانی نہیں کرتا''۔

طرفہ بن العبد البکری / اکرام جمالی

قصیدہ دالیہ

نشانِ خولہ کے گھر کے،
ثہمد کے سنگ زاروں میں
(دور ہی سے) چمک رہے تھے!
اور اس کے آثار
اجڑی بستی کے کھنڈروں میں تھے یوں نمایاں
کہ جیسے چمکیں
پسِ کفِ دست
(سُرمئی) نقش گودنے کے!

سواریاں میرے ہم نشینوں نے
روک رکھیں تھیں میری خاطر
وہ مجھ سے کہتے تھے
''غم کے مارے ہلاک مت ہو!''
''تحمل اچھا ہے، ضبط کرلو!!''

قبیلہ مالک کا قافلہ
کوچ کر رہا تھا جو صبح دم تو
کجاوے اونٹوں کے دد کی وادی میں

Scanned by CamScanner

اس طرح سے دکھائی دیتے تھے
جیسے موجِ رواں پہ بہتے ہوئے سفینے،
بڑے بڑے (بادبانوں والے)!
وہ امن یا من کے (شاہکار ہنر)
شکارے ہوں، یا عدو ولی کی (ساختہ)
کشتیوں (کے بیڑے)
جنہیں کھوئے (گھما پھرا کر)
چلائیں رفتار کج سے گاہے
تو سینوں سے موجِ دریا کو ایسے چیریں
کہ جیسے مٹی کے ڈھیر کو
دستِ کودکِ خاکباز
(تیزی سے کاٹتا ہو)
(مساوی) حصوں میں بانٹتا ہو!

قبیلے میں اک غزالہ (بھی) ہے
کہ جس کے ہونٹوں کے قرمزی رنگ میں
سیاہی (گھلی ہوئی) ہے
(ادا سے) پیلو (کی ٹہنیوں) کو
(ہلا ہلا کر) وہ جھاڑتی ہے!
شجر سے (برگ و) ثمر زمیں پر اتارتی ہے!!
چمک رہی ہے گلے میں اس کے
زمردیں اک حسین مالا

Scanned by CamScanner

جو دوہری لڑیوں سے موتیوں کے
بجی ہوئی ہے!
(جدا ہوئی ہے وہ اپنی سکھیوں سے)
جیسے گلّے سے بچھڑی ہرنی
جو مرغزاروں میں
نیل گایوں کے ساتھ چرتی پھرے
تو لگتا ہے
جیسے اطراف میں درختوں کے
(سبز) پتوں کی اوٹ لے کر
(حیا سے) گھونگھٹ نکالتی ہے!

(وہ اپنے محبوب کی جدائی میں
غم سے بے کل ہے)
چلتے چلتے
جو یوں اچانک
وہ رک کے،
پیچھے کو
چپکے چپکے سے
جھانکتی ہے!!

توصیف تبسم

مسافرت تھی کسی دشتِ بے خیالی کی
تمہاری یاد نے یک بارگی نہالی کی

کلی کے ساتھ گرہ دل کی وا ہوئی شاید
ہوا جو سنکی، طبیعت نے کچھ بحالی کی

چمن فدا جو ہوا اس کے سرو قامت پر
تو ایک بار، زرِ گل سے جیب خالی کی

ادا ادا میں وہی خود سپردگی کی جھلک
اور آنکھ میں وہی وحشت رمِ غزالی کی

وہ آفتاب جوانی غروب ہو بھی چکا
کھنچی ہوئی ہے ابھی تک لکیر لالی کی

ہوا سے خاک پہ لیتا ہے کروٹیں پتّا
وہی ہوں میں، وہی صورت شکستہ بالی کی

بھلا یہ دھیان کسے تھا کہ ہم ستارہ نشیں
کریں گے سیر کسی عالمِ سفالی کی

Scanned by CamScanner

پرتو روہیلہ

اک جبر کہ رستوں سے گزرنے نہیں دیتا
مرضی سے کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتا

ہم زخمیِ پیکار طلب ایسے ہوئے ہیں
اب زخمۂ جاں آہ بھی بھرنے نہیں دیتا

اک سیل تحرک ہے کہ طاری ہے جہاں پر
اک نشۂ ہستی ہے کہ مرنے نہیں دیتا

وابستہ ہوں میں جذب سماوات سے ایسا
گرلاکھ بھی چاہوں تو بکھرنے نہیں دیتا

ہے مائل افلاک مرا رفرفِ رفتار
وہ ارض مقدس پہ اترنے نہیں دیتا

اب راغبِ پرواز ہے مجنوں کہ سرِ دشت
پندار جنوں پاؤں بھی دھرنے نہیں دیتا

ہر موجۂ امکاں میں فشار ایسا ہے پرتوؔ
جو سطحِ سمندر سے ابھرنے نہیں دیتا

❀❀❀

Scanned by CamScanner

افتخار عارف

کوئی سبب ہے جو تاریک شب ہوئی ہے میاں
کسی کی شہ پہ ہوا بے ادب ہوئی ہے میاں

اس اہتمام سے اہلِ نظر کی رسوائی
ہوئی نہ تھی کبھی پہلے جو اب ہوئی ہے میاں

عجب نہیں در و دیوار شہر پر بھی ہو نقش
یہ گفتگو جو ابھی زیرِ لب ہوئی ہے میاں

بساطِ خواب الٹنے کی بات، آخری بات
ہم اٹھ کے آئے ہیں محفل سے، تب ہوئی ہے میاں

نشان و خلعت و منصب کا ذکر کیا کہ یہاں
بکارِ عشق بھی عرضِ طلب ہوئی ہے میاں

ہم اپنے دل ہی کی آزردگی نہ کم کر پائے
یہ خلق ہم سے خفا بے سبب ہوئی ہے میاں

Scanned by CamScanner

افتخار عارف

تار شبنم کی طرح، صورت خس ٹوٹتی ہے
آس بندھنے نہیں پاتی ہے کہ بس ٹوٹتی ہے

آرزوؤں کا ہجوم اور یہ ڈھلتی ہوئی عمر
سانس اکھڑتی ہے نہ زنجیر ہوس ٹوٹتی ہے

گرد اتنی کہ سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
شور اتنا ہے کہ آواز جرس ٹوٹتی ہے

بوئے گل آئے نہ آئے مگر عشاق کے بیچ
اتنی وحشت ہے کہ دیوار قفس ٹوٹتی ہے

ذکر اسمائے الٰہی کا ہے فیضان کہ اب
دم الجھتا ہے نہ تسبیح نفس ٹوٹتی ہے

Scanned by CamScanner

جلیل عالی

نئے امکاں جگائے، اک ایسی راہ نکلے
کہیں گردِ گماں سے شبیہِ ماہ نکلے

تمہارے فقر کے تو بڑے چرچے تھے، تم بھی
سگِ دنیا ہی ٹھہرے حریصِ جاہ نکلے

کھلا کب فلسفوں سے چمن زارِ تعلق
کھرے دل ہی جہاں میں محبت گاہ نکلے

جنھوں نے غم کشوں کو بغاوت پر ابھارا
وہ صف آرائیوں میں حلیفِ شاہ نکلے

شکست و فتح سے ہم بہت آگے نکل کر
کسی پر جاں لٹانے سرِ جنگاہ نکلے

جنھیں دعوے بہت تھے جہاں بینی کے عالیؔ
خود اپنے آپ سے بھی وہ کم آگاہ نکلے

Scanned by CamScanner

اکبر حمیدی

اگرچہ دھیان اِدھر سے اُدھر پھراتا رہا
یقین ذات پہ اُس کی مجھے ہمیشہ رہا

ملے ہیں مجھ کو بھی روتے بسورتے لمحے
مگر میں دیکھ کے ان کو بھی مسکراتا رہا

کبھی نہ دیکھا موافق ہے یا مخالف ہے
ہوا چلی تو میں کچھ اور لہلہاتا رہا

وہ کھلکھلاتا ہوا روشنی بھرا چہرہ
میں جس کی آب سے آنکھوں کو جگمگاتا رہا

تمہارے ساتھ گزارا ہوا ہر اک موسم
حسین خواب کی مانند یاد آتا رہا

ہمیشہ تھام لیا اس کا دامن عصمت
کبھی کبھی جو قدم میرا ڈگمگاتا رہا

یہ آرزو تھی کہ اس پر تجھے بٹھاؤں گا
میں اپنے ذہن میں اک آسماں بناتا رہا

ہوا خزاں کی نہ اکبر پہنچ سکی مجھ تک
خزاں میں بھی میں کسی پھول بن میں بیٹھا رہا

❀❀❀

Scanned by CamScanner

خالد اقبال یاسر

اور اب سوچتا ہوں کہ ایسا نہ ہوتا
میں پہلی نظر ہی میں شیدا نہ ہوتا
ورائے یقین اور شک سے معزّی
وہ پوشیدہ رہتا ہویدا، نہ ہوتا
مری روح کو جسم دینے سے پہلے
اگر پوچھتا وہ، تو پیدا نہ ہوتا
لہو کی جو ترکیب ایسی نہ ہوتی
لہو کی روانی میں تیرا نہ ہوتا
کہیں اور جا جھولتیں لالیاں بھی
گھر آنگن میں پیپل، سفیدا نہ ہوتا
مری صبح اتنی فسوں گر نہ ہوتی
پپیہا اگر نغمہ پیرا نہ ہوتا
صدا میں صدا کوئی میٹھی سی گھلتی
لب و لہجہ یاسرؔ کسیلا نہ ہوتا

❀❀❀

علی اکبر عباس

غبارِ نور ہے یا کہکشاں ہے یا کچھ اور
یہ میرے چاروں طرف آسماں ہے یا کچھ اور

جو دیکھا عرش تصور سے بارہا سوچا
یہ کائنات بھی عکسِ رواں ہے یا کچھ اور

میں کھوئے جاتا ہوں تنہائیوں کی وسعت میں
درِ خیال درِ لامکاں ہے یا کچھ اور

فراقِ عمر کی حد کیوں لگائی ہے اس نے
مرا وجود ہی اس کو گراں ہے یا کچھ اور

ازل سے تا بہ ابد جست ایک ساعت کی
یہی بس عرصۂ کارِ جہاں ہے یا کچھ اور

❀❀❀

Scanned by CamScanner

خاور نقوی

کبھی زمین کبھی آسماں میں تیرتا ہوں
طلسمِ نور کے اک اک نشاں میں تیرتا ہوں

برنگِ ساز کبھی بربطوں سے پھوٹتا ہوں
کبھی بشکلِ صدا ارمغاں میں تیرتا ہوں

کبھی میں ڈھلتا ہوں کاغذ پہ نقش کی صورت
میں لفظ بن کے کسی کی زباں میں تیرتا ہوں

کبھی کبھی تو مجھے بھی خبر نہیں ہوتی
کہ کس مقام پہ کس کس جہاں میں تیرتا ہوں

مرے سفر میں کوئی اجنبی سا رہتا ہے
محیطِ شعر کے جب امتحاں میں تیرتا ہوں

Scanned by CamScanner

سرور کامران

مدام خود میں رواں سلسبیلِ وقت ہوں میں
میں اپنے گرد کھچا ہوں، فصیلِ وقت ہوں میں

صدی صدی میں چلے چاپ میرے قدموں کی
مجھے سنو کہ صدائے رحیلِ وقت ہوں میں

کسی بھی راہ سے گزرو مجھی کو پاؤ گے
ہر ایک رہ پہ کھڑا سنگِ میلِ وقت ہوں میں

مجھے سمجھ لو تو ہر شے کا راز کھولے گی
میں اپنے عہد کا چہرہ، دلیلِ وقت ہوں میں

مجھی سے دیکھ لو سارے جہان اَن دیکھے
کہ پیشِ وقت ہوں، عکسِ جمیلِ وقت ہوں میں

مجھے پڑھو کہ میں آیاتِ وقت ہوں سرورؔ
مجھے ملو کہ دمِ جبرئیلِ وقت ہوں میں

Scanned by CamScanner

آفتاب ثاقب

الفت کا ترجماں ہوں ذرا دیکھ تو سہی
میں زیبِ داستاں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

بجتی ہوئی رگوں میں جوانی کی آگ ہوں
میں حسنِ دلبراں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

ڈوبوں تو دوسروں کے لیے ساحلِ مراد
ابھروں تو آسماں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

ہر چند ایک راز ہوں قدرت کے کھیل کا
ہر رنگ میں عیاں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

رکھتا ہوں اپنے آپ میں سربستہ کائنات
میں اپنا خود جہاں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

ارض و سما ہیں گرچہ احاطہ کیے ہوئے
میں بحرِ بے کراں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

محفل کا ہر حسین ہے میری لپیٹ میں
میں گردِ کارواں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

Scanned by CamScanner

کون و مکاں میں کیسے سما جائیں وسعتیں
میں عشق لامکاں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

حسنِ ازل بھی ہے مری الفت میں بے قرار
میں رونقِ جہاں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

میں کون ہوں کہاں ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں
سوئے فلک رواں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

خلوت میں آسماں سے بھی آگے مرا مقام
میں خاکِ ناتواں ہوں ذرا دیکھ تو سہی

Scanned by CamScanner

آفتاب ثاقب

آنکھوں سے بے حساب پلاتا ہے آج کل
مے خانہ ساقی مفت لٹاتا ہے آج کل

دنیا ہے میکدے کی دوانی بنی ہوئی
ہر روز ابر جھوم کے آتا ہے آج کل

بے ساختہ نظر سے ملاتا ہے وہ نظر
تارے مجھے وہ دن میں دکھاتا ہے آج کل

انجان بن کے رستے میں کرتا ہے گفتگو
گھر کی مرے وہ راہ بھلاتا ہے آج کل

رکھتا ہے سارا جسم چھپا کر نقاب میں
آنکھیں فقط وہ مجھ کو دکھاتا ہے آج کل

دیتا ہے ساتھ مے کے تبسم کی چاشنی
ہوش و حواس میرے اڑاتا ہے آج کل

پھرتا ہے ساتھ اپنے قیامت لیے ہوئے
محشر شباب یار اٹھاتا ہے آج کل

Scanned by CamScanner

اختر عثمان

ضبط کا مرحلہ اظہار تک آ پہنچا ہے
کوئی روتا ہوا بازار تک آ پہنچا ہے

گریۂ نیم شبی اب نشنیدن کے سبب
خندۂ صبح کے آثار تک آ پہنچا ہے

حلقہ در حلقہ بڑھی جاتی تھی کوتہ قدی
سلسلہ قافلہ سالار تک آ پہنچا ہے

ایک آنسو جو رکا تھا بر مشکیزۂ چشم
آخرِ کار وہ رخسار تک آ پہنچا ہے

ایک خوشبو کا پتہ پوچھتا اختر عثمان
خوش نصیبی سے چمن زار تک آ پہنچا ہے

Scanned by CamScanner

اختر شاد

بہ روئے بت و عدم سیل نور آیا ہے
یہ کون برزن برزخ پہ مسکرایا ہے

مجھے خوشی ہے کہ میری انا کے ملبے سے
بساط عصر پہ تو نے محل اٹھایا ہے

کریہہ جسم تھا میرا، قبیح چہرہ تھا
کسی نے توڑ کے پھر سے مجھے بنایا ہے

میں ہر کسی کو تمہارے خلاف کر دوں گا
ہنر یہ تم نے مری جان مجھے سکھایا ہے

تمہارے حکم پہ تم سے بچھڑ کے جی لوں گا
کہ اس سے قبل بھی میں نے یہ دکھ نبھایا ہے

❀❀❀

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر ملک سکندر حیات خیال

کھائی اتنی ٹھوکریں ہیں دربدر کی
اب تمنا ہی نہیں ہے اپنے گھر کی

سہہ چکے ہیں اس قدر ظلم و ستم ہم
کٹتا ہے کٹ جائے اب کیا فکر سر کی

دنیا نے کچھ ایسی بے دردی سے لوٹا
کوئی شے نہ رہ گئی زادِ سفر کی

یاد ہم بھی کیا کریں گے آئے تھے یاں
خیالؔ رہزن شکل میں ہیں راہبر کی

❁❁❁

Scanned by CamScanner

کرنل سید مقبول حسین

شہر کچھ ایسے پرایا ہوا لگتا ہے مجھے
ہر کوئی دور سے آیا ہوا لگتا ہے مجھے

جو بھی اُڑتا ہے پریشاں سا نظر آتا ہے
پیڑ میں جال چھپایا ہوا لگتا ہے مجھے

پوچھنا چاہتے ہو اس کا بدن کیسا ہے
دودھ میں شہد ملایا ہوا لگتا ہے مجھے

کیوں ہر اک شخص سے دشمن کا گلہ کرتے ہو
وہ تو یاروں کا ستایا ہوا لگتا ہے مجھے

دھوپ میں دھندلے نظر آتے ہیں چلتے ہوئے لوگ
آنکھ پہ ابر سا چھایا ہوا لگتا ہے مجھے

لوگ اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں ہوا میں مقبولؔ
ریت پہ شہر بسایا ہوا لگتا ہے مجھے

Scanned by CamScanner

ارشد ملک

یہ وقفۂ بہار جو اب کے برس میں ہے
اک ذائقہ عجیب سا اس رنگ رس میں ہے

ٹانکوں ستارہ کون سا بالوں میں تیرے بول
امشب کا آسمان مری دسترس میں ہے

تم آسمان والے سے کر لو معاملہ
میں کر رہا ہوں آج بھی جو میرے بس میں ہے

اب میرے ارتکاز میں لیتی ہے لہریے
رنگین تھرتھری جو ترے پیش و پس میں ہے

مانا ترے نگر میں نہیں دھوپ کا گزر
پر یہ جو اطمینان مجھے خاک و خس میں ہے

Scanned by CamScanner

نور فاطمہ نور

اس قدر کیں جذبۂ الفت کی پردہ پوشیاں
ڈس رہی ہیں آج خود مجھکو مری خاموشیاں

کون سے صحرا کے کانٹے بچھ گئے ہیں راہ میں
کون سی منزل پہ آ کر لٹ گئیں گل پوشیاں

کیا ہوا وہ سوزِ فرقت اور سرورِ انتظار
دل سے تیری یاد کی دن رات ہم آغوشیاں

ہر اک آہٹ پہ تیرے آنے کا ہوتا تھا گماں
خاک میں سب مل گئی ہیں وہ ہمہ تن گوشیاں

پھیکی پھیکی ہو گئی ہے اب تری تحریر بھی
رنجشِ پیہم نے تیری چھین لیں مے نوشیاں

بد گمانی کی ہوا سے گل نہ ہو شمعِ وفا
ذہن و دل میں ہو رہی ہیں آج یہ سرگوشیاں

عمر بھر کا غم بنی ہے نورؔ وہ پل کی خوشی
ہوش کے عالم میں بھی چھانے لگی بے ہوشیاں

Scanned by CamScanner

اشرف سلیم

مکان دیکھے تھے کچھ خواب میں بکھرتے ہوئے
سفر پہ اس لیے نکلا نہیں میں ڈرتے ہوئے

پروں میں یاد رکھی اور چل پڑا تھا میں
پھر آفتاب بھی دیکھا نہیں ابھرتے ہوئے

مرا وجود بکھرتا گیا مگر اس نے !!
نظر اٹھا کے نہ دیکھا مجھے گزرتے ہوئے

مرے خلاف زمانے کی سازشیں تھیں بہت
سو لوٹ آیا میں دشمن سے جنگ کرتے ہوئے

کبھی ملی ہی نہیں فرصت غم دوراں
وگرنہ دیکھتا میں بھی تجھے سنورتے ہوئے

شب فراق نہ جانے خیال کیا آیا
جو رو پڑا تھا سلیم اس کو یاد کرتے ہوئے

Scanned by CamScanner

میجر غلام نبی اعوان

خشتِ عہدِ بے وفا میں بے نوا ہو جائے گا
آنکھ استنبول، سینہ قرطبہ ہو جائے گا

رات لمبی ہے تو باہم گفتگو کرتے رہو
بات چل نکلی تو بہتوں کا بھلا ہو جائے گا

ان بجری گلیوں میں پھرتا رہ، اسی میں خیر ہے
اپنے اندر جا چھپا تو لاپتہ ہو جائے گا

سر بریدہ لفظ مجھ سے رات یہ کہنے لگے
اب نہ بولو گے تو کاغذ کربلا ہو جائے گا

جب سرِ عہدِ وفا صدیاں جھنجھوڑی جائیں گی
وقت کی زنجیر سے لمحہ رہا ہو جائے گا

وہ میری آواز کا قاتل بھی ہے مقتول بھی
میرا اس کا آج کل میں فیصلہ ہو جائے گا

پھر خدائی کا کیا دعویٰ کسی فرعون نے
پھر سرِ دربار کوئی معجزہ ہو جائے گا

❀❀❀

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر نجمہ خان

سائے اب شام سے بھی گہرے ہیں
ہر طرف روشنی پہ پہرے ہیں

دور تک گونجتا ہے سناٹا
شاید آواز پر بھی پہرے ہیں

نہیں امید کوئی روپہلی
اور نہ خواب ہی سنہرے ہیں

نہیں منزل ہماری یہ نجمہ
ہم یہاں سانس لینے ٹھہرے ہیں

❀❀❀

Scanned by CamScanner

محمد ادریس چیمہ

آج تمہاری سوچ کا دھارا کیسا ہے
تم نے اپنا آپ سنوارا کیسا ہے!

تم تو خوشبو بن کے چلتے پھرتے تھے
اب یہ گوشہ اور کنارا کیسا ہے!

گر تم بول سکو تو بولو کیسے ہو!
واں پہ تیرا یار گزارا کیسا ہے؟

شہر میں تیرے اک ادریسؔ بھی رہتا تھا
ہاں بتلاؤ وہ بچارا کیسا ہے؟

❁❁❁

Scanned by CamScanner

محمد افضال بٹ

بس اک میری بات نہیں تھی سب کا درد دسمبر تھا
برف کے شہر میں رہنے والا ہر اک فرد دسمبر تھا

پچھلے سال کے آخر میں بھی حیرت میں ہم تینوں تھے
اک میں تھا اک تیرا غم تھا اک بے درد دسمبر تھا

اب میں تجھے بتاؤں کیسے اس میں کتنی شدت تھی
یخ بستہ تھے میرے آنسو اتنا سرد دسمبر تھا

اپنی اپنی قسمت تھی اور اپنی اپنی ہمت تھی
ہاتھ کسی کے نیلے تھے اور پیلا زرد دسمبر تھا

پھولوں پر تھا سکتہ طاری خوشبو بھی سہمی سہمی
خوف زدہ تھا گلشن سارا دہشت گرد دسمبر تھا

یہ جو تیری آنکھ میں پانی، تیری بات میں سردی ہے
اتنا مجھے افضالؔ بتاؤ کیا ہمدرد دسمبر تھا

Scanned by CamScanner

جاوید اقبال راجا

اندھیاروں کی بات الگ ہے، اندھیاروں میں سائے بہت
ہم نے روشن چاند کو دیکھا چاند پہ دھبے پائے بہت

کتنے چہروں پر لکھی تھیں تیرے نام کی تحریریں
زخمی زخمی چہروں والے ، آخر کو پچھتائے بہت

انسانوں کی بستی میں تم ، انسانوں کو مت ڈھونڈو
شہر میں ہم نے گھوم کے دیکھا انساں کم تھے سائے بہت

رات ہے کالی ، بادل گہرے ، آس کا جگنو چمکے نہ
تیرگی تو کچھ اور بڑھی ہے ، تم نے دیپ جلائے بہت

ہم نے جن کی قدر نہ جانی ، جن کو رہبر مانا نہ
ڈوب گئی جب اپنی نیّا ، یاد ہمیں وہ آئے بہت

صحرا صحرا آگ لگی ہے دریا دریا تشنہ لبی
دھرتی ترسے بوند نہ برسے بادل گھر کر آئے بہت

Scanned by CamScanner

عابد سیال

کہا گیا، ہیں زمان و مکان میرے لیے
ہُوا نہ ان میں کوئی سائبان میرے لیے

میں دستِ خار کی خواہش جھنگ نہ پاؤں ادھر
رکا ہوا ہے اُدھر کاروان میرے لیے

ترا ہوں میں سو تیرے پاس لوٹ آؤں گا
تو دشت دشت کی مٹی نہ چھان میرے لیے

وہی پرانی کہانی، میں جس کی قید میں ہوں
اسی پری کی تڑپتی ہے جان میرے لیے

جگہ کچھ اور بھی عابدؔ برائے سیر و سفر
بہت نہیں ہے یہی اک جہان میرے لیے

Scanned by CamScanner

سجاد حیدر ملک

جمیل ملک ۔ فن اور شخصیت

کتاب کا ٹائیٹل دیکھا ۔ سارے نام اپنے ۔ مانوس اور زندگی کا حصہ ۔ اور کتاب کے اندر جھانک کر دیکھا تو دوستوں کا ہجوم نظر آیا ۔ کتاب کا موضوع جمیل ملک ، میرے کرم فرما اور مصنف اعجاز راہی ، جس کے ساتھ زندگی کے کچھ اہم اور کچھ صبر کے لمحات گذرے ہیں ۔ کچھ ایسی یادیں ہیں جو کبھی نہیں فراموش کی جاسکتیں ۔ پچیس برس پہلے جب میرے بڑے بھائی صاحب کا انتقال مسقط میں ہوا تو اعجاز راہی نے ان کی میت کی وصولی سے لے کر ہمارے گھر تک لانے کا فریضہ انجام دیا اور جب پی آئی اے والوں نے اسے ملازمت سے نکالا تو ایسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے مصائب کو ایک چیلنج سمجھ کر زندگی کے سامنے سینہ سپر ہو گیا ہے ۔ اس کا قلم تلوار بن گیا ۔ ترجمے ، ناول ، تحقیق ، دست شناسی اور خطاطی نجانے کون کون سا موضوع جس پہ اس نے قلم نہ اٹھایا ۔ اور اپنی روزی کا سامان پیدا کیا ۔ اپنے علم میں اضافہ کیا اور اسی جدوجہد کے زمانے میں وہ ایک بار میرے ہاں آیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا ۔

تھوڑی دیر بعد کہنے لگا ۔ رات چوری ہوگئی .... چور بیٹی کا جہیز لے گئے ہیں ۔ ہمارے مشترکہ دوست احمد داؤد کے جنازے کو کندھا دینے والا ، اعجاز راہی ، اب میرے سامنے ایک اور حیثیت بن کر آن کھڑا ہوا جب ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''جمیل ملک ' فن و شخصیت '' کے نام کی کتاب میرے حوالے کی ۔ اس کے مصنف ہیں ڈاکٹر اعجاز راہی ۔ ایوب مرزا صاحب کو کسی ایسی کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جس میں ان کی تحسین نہ ہو اور جناب فیض سے ان کے تعلق کا ذکر نہ ہو ۔

لیکن کتاب کیا ہے ... دوستوں کے ... کی ایک جھلک ہے جس میں کچھ ہیں

چھوڑ کر چلے گئے، کچھ موجود ہیں لیکن اس تذکرے میں وہ ایک جگہ میں موجود ہیں اور ان سب کا موضوع جمیل ملک ہیں۔ احمد شمیم، احمد ظفر، سید عبداللہ، فیض احمد فیض، جناب وی کی، احسان دانش، مظہر الاسلام اور رشید امجد۔ ایک قافلہ جو تقسیم ہند کے وقت ایک نئی صبح کی تلاش میں نکلا تھا، جو داغ کو روشن اور منور کرنا چاہتا تھا۔ جنھیں ترقی پسندی کی تحریک نے راہ سجھائی۔ ایک مشکل راہ جسے وہ انسان دوستی کے سہارے طے کرنا چاہتے تھے جو ممکن بھی تھا۔ پاکستان کے پہلے دس سال ایک خصوصی سماجی مطالعے کے مستحق ہیں۔ ایک طرف سیاسی انتشار تو دوسری طرف ترک شدہ جائداروں کی لوٹ مار اور پرانے کاروباروں کو از سرِ نو چلانے کی جدوجہد۔ تمام اصول بالائے طاق رکھے گئے تھے اور نئے نام کے نئے ملک کی بنیاد انتہائی ناقابلِ یقین تضادات پر رکھی جا رہی تھی۔ افراتفری اور خود غرضی کی بنیادوں پر ایک کردار اور مزاج تشکیل پا رہا تھا جو آگے جا کر خاص طور پر ہماری اشرافیہ کا وطیرہ بننے والا تھا۔

اپنی کتاب کے صفحہ 58 پر اعجاز راہی فرماتے ہیں:

> "1985ء تک پہنچتے پہنچتے جمیل ملک نے اس طویل جدوجہد کو جو انہوں نے بچپن کو جوانی کرتے کرتے کی تھی اور جوانی میں اس تحریک کو ایک عبوری انجام ہوتے بھی دیکھا .... وہ جس تحریک سے وابستہ تھے وہ 1954ء میں پابندیوں کی نذر ہو کر ختم ہو گئی"۔

یہ صورت حال ایسی ہے جس میں انیس سو تیس کی دہائی کے آگے اور پیچھے کے لوگوں میں مشترک ہے۔ اشتراکیت کا دور دورہ تھا تو دوسری طرف مودودی صاحب کی کتابوں کا ایک سیل جو لوگوں کو بہائے لے جا رہا تھا۔ تو جوانوں نے ان دو کیمپوں میں اپنے لیے جگہیں بنانے کی سعی کی اور ان کی اس سعی نے ان کی تخلیقی قوتوں کو متاثر کیا۔ ان کی شاعری کو ایک جہت دی اور پھر یہ سب کچھ پچاس کی دہائی میں ختم ہو گیا۔ جمیل ملک کے

Scanned by CamScanner

سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباسات خود جمیل ملک کی زبانی اس دور کی ترجمانی میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

"مخالفین اکثر انجمن ترقی پسند تحریک پر الزام لگاتے کہ اس کے پس منظر میں کمیونسٹ پارٹی کام کرتی ہے اور یہ الزام غلط نہیں تھا۔ پالیسیاں کمیونسٹ پارٹی ہی بناتی تھی۔ اس بات کا مجھے بہت بعد میں علم ہوا۔ تاہم اس انجمن میں معروف کمیونسٹ آ چکے تھے۔ عبداللہ ملک، صفدر میر، سجاد ظہیر، تو پارٹی کے ہول ٹائمر تھے۔ اگرچہ یہ ادیب بھی تھے، مگر اس بنیاد پر کسی ادبی انجمن کی تشکیل ہی غلط اقدام تھی۔ سجاد ظہیر کو ہندوستان سے امپورٹ کیا گیا۔ قید ہوا اور چھوٹتے ہی ہندوستان چلا گیا۔ اس بات نے مجھے شک میں ڈال دیا کہ شاید پارٹی پرو پاکستانی نہیں، یا انہوں نے پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا۔ یہ بات میرے لیے قابل قبول نہ تھی چنانچہ اس بنیاد پر میں نے خود کو پارٹی اور انجمن کی تمام سرگرمیوں سے الگ کر لیا کہ پاکستان میرے لیے سب کچھ تھا۔ اول بھی اور آخر بھی۔ میں دادا امیر حیدر اور عابد حسن منٹو جیسے لوگوں کے سبب دیر تک رہا تھا، کہ یہ لوگ مجھے بھگوڑا نہ کہیں ورنہ بہت پہلے میں اسے چھوڑ دیتا"۔

کمیونسٹ پارٹی چھوڑنے کا اعلان جمیل ملک کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

"میں نے 1958ء سے قبل کمیونسٹ پارٹی چھوڑ دی تھی اس کا ایک ہی سبب ہے کہ مجھے ہمہ رنگی تو پسند ہے، دو رنگی بھی میری زندگی کا حصہ نہیں بن سکی۔ اقبال، قائد، رومی، حافظ، بلھے شاہ، سلطان باہو اور دیگر مشاہیر کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیبی

Scanned by CamScanner

قدریں، قومی جدوجہد کی روایت، اعتماد اور عزم سے میرا تعلق
بچپن سے ہے اور میں انہیں انسان دوستی اور انسانی فلاح کے
حوالے سے ہی دیکھتا اور اس میں کبھی ڈگمگایا نہیں۔ ترقی پسند
تحریکوں میں میری نسبت میں بھی یہی حوالہ معتبر تھا۔ چنانچہ میں
آج بھی ترقی پسند سوچ کو اپنا سرمایہ حیات جانتا ہوں اور اس
سے کنارہ کشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تاہم فطرتاً پاکستانی ہوں۔
اقبال اور پاکستانیت میرا مضبوط حوالہ ہیں۔ جس کے خلاف
کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اقبال کے ساتھ پاکستان کا وجود ہے اور
پاکستان کے ساتھ میرا''۔

ان اقتباسات کو یہاں نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ محض ایک نوجوان کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ اس دور کے گرمجوش اور فعال نوجوانوں کی داستان ہے۔ یوں تو ہر ایک فرد کی اپنے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی داستان الگ ہو سکتی ہے لیکن اس میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کا تجربہ مشترک تھا جو کہ ایک پوری جنریشن کی داستان پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ پارٹیوں میں کام میں لوگوں کی عملی فعالیت ختم ہو گئی۔ محض ایک تعلق سا باقی رہ گیا۔ اسی لیے پارٹیاں ختم ہو جاتی ہیں نظریے زندہ رہتے ہیں اور تخلیقی عوامل کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جمیل ملک کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ 1958ء تک ان کا ایک شعری مجموعہ ''سروچراغاں'' شائع ہو چکا تھا۔ شادی کی بات چل رہی تھی اور اے سی بی سرسید سکول میں ملازمت مل گئی تھی اور زندگی ایک سیدھے سبھاؤ چل رہی تھی۔ اگلے سال تسنیم اختر ملک سے شادی کے بعد زندگی میں ایک ٹھہراؤ اور نارمل صورت حال پیدا ہو گئی اور جمیل ملک کی تمام تر توجہ تخلیقی کام کی طرف اور تدریس کی جانب ہو گئی۔

شاعری کے ساتھ جمیل ملک کے لگاؤ کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس نے 1961ء میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا اور اگلے

Scanned by CamScanner

سال دوسرا شعری مجموعہ ''طلوع فردا'' شائع کروایا۔ اس کے بعد دوستوں اور رشتہ داروں کی موت کے علاوہ جمیل ملک کی زندگی میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں ہے۔ سارا جوش اور سارا اولا قومی زندگی کے المناک واقعات اور راہبروں کی حماقتیں اور سربراہوں کی مطلق العنانیت بھی کچھ اشعار کی صورت میں عیاں ہوتا رہا اور جن میں چھ مجموعے غزل کے ہیں، چار مجموعے نظموں کے، ایک گیتوں والی کتاب اور تین کتابوں میں پنجابی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ دو کتابیں ہائیکو کا مجموعہ ہیں اور گیتوں کے مجموعے کا نام ''جھروکے'' ہے اور نثر میں دو کتابیں ہیں جن میں ندیم کی شاعری ان کی فن شخصیت اور مضامین پر مشتمل کتاب کا نام ہے۔ ادبی منظر نامے۔

اعجاز راہی نے ہر صنف سخن کے لیے الگ الگ باب تحریر کئے ہیں اور اپنی بات کو وسعت دینے کی خاطر ہر صنف کے پس منظر میں جا کر جمیل ملک کے فن کا احاطہ کیا ہے اور چونکہ غزل کو انہوں نے جمیل ملک کی خاص چیز کہا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جمیل ملک نے غزل کو وہاں سے پکڑا جہاں اسے غالب نے چھوڑا تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے تو کہی جا سکتی ہے کہ غالب نے جس انداز میں غزل کو دانشوری کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ ہر آنے والے شاعر، غزل گو نے ویسا ہی کیا کہ اب غزل سے عورتوں سے باتیں کرنے یا دربار کی لونڈی والا کام نہیں لیا جا سکتا لیکن ایک ہی سانس میں ایسے دو شاعروں کا تذکرہ زیادتی ہے جن میں ایک نے انتخاب کی دھار پر اپنے ہزاروں اشعار قربان کر دیے ہوں اور ادھر جمیل ملک ہیں جنہوں نے اپنی طویل غزلوں میں انتخاب بالکل کچھ نہیں کیا۔ اور سارے کے سارے اشعار اپنے مجموعوں میں شامل کر دیے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اچھے اشعار بھی کم اثر اور معمولی اشعار کی بھیڑ میں گم ہو گئے ہیں۔ حیرت ہے کہ اعجاز راہی اس معاملے کی جانب توجہ نہیں دلائی لیکن یہ معاملہ اب کسی ایسے شخص کے ہاتھوں ہی طے پا سکتا ہے جو ایسے انتخاب کا بیڑہ اٹھائے اور جس کی ژرف نگاہی اور ذوق شعر کسی بھی اندیشے سے بالاتر ہوں۔

Scanned by CamScanner

ایسی ہی صورت حال تین سو سے زائد نظموں ہے۔ ان میں ایک تجریدی عنصر موجود ہے جس میں قادر الکلامی تو ہے لیکن رچاؤ اور نرماہٹ کم ہے جس کا ہمیں فیض نے عادی کر دیا ہے۔ اس کے باوجود ایک کہنہ مشق شاعر کے قلم سے ''زرد بے درد موسم'' کی نظم میں درج ذیل رواں دواں مصرع وارد ہوتے ہیں تو حیرت نہیں ہوتی۔

کون بھولے پرندوں کو جا کر بتائے
کہ جب تک زمین کو
لہو اور پسینے کی سوغات ملتی نہیں
کوئی بھی فصل تیار ہوتی نہیں
پھول کھلتے نہیں
ابر اٹھتا نہیں، مینہ برستا نہیں
زخم بھرتے نہیں
قافلے رنگ و بو کے اترتے نہیں
زرد بے درد موسم گزرتے نہیں

اسی طرح گیتوں میں بھی نظم کا رنگ نمایاں جھلکتا ہے۔

کس کس دکھ پر ہم نہیں روئے، اپنا دل نہیں دھڑکا
زخموں سے چھلنی ہے سینہ کتنے زخم سہیں گے
کتنی دیر جئیں گے

اسی لہجہ اور مشتاقی کی گونج نعت کے اشعار میں سنائی دیتی ہے۔

لوگ کہتے نہیں تیری جان مجھے
اپنی آواز سے پہچان مجھے
تجھ کو پایا تو جہاں کو پایا
نہ رہا کوئی بھی

ہو گیا ذات کا عرفان مجھے

جہاں تک معاملہ ہائیکو کا ہے۔ اس میں اعتراض کی گنجائش کوئی نہیں۔ اگر ہمارے ہاں دوہے تو جاپان میں ہائیکو ہے۔ ہمارے شعراء کا جوق در جوق ہائیکو کی جانب جانا سمجھ میں آتا ہے کہ اگر مقابلتاً مشکل تر صنف غزل میں عمر گزار سکتے ہیں تو ہائیکو ان کے لیے کوئی بڑی مشکل نہیں پیش کرتی۔ جمیل ملک نے ہائیکو میں تبدیلی کی۔ اس کے اصل مزاج کو تبدیل کیا۔ مصرعوں کو 5-7-5 ارکان برابر کر کے اپنے لیے سہولت پیدا کی اور پانچ سو سے زائد ہائیکو پر مشتمل ایک مجموعہ ہائیکو کا شائع کر دیا۔

ایک ہائیکو ملاحظہ ہو۔

زندگی سے نہ بے سبب الجھو
جس سے یہ انتقام لیتی ہے
اس کی صورت بگاڑ دیتی ہے

جمیل ملک نے جب سے زندگی سے نہ الجھنے کی قسم کھائی تو وہ اپنی ملازمت، اپنی گھریلو زندگی کا ہو کر رہ گیا۔ اور ریٹائرمنٹ کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ زندگی وضع احتیاط سے عبارت رہی اور دوستوں کو شکوہ رہا کہ کہیں کوئی نعرۂ مستانہ، کبھی کوئی جرأت رندانہ۔ کہیں کوئی اختلاف، کہیں کوئی ہنگامہ، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے بے شمار مضامین میں لوگوں کی تعریف و تحسین۔ یوں بھی اردو میں تنقید کم اور تحسین زیادہ کا رواج ہے اور شاید ادبیات پاکستان کا "پاکستانی ادب کے معمار" کا سلسلہ بھی اسی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

مجھے ایک اور عرض یہاں کرنا ہے، کہ زیر کتاب دراصل ایک خراج تحسین کے طور پر تحریر کی گئی۔ جس میں تمام اصناف سخن کی ابتدا میں ایک پس منظر کی غرض سے ایک تاریخی جائزہ بھی لیا گیا ہے اور اس کے بعد ایک خالی فریم ورک میں جمیل ملک کے تخلیقی کام کو رکھا گیا ہے۔ ایک ایسے ہی فریم ورک میں سے کتاب کا موضوعاتی دھارا تشکیل ہوتا ہے وہ ہے نظریاتی شاعری اور اس زاویے سے اگر دیکھا جائے تو پوری بیسویں صدی

Scanned by CamScanner

ایک نظریاتی شاعری کی صدی بن جاتی ہے اس کی ابتدا حالی اور اقبال سے ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان دو عظیم شخصیتوں کے پہلو میں خالص غزلیہ شاعری کو کوئی مؤثر جگہ نہیں ملی۔ اس لیے ان دونوں کے سامنے داغ سے لے کر جگر، حسرت، مجاز، اختر شیرانی، ناصر کاظمی اور احمد فراز کا مقام متعین نہیں ہونا چاہے اپنے اشعار سے اپنے انگوٹھوں پر لہو لگا کر شہید کہلانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں۔

اقبال کے بعد ایک نظریاتی شعراء کا گروہ سامنے آیا۔ اس میں جوش، فیض، ساحر، جاں نثار اختر، مخدوم، کیفی اعظمی اور حبیب جالب بھی شامل ہیں۔ اس سیاق وسباق میں اعجاز راہی نے تمام کتاب کے اندر جمیل ملک کو نظریاتی شاعر ہوانے کی پوری کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ وجودی فلسفہ کے دیئے ہوئے الفاظ مثلاً commitment کا ذکر کیا ہے اور اس کتاب کا مرکزی مسئلہ بھی یہی ہے کہ اگر آپ کا ممدوح ہتھیار پھینک کر اور باقاعدہ شریفانہ زندگی گزارنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے تو آپ اسے بار بار نظریہ کی خوابگاہ میں گھسانا چاہتے ہیں تو یہ بات نہیں بنے گی اور یہی اس کتاب کا مسئلہ ہے۔

Scanned by CamScanner

خواجہ غلام ربانی مجال

چراغ حسن حسرت 'احوال و آثار'

ادارہ یادگار غالب کراچی نے ''چراغ حسن حسرت۔ احوال و آثار'' نامی کتاب شائع کی ہے جو پروفیسر طیب منیر صاحب کا وہ مقالہ ہے جس پر انہیں بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔

۵۰ کی دہائی سے آج روز تک اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں، طلباء، والدین، اساتذہ اور حکومت سبھی کی توجہات کا ترجیحی مرکز پیشہ ورانہ تعلیم ہی رہی ہے جس کی وجہ سے زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں کی جانب سے صرف نظر کیا گیا۔ اب ان شعبوں کے ماہرین تو گجا عام سی شُد بُد سے ذرا آگے کی آگاہی رکھنے والے لوگ کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

ایسے حالات میں یہ کتاب کسی کے زیر مطالعہ آ جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس مٹی میں ابھی کچھ لعل ضرور ہیں جنہیں حالات کا گرد و غبار اور عدم توجہی رول تو رہی ہے مگر انہوں نے ابھی تک اپنی قدر و قیمت یکسر نہیں کھودی۔

ڈاکٹر منیر طیب صاحب نے جس لگن، محنت اور محبت سے اس اہم مقالے کے لیے درجہ اول کا اس قدر وافر مواد کھوج کھاج کر ڈھونڈ نکالا ہے اور اس سلیقہ اور ہنر سے مرتب کیا ہے کہ یہ مقالہ بعد میں آنے والوں کے لیے نشانات منزل کا کام دے سکتا ہے۔

۸۰/۸۵ برس قبل کے کلکتہ میں جناب حسرت کے قیام اور روزمرہ مصروفیات سے متعلق مواد کی فراہمی جبکہ پاکستان اور ہندوستان کے بین المملکی تعلقات کی روز افزوں پیچیدگیاں' ہر رائی برابر مشکل کو بآسانی ایک سد سکندری میں تبدیل کرتی ہی چلی آتی رہی ہیں' کوئی ایسا آسان کام نہ تھا۔ ابوالکلام آزاد، وحشت کلکتوی،

Scanned by CamScanner

نواب نصیر حسین خیال، مؤید الاسلام جلال الدین طہرانی، نوابزادہ ایف ایم عبدالعلی، پروفیسر محفوظ الحق، پروفیسر عبدالرحیم اور آغا حشر کاشمیری جیسی قدآور اور مستند شخصیات سے میل جول اور سیکھنے سمجھنے اور ان ہستیوں کی توقعات پر پورا اترنے کی تفاصیل تشفی بخش ہیں۔

مولانا حسرت کے قیام سنگاپور کا زمانہ ایک بھرپور عالمی جنگ کا اختتامی زمانہ تھا۔ سنگاپور کے یمین و یسار اور پیش و پشت کبھی تر و خشک گرم محاذات رہے تھے یا ابھی تک تھے۔ ایسے مقام پر اس افراتفری کے دور کی فوجی صحافت کے آثار کے بچ رہنے کے امکانات بایں ہمہ موہوم و معدوم تھے کہ سنگاپور انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل جاپانیوں کے زیر قبضہ رہا تھا اور اس سرزمین اور وہاں کے باسیوں پر کیا کیا قیامتیں نہ گذری تھیں۔ مولانا حسرت جب وہاں پہنچے تو انگریزوں نے قریب کے زمانہ میں ہی اسے دوبارہ فتح کر کے حاصل کیا تھا۔

مولانا حسرت کے اس وقت کے ساتھی جن کے وہ نہ صرف افسر اعلیٰ بلکہ پیر و مرشد بھی تھے۔ اس دور کے حالات کے عینی گواہ تھے۔ پروفیسر طیب منیر صاحب نے اپنا کام شروع کرتے ہی ان کے انٹرویو کر کے بہت سا مواد حاصل کیا اور ان کی سنگاپوری کی زندگی کا اس قدر بھرپور نقشہ احوال میں پیش کیا ہے کہ اگر بر وقت کوششیں نہ کی جاتیں تو اس مواد کے حصول کا کوئی ذریعہ نہ بچتا۔ جنگ زدہ سرزمین کے باسیوں کی زندگیوں میں کیسی کیسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں اور ان کی ذاتی زندگیوں میں کیسے کیسے خلا در آتے ہیں اور چار و ناچار بہ تقاضائے بشریت وہ ان خلاؤں سے کیونکر نبرد آزما ہوتے ہیں، اس کا بھی کچھ کچھ ادراک اس مقالے کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔

گذشتہ تین چار ہفتے یہ کتاب میرے زیر مطالعہ رہی ہے اور مولانا کے احوال اور ان کے متعلقات کے بہت سے پہلوؤں پر میں نے ایک جاں فزا روشنی محسوس کی ہے۔ ان کی شخصیت کو میں نے مجموعی طور پر بڑا دآویز اور دلدار پایا ہے۔ گو مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں اور ان کے انتقال کو قریباً نصف صدی گذر چکی ہے اور سوائے ایک بار

کافی ہاؤس لاہور میں ان کی محض ایک جھلک دیکھنے کے علاوہ بھی ذاتی تعارف کا شرف حاصل نہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ جیسے بے نوا عامیوں کے لیے وہ ساری عمر محنت و مشقت کرتے ہوئے گذر گئے۔

پروفیسر صاحب نے اپنے پسندیدہ موضوع پر تحقیق جس جانفشانی سے کی ہے اور جس قدر درجہ اول کا مواد اور حوالہ جات کھوج نکالے ہیں وہ ان کی اعلیٰ درجہ کی تحقیقی صلاحیتوں اور موضوع سے انصاف کرنے کی دھن کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ حسرت جیسے عالم بے بدل پر کوئی ذرا کم کوش کام کرتا تو بہت سی دھند اور ملبہ صاف ہونے سے رہ جاتا۔

ڈاکٹر صاحب کی کنج کاوی کی بدولت ہم انکے کٹر ہندو خانوادے اور ان کی دنیاوی اور معاشرتی سروری سے متعارف ہوتے ہیں۔ مولانا کے والد گرامی شیخ بدرالدین سابقہ کشمیری چند اپنے پانچ بڑے بھائیوں، والدین اور ان کے اثر و رسوخ کے علی الرغم ۱۵/۱۶ برس کی عمر میں اسلام قبول کر کے مال و منال اور عز و جاہ سے محروم ہو کر اگلے ۱۰/۱۲ برس اسلام کی دینی تعلیم سے خود کو آراستہ کرتے ہیں۔ ابتدائی فارسی تعلیم، جو ان کے دور میں ہندو، مسلم، سکھ سبھی کا معمول تھا، پر جب عربی اور اردو کا رنگ آتا ہے تو شیخ بدرالدین کا فطری داعیہ مزید نکھر اٹھتا ہے اور وہ فارسی اور کشمیری میں شعر کہنے لگتے ہیں۔ ان کی علم دوستی انہیں مسلماناں پونچھ کے لیے ایک چلتا پھرتا گرو اور معلم بنا دیتی ہے۔ سخت محنت و مشقت اور صبر و شکر سے گذرتے ہوئے وہ صرف ۳۸ برس کی عمر میں اپنے مالکِ حقیقی کے حضور بلا لیے جاتے ہیں۔ دو سال بعد حضرت کے نانا حسن علی بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ یوں دس گیارہ برس کے حسرت ایک بھرے پرے بھاری بھر کم خاندان کے سربراہ کی گرانبار ذمہ داریوں کو اٹھانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

والد اور نانا کے انتقالات حسرت میں مستعدی اور جان کاوی کی موجود خصوصیات کو بیدار ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں مزید جلا بخشتے ہیں۔ اپنے والد گرامی کی ... معلم ... اور پھر پونچھ کی تنگنا سے نکلنے کا

فیصلہ کر لیتے ہیں۔

۱۷ برس کی عمر میں وہ شملہ پہنچتے ہیں جو متحدہ ہندوستان کا گرمائی دارالخلافہ ہے یعنی جہاں بڑے سے بڑے آدمی سے ملاقات کے امکانات ہیں۔ وہ وہاں ایک انگریزی اسکول میں اردو اور فارسی کے معلم مقرر ہوتے ہیں۔ وہاں حسرت کا قیام چھ ماہ سے کچھ ہی اوپر رہتا ہے کہ والدہ محترمہ کی وفات انہیں واپس پوچھو آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا مقالہ ہمیں گوشت پوست کے حقیقی انسان سے ملاتا ہے جو برملا اقرار کرتا ہے کہ "ہم جنہیں دو وقت کا کھانا میسر نہیں، جن کے بچوں کو تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں" چھوٹے بہن بھائی ہی اکیلے مذکور بچے ہیں۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم جناب حسرت کے کہیں دائیں بائیں پوچھو سے کلکتہ، وہاں سے لاہور، پھر دلی، سنگاپور، لاہور، کراچی اور واپس لاہور، علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی ماحول میں ایک ایسی بھرپور سیر کرتے ہیں جو صرف انہی کو میسر تھی جو ان کے زمانہ میں رہے ہوں اور زندگی کے ان گوشوں سے ان کا ذاتی تعلق بھی استوار رہا ہو۔ یہ سفر حسرت کی پیدائش سے لے کر سفر آخرت پر روانگی تک کے عرصہ پر محیط ہے۔

جوانی نہیں بلکہ نوجوانی میں ہی جس کا اٹھنا بیٹھنا ابوالکلام آزاد، وحشت کلکتوی، نواب نصیر حسین خیال، موید الاسلام جلال الدین طہرانی، نوابزادہ ایف ایم عبدالعلی، پروفیسر محفوظ الحق، پروفیسر عبدالرحیم اور آغا حشر کاشمیری جیسے نوابغ روزگار اور علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی بزرجمہروں سے رہا ہو اور باوجود کم عمری کے نہ صرف ہم عصری بلکہ ہم مشربی نصیب رہی ہو اس کی اپنی علمی وجاہت اور فطری اہلیت کی گیرائی و گہرائی کا بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے بڑے لوگ صحبت ناجنس سے پرہیز کا کوئی نہ کوئی طریقہ اپنائے رکھنے کا ہنر جاننے والے ہوتے ہیں۔

حسرت سے اگر ان لوگوں کے روابط تھے اور رہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کی توقعات سے کسی طور کم تر نہ تھے۔ اس سب پر مستزاد کہ وہ اعلیٰ پایہ کے

Scanned by CamScanner

نثر نگار، ڈرامہ نگار، منضبط طناز، ادیب اور پر مغز شاعر بھی تھے۔ قیام کلکتہ کے دوران وہ بطور کالم نگار اور ایڈیٹر نہ صرف جانے پہچانے اور مانے جاتے تھے بلکہ ان کا شہرہ لاہور تک آن پہنچا تھا۔ لاہور آنے سے پہلے ہی وہ علم، ادب اور صحافت کے مشہور قلعہ لاہور کو فتح کر چکے تھے۔ وہ لاہور جس کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی کہ:

''لاہور میں متانت ہے، وقار ہے، حلم ہی نہیں علم بھی تو ہے''۔

زندگی کے بارے میں حسرت کا رویہ احوال کے ورق ورق سے آشکار ہے۔ مولانا کی شخصیت یوں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جیسے کسی زور آور فوارے سے پانی کی دھاریں نکل کر آسمان کو چھونا چاہیں۔

''حسرت کلاسیکی ذوق اور روایات کے دل دادہ تھے''۔ ''طبعاً کم آمیز اور سکون پسند آدمی تھے۔ صحبت ناجنس ان پر گراں گذرتی تھی''۔ ''وہ ہر لحاظ سے حریف بذلہ تھے، حریف دشنام نہ تھے''۔ ''خوددار و خودنگر تھے۔ وہ کسی کی گرہ سے بھی کھاتے پیتے نہ تھے''۔ ''وہ ایک قابل مصنف، اعلیٰ درجہ کے شاعر، صاحب طرز مزاح نویس، بلند پایہ صحافی اور زبان اردو کے مستند ادیب تھے''۔ ''مذاہب عالم کی نہایت اچھی واقفیت رکھتے تھے''۔ ''ایک عظیم نابغہ کی حیثیت سے ان کی انا کا جذبہ بڑا قوی تھا''۔ ''وہ الفاظ کی نسلوں سے آشنا تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ فلاں محاورہ کہاں سے آیا۔ فلاں روزمرہ کی اصلیت کیا ہے۔ اس ضرب المثل کی بنیاد کس نے رکھی۔ یہ کہاوت کیوں کر بنی''۔

''وہ تمام عمر محنت و مشقت کی سنگلاخ وادی سے گذرتے رہے'' اور یہ ان کا مقام و مرتبہ ہے کہ حسن عسکری نے ان کے بارے لکھا ہے۔ ''اگر مولانا حسرت نے زبان میں کوئی غلطی کی ہے تو میرے یہاں ان کی غلطی بھی صحیح ہے اور پھر تاریخ کا مطالعہ میرا مولانا سے زیادہ نہیں''۔ مولانا ہم نشینوں میں کس قدر ممتاز تھے کہ بقول سعادت حسن منٹو:

''حسرت اپنی گفتگو سے جلا کر مارتے تھے اور مار کر جلاتے تھے''۔

کبھی ایک وقت تھا جب مولانا حسرت موہانی، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، علامہ

نیاز فتحپوری، ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، عبدالرحمٰن چغتائی، خواجہ حسن نظامی، علامہ تاجور نجیب آبادی، سید عابد علی عابد، امتیاز علی تاج، فیض احمد فیض، حمید نظامی، غلام مرتضٰی خان میکش، ن۔م۔راشد، میراجی، حفیظ جالندھری اور ایسی ہی قد و قامت کی کئی دیگر ہستیاں ہمارے درمیان موجود تھیں۔ اسی کہکشاں کا ایک درخشندہ ستارہ سندباد جہازی اپنے خلوص، سچائی، علم دوستی، جفاکشی، ایثار اور بے غرضی کی شمع روشن کیے ہر کس و ناکس کو فیض پہنچا رہا تھا۔ وہ ممتاز ملک اور ضمیر جعفری کے مرشد تھے۔ ن۔م۔راشد، فیض احمد فیض اور میراجی کا مرجع اصلاح اور احمد ندیم قاسمی کے مربی تھے۔

ڈاکٹر طیب منیر صاحب کی کوششوں کی بدولت ہمارے اجڑتے ہوئے علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی منظر کا جو کچھ بھی یوں محفوظ ہو گیا ہے وہ بالیقین معتبر اور قابل قدر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسرت کے احوال کو ۱۸۳ صفحات میں سمیٹ کر ان کی ہمہ جہت اور دلآویز شخصیت کا اگلے ۵۸ صفحات میں بھرپور شخصی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ جس میں ان کے سراپا، پہناوے، سگریٹ نوشی، خورونوش کے ذوق، کتب بینی سے دلی لگاؤ، مشاعروں میں شرکت اور ان کی شادی وغیرہ کا بڑا دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ پڑھنے والا کسی حد تک ایک چلتا پھرتا، بولتا چالتا حسرت دیکھ پاتا ہے۔

احوال کے بعد آثار کا حصہ بڑا ضخیم ہے۔ اول ان ادبی رسائل کا تعارف و جائزہ ہے جن سے حسرت کسی طور منسلک رہے ہیں۔ چونکہ وہ کئی نسبتوں سے ایک نابغہ ہستی تھے اس لیے مقالہ نگار نے ان کی ہر حیثیت کا الگ الگ ابواب میں احاطہ کیا ہے۔ غزل گو اور نظم نگار دونوں حیثیتوں پر الگ ابواب ہیں۔ اس دور کا سیاسی پس منظر اور جاری موثر ادبی تحاریک کا بھی ساتھ ساتھ واضح نقشہ کھینچا ہے تاکہ حسرت کے کام اور اس کام کے مقام کا تعین ممکن ہو سکے۔

بطور نثر نگار اردو کے اسالیب بالخصوص ادب، صحافت، سیاست، ظرافت کے

فروق کی وضاحت کی گئی ہے۔ روزنامہ صحافت کی تنگنائے اور اس کی کالم نگاری کی محض وقتی اہمیت کے علی الرغم حسرت کی تحریروں کی انفرادی شان اور علمی طنطنہ جو بہر حال قاری کو ایک سامنے کی شے نظر آتا ہے خوب خوب ظاہر ہوتا ہے۔ کالم نگاری میں حسرت کا مقام و مرتبہ منفرد تھا اور قرنوں منفرد ہی رہیگا۔ مختلف نثری مضامین میں بدلتے ہوئے اسالیب کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

حسرت نے بچوں کے لیے نظم اور نثر دونوں میں بڑا وقیع کام کیا تھا جس کی مکمل فہرست کتاب میں موجود ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے موصوف کی تصانیف کے علاوہ شعری تخلیقات، مضامین، لطائف حتی کہ غیر مدون تحریروں کی بھی نشاندہی فرمائی ہے۔

میں ذاتی طور پر مقالہ نگار اور ادارۂ یادگار غالب، کراچی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ مجھے ایک فرد کے احوال و آثار کے بہانے ایک پورے سیاسی و سماجی دور کی بھرپور اور جانفزا سیر کروائی ہے۔

Scanned by CamScanner

میجر (ر) غلام نبی اعوان

کسی حیران ساعت میں

جدید نظم کی وسعتیں نقادوں کی گرفت سے باہر اچھل گئی ہیں۔ یہ فقرہ یا جملہ یقیناً کئی پیشانیوں پر بل پڑنے کا سبب بنے گا۔ کسی بھی موضوع پر نقد و نظر کے لیے چند بنیادی پیمانے، کچھ مبادیات کی ضرورت ہوتی ہے جب ایک ادبی صنف کا پھیلاؤ بے تحاشہ ہو جائے اور اس میں نئی آوازوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ بقول شخصے کان پڑی آواز سنائی نہ دے تو پھر تمیز کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ گذشتہ پچیس تیس برسوں میں نظم کے اندر اس قدر تجربے ہوئے اور ایسی ایسی صوتی و معنوی تشکیلات در آئیں کہ کسی نقاد کے لیے تنقیدی اوزان پر کسی نظم کو پرکھنا ناممکن ہو گیا۔ نظم پر تنقید تو جاری ہے لیکن اس تنقید کا مرکزِ خیال چیستان ہو گیا ہے۔ "اب نظم معریٰ، غیر معریٰ اور نثری نظم کی بات چیت قصۂ پارینہ بن گئی ہے۔ "نظم میں انتہائی صحت مند رجحانات نے جنم لیا ہے۔ جدید نظم نگار نے مروجہ پیمانوں کو کہیں پیچھے چھوڑ کر نظم کو کھلی فضاؤں میں سانس لینے کا ہنر سکھایا"۔ یہ ہے وہ نظریہ جس نے نظم کو بے محابہ وسعتوں کا جواز عطا کیا ہے۔ اس بات سے قطعی مفر نہیں کہ واقعی نظم کی وسعت نے اردو کا دامن فکری اعتبار سے بھر دیا ہے لیکن نظم میں زبان و بیان کے سرعت پذیر تجربات نے کچھ ایسے نقصانات بھی باہم پہنچائے ہیں جن کا ذکر بھی جدیدیت پسند برداشت نہیں کرتے۔ نقاد جدید تنقیدی زاویے تراشنے میں اس لیے کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا کہ نظم کی آئے دن بدلتی صورت اس کی تنقیدی نگاہ کو کہیں ٹھہرنے کا موقع نہیں دے رہی — اور اس طرح پرکھ جانچ کا معیار متاثر ہو رہا ہے ہماری بعض انتہائی صحت مند جدتوں کے ساتھ ایک بڑا المیہ رہا ہے۔ ادب کی کسی صنف کے نظام میں جونہی کوئی مثبت تبدیلی آتی ہے اور اس تبدیلی کے نتیجے میں وہ نظام پذیرائی حاصل کرتا ہے تو طالع

Scanned by CamScanner

آزماؤں کا ایک پریشر گروپ اسی جانب دوڑ پڑتا ہے اور پھر جو حشر ان جدید فکری رویوں کا ہوتا ہے، وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ زیادہ دور نہ جائیے ہم نے علامت اور تجریدکا یہ حال کیا۔ کہانی اس طرح مبہم اور بے معنی ہو گئی کہ چار دانشور مل کر بھی کہانی کے مرکزی پیغام کو دریافت نہ کر سکے اور جب ہم سے پوچھا گیا تو ہم نے اس فلسفے کا سہارا لیا کہ ادب عام قاری کے لیے نہیں بلکہ ''طبقہ دانشوران'' یا intellegentia کے لیے لکھتا ہے کیونکہ عام قاری کا علم حرف مفقود ہے۔ ہم نے غزل کے پندار پر چھاؤڑے چلائے لیکن یہ ہوا کہ غزل کی شکل تو اپنی جگہ قائم رہی۔ ہماری کوششوں سے جو شعری نمونے نمودار ہوئے وہ غزل کی مبادیات پر کسی طرح پورے نہیں اترتے۔ ہاں ایک اور چیز ضرور ایجاد ہوگئی۔ نظم کے ساتھ ہمارے سلوک کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں   لیکن نظم میں ایک کمال ضرور ہوا کہ چند باشعور لوگوں نے انتہائی سنجیدگی سے نظم کو تمام تر فکری نظامِ روایت کے ساتھ اس طرح جدید رنگ میں ڈھالا کہ اس کی پیشکش یعنی presentation قاری کے لیے ایک خوشگوار بلکہ دلکش تجربہ اور مطالعہ بن گئی۔ فیصل ہاشمی اگرچہ جوان شاعر ہے لیکن وہ نظم کی دنیا میں شعر کے گہرے مطالعے کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اس نے اپنے قاری کے لیے اس وجہ سے حیرتیں تراشی ہیں کہ اس کی عمر کے نئے لکھنے والے ابھی الفاظ لکھنے کے وہ طریقے تراش رہے ہیں جن سے انہیں ''جدید نظم گو'' کی طرح پہچانا جائے۔ ''کسی حیران ساعت میں'' کا مطالعہ میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ ہے کیونکہ فیصل کی شاعری سے ایک بات کھل کر سامنے آئی کہ اسے نظم کی روایات، الفاظ کے صوتی و معنی تصور و تفہیم اور جدید تر زندگی کے میکانکی رخ کا پورا پورا شعور ہے۔ اس کی شاعری کا فکری انضمام گھاوٹ کی بجائے فطری ردعمل کے تار و پود سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے فکر و خیال کے تمام مراحل میں زبان و بیان کے خوبصورت کلاسیک کو پس منظر میں چھوڑنے یا ماضی میں دھکیل دینے کی کوشش نہیں کی، اور مختصر نظم میں وہ پورے کا پورا ابلاغ تخلیق کیا جس کے لیے طویل نظم درکار تھی لیکن وہ اس بات کا پورا شعور رکھتا ہے کہ نایاب موسیقی کے دور میں کچے راگ الاپنے والے کہیں پیچھے رہ

جاتے ہیں۔ اس نے پاپ کے راگ کے ساتھ تال میل جوڑے ہیں اور جدید ترین نظم نگار ہونے کے باوجود مجھ جیسے روایت پسند قاری کو بھی اپنی فنکارانہ چابکدستی اور زبان وبیان پر مکمل عبور کی وجہ سے سرشار کیا ہے اور ان تمام شعری ضرورتوں کا پورا خیال رکھا ہے جو اعتدال کی بنیاد بنتی ہیں۔

nostalgia نوسٹیلجیا اگرچہ ماضی قریب سے ہمارے ادب میں متفرق جھلکیاں دکھاتا رہا ہے۔ اور میر تقی میر سے لے کر افتخار عارف تک کہیں کھلے اور کہیں دبے دبے اس کی بازگشت ہمیں سنائی دیتی رہی ہے لیکن انتظار حسین اور ناصر کاظمی نے اس کی واضح راہیں متعین کی ہیں اور اس طرح نوسٹیلجیا نہ صرف اک ہر دلعزیز اصطلاح بنی بلکہ اس کے پیرامیٹر parameter اور ڈائمینشن dimension پر بھی لوگوں کی نظر پڑی۔ انتظار کے ہاں نفسیاتی نشان وہی ملتی ہے۔ ناصر کاظمی نے زیادہ کھل کر کہا کہ انبالہ ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے۔ فیصل ہاشمی بھی اپنے مرکز اور محور سے دور ہے اور home sickness کا شکار بھی ہے۔ مگر اس کا نوسٹیلجیا دھند میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی اداس آواز میں ہائے وائے کا تاثر نہیں ملتا، بلکہ فیض سا اک لطیف پیچ ملتا ہے۔ پردیس کو فیصل ہاشمی نے اک ضرورت سمجھ کر قبول کیا ہے اور یادوں کو کسک کے محدود پنجرے میں بند رکھا ہے۔

''اندیشہ'' میں وہ کہتا ہے:

میں یہی سوچ کے
کل رات نہیں سویا، اگر
نیند پھر آئی تو در خواب کا کھل جائے گا
اور کتنے ہی عذابوں کا ستم بار ہجوم
صف بہ صف بڑھتا ہوا میری طرف آئے گا

فیصل کی نظم ''پہچان'' اک دوسرا رخ یعنی شدید احساس کا منظرنامہ پیش کرتی ہے۔ آپ بھی لطف اٹھائیں:

Scanned by CamScanner

کسی بھی موڑ پہ رک کر جو پیچھے دیکھا ہے
تو ایک یاد ملی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی
تو ایک رات ملی سوگوار، سہمی ہوئی
تو ایک خواب ملا در بدر بھٹکتا ہوا
اور ایک جسم ملا جس کے سر کے بالوں میں
گزرتے وقت نے لمحوں کی راکھ ڈالی ہے
وہ جسم میرا نہیں ہے تو پھر وہ کس کا ہے

اس کی نظم ''کئی لمحے ....'' میں بے ساختگی اور اظہار کا فطری بہاؤ کمال کا ہے۔ اس نظم میں بھی یادیں موجود ہیں اور یہ یادیں بڑی سادہ اور معصوم سی ہیں۔ ان یادوں میں کھو کر وہ درد یا سینے میں جلن کا شاکی نہیں ہوتا بلکہ یہ یادیں اسے لطف دے جاتی ہیں۔ وہ گذرے لمحوں کا تقابل اپنے حال سے نہیں کرتا۔ حال اور ماضی اس کے نزدیک دو الگ منظر ہیں اور وہ ایک وقت میں صرف ایک منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ نظم کیا ہے ایک پوری کہانی ہے۔ آغاز ایک پر لطف یاد سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ''وقت'' سے مکالے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور یہ مکالمہ بھی کیا ہے۔ اڑتے ہوئے لمحوں کی کہانی کا فلسفہ ہے۔ شاعر وقت سے گذرے ہوئے لمحے واپس مانگتا ہے مگر یہ لمحے کلائی پر بندھی گھڑی کے محتاج نہیں۔

تمہیں معلوم ہے جب بھی
پرانے یار
گلیوں کی
یونہی بے سود باتوں میں
کئی گھنٹوں کی بے مصرف
نشست رائیگاں کو

یاد کرتے ہیں
تو کتنا لطف آتا ہے!
پرانے گھر میں گذرے پل
اور ان میں
سب ہی اور ان ہی
باتوں کو جب دہرایا جاتا ہے
تو کتنا لطف آتا ہے
"وقت" اس سے اس طرح ہمکلام ہوتا ہے
کئی لمحے
کلائیوں پہ بندھی گھڑیوں سے باہر ہیں
انہیں میں کیسے واپس دوں
انہیں میں کیسے لوٹا دوں

فیض کی ڈکشن یا شعری اسلوب کو شاید ہی آج تک کسی نے برتنے کی کوشش کی ہو کیونکہ اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ فیصل نے لاشعوری طور پر ایک ایسا شعری رویہ اپنایا ہے جس کے تانے بانے فیض کے طرز احساس سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی نظم "تخلیق" پر اک نظر ڈالئے اور پھر کہیے کہ میرا مشاہدہ ٹھیک ہے یا غلط۔

رات کی راہ سے ہٹ کر، کسی غم خانے سے
چاند چپکے سے نکل آیا تھا
کتنی کلیاں تھیں جو ذہنوں میں مہکتی دیکھیں
برف کے ایک پگھلتے ہوئے سناٹے میں
کتنی صدیاں تھیں جو خاموش گذرتے دیکھیں
اپنی ہی آگ میں جلتے ہوئے پیڑوں پہ اگر

Scanned by CamScanner

اس گھڑی بور جو اترا تو جنم ہوگا ضرور
ایسی نظموں کا جو مہکار میں ڈوبی ہوں گی

اس کی نظم ''آخری ملاقات'' میرے نزدیک امیجری کی وہ کیفیت ہے جسے محسوس کیا جا سکتا ہے، لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ محض پانچ مصرعوں میں پوری کی پوری کہانی کہہ ڈالنا خونِ جگر کا متقاضی ہے۔ شام، دھوپ، جنگل، سورج جیسا متضاد منظر فیصل نے اک نظم بلکہ مختصر نظم میں اس طرح اکٹھے کیے ہیں کہ وہ اک دوجے میں پیوست ہو کر ابلاغ کا شاہکار بن گئے ہیں۔ قاری کی visualization کو فیصل نے انتہائی چابکدستی سے متحرک کیا ہے۔

دور تک پھیلے ہوئے ایک گھنے جنگل میں
دو شجر کھینچ کے سایوں کو جہاں ملتے ہیں
اس جگہ دھوپ بھی سورج سے ملا کرتی ہے
اوڑھ کر شام کی پھولوں بھری چادر اکثر
جیسے دو شخص بچھڑنے کے لیے ملتے ہیں

فیصل کے اسلوب میں بڑے واضح اشارئیے ملتے ہیں۔ رات، خواب، نیند، شام، جسم، درخت اور پتے، راہ اور رستے وہ استعارے ہیں جن کو فیصل نے بار بار استعمال کیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ ہر خیال میں یہ استعارے اپنے نئے اور بھرپور معنی سے بھرپور ہوتے ہیں اور قاری کے قلب و نظر کو سیراب کر جاتے ہیں۔

فیصل ہاشمی کے پاس وافر اور صحت مند شاعرانہ اہلیت موجود ہے۔ ''کسی حیران ساعت میں'' اس کی مختصر نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اسے نظر اگلی منزلوں پر اس طرح رکھنی ہے کہ تعریف و توصیف کے مصنوعی جھکڑ اس کا پینڈا کھوٹا نہ کر پائیں۔

Scanned by CamScanner

بشریٰ پروین

پکے کوٹھے

دینو کی فکر دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر روز ٹھیکیدار کا آنا اور جگہ خالی کرنے کا تقاضا کرنا اس کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیتا تھا۔ رات انہی سوچوں میں گزر جاتی کہ جوان بیٹیوں کو لے کر اب کہاں پڑاؤ ہو گا۔

دینو ان خانہ بدوشوں میں سے ایک تھا جنہوں نے نالے کے کنارے دو مہینے پہلے پڑاؤ ڈالا تھا۔ وہ روز روز کے اس اجڑنے اور بسنے سے تنگ آ چکا تھا۔ یہ جگہ اس نے خود منتخب کی تھی کیونکہ یہاں دور دور تک آبادی نہ تھی، پانی بھی قریب تھا اور مال مویشیوں کے لیے چارہ بھی کافی تھا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ گاڑیوں میں آئے اور بڑے بڑے فیتوں سے پیمائش کرنے لگے پوچھنے پر بتایا کہ یہاں سے سڑک نکلے گی اور تم لوگوں کو یہ جگہ خالی کرنی پڑے گی۔ دینو پر یہ خبر بجلی بن کر گری گو دوسرے لوگ اتنے پریشان نہ ہوئے اور ان میں سے کچھ نئے پڑاؤ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ دینو اور اس کی بیوی جلد از جلد دونوں بیٹیوں کے بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔

رانی: کیا بات ہے ابھی تک سوئے نہیں؟

دینو: تو بھی تو ابھی تک جاگ رہی ہے۔

رانی: ہاں، پھکروں (فکروں) نے تو نیند ہی کمبخت اڑا دی۔

دینو: تجھے اتنی پھکر ہے تو جا کر بھائی سے بات کیوں نہیں کرتی کہ ایک کڑی کو وہیا لے۔

رانی: کہتے ڈرتی ہوں جب سے اس نے پکا کوٹھا چھت لیا ہے کچھ اوکھا، اوپرا سا ہو گیا ہے۔ پاپی تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی۔

دینو: جو کچھ بھی ہو بات تو تجھے کرنی ہی پڑے گی۔ میں جوان لڑکیوں کا ساتھ اور زیادہ

Scanned by CamScanner

برداشت نہیں کر سکتا۔

رانی: ارے ایسا کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جو باپ کی بھی تو چار کو ہاں ماں بھی ... اس کو نہ تھی۔

دینو: بچے ہوگے، وہ پچھلے (وقت) اور تھا۔ زمانہ اتنا گھر آپ نہ تھا۔ لوگوں کے ویہوں میں کوئی داج رسم تھی۔ میں پکڑ نہ جاتوں صبح سویرے گاڑی ... کر بھائی سے بات کر۔

رانی: چل اگر وہ مان بھی جائے اور آج کل کے رواج میں داج مانگ بیٹھا تو کیا ہوگا۔

دینو: تو سیدھے کہہ دینا کہ نہ تیری جناتی داج لائی تھی اور نہ ہی میں لے کر گئی۔ قبیلے میں بھی کسی نے داج نہیں دیا۔

رانی: چل یہ بھی کر دیکھتے ہیں۔

دینو صبح سویرے رانی کو روانہ کر کے بستی چلا گیا تاکہ کوئی مزدوری دیکھ سکے۔ بازار میں پہنچتے ہی اس کی ملاقات ٹھیکیدار سے ہوگئی۔ ٹھیکیدار چالیس، پینتالیس کے لگ بھگ تھا لیکن اچھے اور سلجھے مزاج کا مالک تھا۔ دینو کو دیکھ کر پہچان گیا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلا لیا۔ دینو کو مزدوری پر رکھ لیا اور دوسرے تقریباً پچاس مزدوروں کے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔ یہ اسی سڑک کا کام تھا جس نے دینو اور اس کے قبیلے کو اجاڑنا تھا۔

شام کو دیہاڑی لیتے وقت دینو نے حوصلہ اور ہمت یکجا کر کے ٹھیکیدار سے کہا۔

دینو: سرکار، یہ سڑک ہماری جھگیوں کی بجائے کہیں اور سے نہیں گزر سکتی۔ ہم غریبوں نے بڑی مشکل سے یہ جگہ ڈھونڈی تھی۔

ٹھیکیدار: ارے پگلے سروے گورنمنٹ نے کیا ہے یہ کام سرکار کا ہے کہ کہاں سے سڑک گزرے اور کہاں سے نہیں، میں اور تو تو دیہاڑی کے مزدور ہیں۔

Scanned by CamScanner

دینو: پر جناب آپ ہم غریبوں کی عرج تو سرکار تک پہنچا سکتے ہیں ناں۔

ٹھیکیدار: تم لوگوں کو ایسا کیا مسئلہ ہے، تمہاری تو ایک جھگی ہی اکھڑے گی، یہاں تو سرکاری سروے میں پکے مکان آ جائیں تو ان کو بھی گرا دیا جاتا ہے۔

دینو: آپ کی بات ٹھیک ہے جناب، ایک زمانہ تھا کہ ہمیں بھی پرواہ نہ تھی۔ ایک دن جھگی ڈالی اور دوسرے دن پٹ کے دوسرے علاقے میں نکل گئے۔ تب جوانی تھی بال چھوٹے تھے، اب جوان کڑیوں کا ساتھ ہے سمجھ نہیں آتا کہ کیا کریں۔

دینو یہ کہتا ہوا پیسے جیب میں ڈالنے لگا اور ٹھیکیدار کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اگلے دن سورج ڈھلے رانی واپس لوٹی اور دینو کو دیکھتے ہی رونے لگی جیسے ہمدردی اور دکھ سکھ بانٹنے والا یہ غیر شخص اپنے خون کے رشتوں سے زیادہ قریب ہے۔ دینو سمجھ گیا کہ بھائی اور بھابی نے انکار کر دیا ہوگا۔ اسی لیے آتے ہی رونے لگی ہے۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر باہر سردار کی جھگی میں چلا گیا جہاں سارے جمع تھے اور نئی جگہ کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے۔

دینو کی دونوں بیٹیاں ساری بستی سے جدا تھیں۔ لمبے بال، سانولی چمکتی رنگت، تیکھے نین نقش، خوبصورت تو نہ تھیں لیکن وہاں ضرور پہنچتی تھیں، خوبصورتی کی حد جہاں سے شروع ہوتی ہے۔ بڑی شانو اور چھوٹی ملکہ۔ ملکہ بڑے بخار کی وجہ سے چلنے سے معذور تھی اور بیساکھیوں پر چلتی تھی لیکن شانو اپنی جوانی کے مسحور کن انداز کے ساتھ پوری بستی میں ہلچل مچاتی رہتی۔

ایک دن ٹھیکیدار نے موقع دیکھ کر دینو سے کہا۔

ٹھیکیدار: دینو تو کڑیوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتا۔ کیوں بوجھ اٹھائے پھرتا ہے؟

دینو: شادی کرنے کو تو سرکار آج ہی کر دوں پر کوئی ور بھی تو ملے۔

ٹھیکیدار: کیوں تیرے قبیلے اور ذات برادری میں کوئی لڑکا ان کے جوڑ کا نہیں؟

دینو: لڑکے تو ہیں سرکار (اپنی چادر سے منہ پر جمی مٹی اور پسینہ پونچھتے ہوئے) پر میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹیوں کو اپنے جیسوں میں نہ بیاہوں۔ کوئی جگہ ٹھکانہ ہو لڑکے کا۔ میرا سالا گوجر خان میں رہتا ہے پکے کوٹھے میں، اس میں اپنا کھوکھا بھی لگا

لیا ہے۔ بیٹے کو ریڑی لگا کر دی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی جنانی کو بھیجا تھا اس کے پاس، پر وہ کہتا ہے کہ لڑکی کے ساتھ پچیس ہزار لوں گا۔ اب آپ ہی بتائیں سرکار میں جو دیہاڑی لگاتا ہوں رات کو کھا مر لیتے ہیں اب اتنی رقم میں کہاں سے لاؤں۔

ٹھیکیدار: کچھ سوچتے ہوئے ------ دیکھ دینو میں تجھ سے جو بات کرنے لگا ہوں وہ غور سے اور ٹھنڈے دل سے سن۔ شہر میں میرا گھر ہے۔ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی بیاہی ہوئی ہے اور دونوں لاہور میں رہتے ہیں۔ میرا چھوٹا بیٹا بڑا اکڑیل جوان ہے لیکن ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ میں نے اپنے مکان اپنے بیٹے کے نام کر دیے ہیں۔ میری بیوی مر گئی ہے اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی لڑکی گھر لے آؤں جو میرا گھر سنبھالے اور میرے بیٹے کو بھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس بس اگر تو کہے تو میں تیری بیٹی کو بہو بنا کر گھر لے آؤں۔

دینو ٹھیکیدار کی بات سن کر سکتے میں آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹھیکیدار کو کیا جواب دے کہ اتنے میں ٹھیکیدار بولا۔

ٹھیکیدار: ارے دینو تو تو گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے رے، اتنا نہ سوچ اس سے اچھا گھر اور رشتہ تجھ کو نہیں ملنا اور نہ ہی آج تک تیرے قبیلے کی کوئی لڑکی اتنے اچھے گھر بیاہ کر گئی ہوگی۔ دیکھ تو اگر اپنی لڑکی میرے بیٹے کو دے گا تو میں تجھے تین ہزار روپے بھی دوں گا۔ تیری بیٹی کو زیور اور بارات کو کھانا بھی۔

دینو: سرکار بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے لیکن اپنی جنانی سے صلاح نہ کر لوں، کل آپ کو جواب دے دوں گا۔

دینو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا جھگی میں داخل ہوا اور رانی کو بلانے لگا۔

دینو: رانی [illegible] ؟

رانی: چینکتا کیوں ہے، جرا آنکھ لگ گئی تھی، کیا ہے؟

دینو: ٹھویاں کہاں ہیں؟

رانی: یہیں کہیں ہوگی پر بات کیا ہے تو کچھ پریشان لگ رہا ہے مجھ کو۔

دینو نے ٹھیکیدار کی ساری باتیں رانی کے سامنے دہرا دیں۔ رانی رونے لگی اور کہنے لگی۔

رانی: کیا پیسے کی کھاتر بیٹی کو اندھے کے ساتھ تور دے گا۔ ارے لعنت بھیج ایسے پیسے پر ہمیں نہیں چاہئیں، بس اہم گریبوں کی مجبوری سے فیدا (فائدہ) اٹھانا چاہتا ہے۔

دینو: بکواس بند کر اور میری بات گور سے سن۔ میں ٹھیکیدار کو ملکہ کے لیے ہاں کر دیتا ہوں۔ تو جا کر اپنے بھائی کو کہہ آ کہ وہ بھی جمعے کو بارات لے آئے ہم اس کو پچی ہجار دیں گے اور بچتا پچ ہجار لے کر کسی دوسرے شہر نکل جائیں گے اور اپنا کھو کھا لگا لیں گے۔

رانی کچھ سوچتے ہوئے......

رانی: دیکھ لے دینو کہیں ٹھیکیدار کو پتہ چل گیا تو ہماری شامت لے آوے گا۔

دینو: تو اس کی پھکر نہ کر۔

رانی کو گوجر کھان بھیج کر دینو خود سیدھا ٹھیکیدار کے گھر پہنچ گیا اور اس کو کہنے لگا......

دینو: ہمیں یہ رشتہ منجور ہے سرکار۔ میں تو رات بھر سو نہ سکا کہ اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ رشتہ کیسے نبھاؤں گا۔ ٹھیکیدار نے یہ سن کر اپنے بیٹے کو آواز دی۔

ٹھیکیدار: انور بیٹے یہاں آؤ۔ ان سے ملو یہ تمہارے دینو چاچا ہیں رات کو میں نے تم سے بات کی تھی یہ وہی ہیں۔

دینو ٹھیکیدار کا گھر دیکھ کر حیران اور پریشان تھا۔ ایسی جگہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے سالے کا گھر تو ٹھیکیدار کی بھینس کی کوٹھڑی جیسا بھی نہ تھا اور پھر انور، انور تو بالکل شہزادہ لگ رہا تھا۔ دینو نے اٹھ کر انور کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ٹھیکیدار سے کہنے لگا۔

Scanned by CamScanner

دینو: سرکار جمعے کو بارات لے آیئے گا میری جنانی اپنے بھائی کے گھر گئی ہے اس کو کہنے، وہ بھی جمعے کو بارات لائے گا میں چاہتا ہوں کہ ایک ہی دن دونوں بچوں سے آزاد ہو جاؤں۔ سرکار ———— دینو کچھ کہتے کہتے رک گیا جیسے شرما رہا ہو۔ ٹھیکیدار نے بھانپ لیا اور پوچھا۔

ٹھیکیدار: ہاں ہاں کہو دینو کیا کہنا چاہتے ہو۔

دینو: (پسینہ پونچھتے ہوئے) سرکار میری گھر والی کہہ رہی تھی کہ بھائی کو رقم پہلے دینی پڑے گی تب وہ نکاح کرے گا اگر ہو سکے تو پیسے آپ پہلے دے دیں۔

ٹھیکیدار: ارے دینو تو بالکل فکر نہ کر تو اب میرا بھائی ہے رقم کل سویرے تجھے پہنچ جائے گی تو بے پروا ہو جا۔

دینو: ایک عرج اور ہے جناب، وہ ہمارا رواج ہے کہ کڑی کو ڈولی میں ہدیا کرتے ہیں اگر جناب کو اتراج نہ ہو تو ہم اپنی بیٹی کو ڈولی میں ڈال کر لائیں۔

ٹھیکیدار: ارے جیسی تیری مرضی، تو اپنے ارمان اور رواج پورے کر میری طرف سے پوری آزادی ہے تجھے۔

ٹھیکیدار نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر دینو کو دیا اور کہنے لگا۔

ٹھیکیدار: لے یہ پیسے رکھ اور میری طرف سے اپنی برادری کا منہ میٹھا کرا دینا۔

دینو ہزار کا نوٹ دیکھ کر چکرا سا گیا۔ اس نے آج سے پہلے پانچ سو اور ہزار کے نوٹ دیکھے ضرور تھے لیکن ہاتھ میں کبھی نہ لیے تھے۔ کچھ ہچکچاتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ تھام لیا اور اجازت لے کر روانہ ہوا۔

شام کو رانی بھی واپس آ گئی اور دونوں میں کچھ صلاح مشورہ ہونے لگا۔ دوسرے دن صبح سویرے ٹھیکیدار کے ایک نوکر نے آ کر دینو کو تیس ہزار روپے دیے اور دلہن کا سرخ جوڑا اور کچھ زیورات بھی اور کہا کہ "ٹھیکیدار صاحب نے کہا ہے کہ کھانا ہم پکا پکایا لے آئیں گے تم فکر نہ کرنا"۔

دینو اور رانی خوشی اور حیرانی سے گونگے ہو گئے۔ قبیلے میں کسی کو خبر تک نہ ہونے

دی۔ جمعرات کی رات دینو نے رانی سے کہا کہ اپنا ضروری سامان باندھ کے لڑکیوں کو ڈولی میں ڈالتے ہی ہم بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔

جمعے کی دوپہر بستی میں اپنے لوگوں پر بجلی گری جب دینو کی جھگی کے باہر شامیانے کرسیاں اور دیگیں اتریں۔ سب لوگ حیران پریشان آ کر دینو سے پوچھنے لگے۔ دینو ہر ایک سے معذرت کرتا اور یہی کہتا "بس نصیبوں کی بات ہے دونوں کڑیوں کے ور اچھے مل گئے تو میں نے ہاں کر دی۔ کھانا سب لوگ یہیں کھانا"۔

شام کو رانی کا بھائی اپنے بیٹے کی ڈولی لے کر چلا تو دینو نے وعدے کے مطابق اس کو رقم دی اور رخصت کیا۔ اور دوسری طرف ٹھیکیدار نے اجازت مانگی تو ڈولی تیار کر لی گئی۔ ٹھیکیدار نے اپنے بیٹے کو گاڑی میں بھیج دیا اور خود ڈولی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دینو اور رانی خوش بھی تھے اور اداس بھی، کچھ فاصلے تک ڈولی کے ساتھ ساتھ گئے اور پھر واپس آ گئے۔ ملکہ کی بیساکھیاں ایک بچے کے ہاتھ روانہ کیں۔ ڈولی ٹھیکیدار کے گھر پہنچی تو سب ٹھیکیدار کو مبارک باد دینے لگے۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ اس کے بیٹے کو سہارا مل گیا تھا۔ اس کی فکریں اور پریشانیاں کسی اور کے سر منتقل ہو گئی تھیں۔

ٹھیکیدار کی بیٹیاں ڈولی کا پردہ اٹھا کر بھابی کو نیچے اتارنے لگیں لیکن وہ ساکت بیٹھی سسکیاں لیتی رہی۔ دینو نے جس بچے کے ہاتھ بیساکھیاں بھیجی تھیں وہ ہانپتا ہوا آ کر پہنچا اور کہنے لگا۔

"ملکہ کی بیساکھیاں لے لو دینو چاچا نے بھیجی ہیں ان کے بغیر یہ چل نہیں سکتی"۔ ٹھیکیدار دھڑام سے کرسی پر گرا اور سوچنے لگا۔ اپنے بیٹے کے لیے کیسا بے سہارا، سہارا لے کر آیا ہوں۔

ٹھیکیدار نے اپنا ملازم دینو کو بلانے بھیجا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ قبیلے والوں نے اس کو بتایا کہ وہ تو اپنی بیٹیوں کے ساتھ ہی کہیں چلا گیا ہے۔

Scanned by CamScanner

قلمی معاونین

بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان	ریکٹر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
عبدالعزیز ساحر	شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر فرمان فتح پوری	سی-28، بلاک 13-D، گلشن اقبال، کراچی
ڈاکٹر نوازش علی	صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، اصغر مال، راولپنڈی۔
ادیب سہیل	ڈی-159، بلاک 7، گلشن اقبال، کراچی۔
سید مظہر جمیل	79-B/1، خیابان بادبان، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز 7، کراچی۔
جلیل عالی	455، سٹریٹ 16، چکلالہ سکیم III، راولپنڈی۔
ڈاکٹر سعید بزرگ بیگدلی	دانش گاہ تربیت مدرس، تہران، ایران۔
بادشاہ منیر بخاری	شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور۔
عطاء الرحمٰن قاضی	شعبہ اردو، گورنمنٹ فریدیہ کالج، پاک پتن۔
محمد کیومرثی	شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی، ایران۔
ڈاکٹر علی انور	صدر شعبہ عربی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
وزیر آغا	58، سول لائن، سرگودھا۔
آفتاب اقبال شمیم	115، سٹریٹ 19، I-9/1، اسلام آباد

Scanned by CamScanner

تبسم کاشمیری	شعبہ اردو، اوساکا یونیورسٹی، جاپان۔
احسان اکبر	1130، سٹریٹ 41، G-10/4، اسلام آباد۔
نصیر احمد ناصر	250، سٹریٹ 6، بحریہ II، راولپنڈی۔
علی محمد فرشی	ملبوسات، رانی مارکیٹ، بنج بھانہ، راولپنڈی۔
رفیق سندیلوی	1218، I-10/4، اسلام آباد۔
انوار فطرت	روزنامہ جنگ، راولپنڈی
زاہد منیر عامر	شعبہ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔
پروین طاہر	897، سٹریٹ 50، فیز II، بحریہ ٹاؤن، راولپنڈی۔
سعید احمد	پی ایچ ڈی سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
داؤد رضوان	ایڈیٹنگ سیل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔
ناہید قمر	پی ایچ ڈی سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
ارشد معراج	شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، کہوٹہ۔
ڈاکٹر سرفراز ظفر	شعبہ فارسی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
الیاس بابر	ایم اے (انگریزی)، پہلا سمسٹر، NUML، اسلام آباد
سیدہ دوشین فاطمہ	ایم اے (انگریزی)، تیسرا سمسٹر، NUML، اسلام آباد
صائمہ نذیر	ایم اے (اردو)، دوسرا سمسٹر، NUML، اسلام آباد
فائزہ صادق	ایم اے (انگریزی)، چوتھا سمسٹر، NUML، اسلام آباد
سیما کوثر	ایم اے (انگریزی)، تیسرا سمسٹر، NUML، اسلام آباد

Scanned by CamScanner

ایم فل (پی ایچ ڈی) (انگریزی)، NUML، اسلام آباد

انجم ارشد

ایم اے (اردو)، دوسرا سمسٹر، NUML، اسلام آباد

ثوبیہ ناز

37۔ سٹریٹ 30، G-6/2، اسلام آباد۔

وقار بن الٰہی

2032، سٹریٹ 32، I-10/2، اسلام آباد۔

ایاز راہی

2011، سٹریٹ 32، I-10/2، اسلام آباد۔

احمد جاوید

171۔ بی، سٹریٹ 6، F-11/1، اسلام آباد۔

انور زاہدی

822، گلی نمبر 104، G-9/4، اسلام آباد۔

محمد حمید شاہد

کتاب مارکیٹ، آفس 17، گلی نمبر 3، اردو بازار، کراچی۔

مبین مرزا

امجد طفیل

بتوسط دستاویز پبلشرز، لاہور۔

محمد عاصم بٹ

40۔ اے، رمضان پلازہ، G-9 مرکز، اسلام آباد۔

ارشد چہال

پی ٹی وی، اسلام آباد۔

بشریٰ پروین

شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

حافظ محمد شفیق انجم

ایم اے (اردو)، چوتھا سمسٹر، NUML، اسلام آباد۔

میمونہ فاطمہ

ایم اے (اردو)، دوسرا سمسٹر، NUML، اسلام آباد

رشید امجد

صدر شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

عابدہ حنیف

شعبہ ترکی زبان، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

پی ایچ ڈی سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اکرام جمالی

687، سٹریٹ 6، G-9/3، اسلام آباد۔

8، سٹریٹ 42، F-8/1، اسلام آباد۔

پرتو روہیلہ	صدر نشین، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔
افتخار عارف	2029، سٹریٹ 32، I-10/2، اسلام آباد۔
اکبر حمیدی	ڈائریکٹر جنرل، اردو سائنس بورڈ، 299۔ اپر مال، لاہور۔
خالد اقبال یاسر	پی ٹی وی ہیڈ کوارٹر، اسلام آباد۔
علی اکبر عباس	پرنسپل، اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلبہ، I-8/3، اسلام آباد۔
خاور نقوی	7، سٹریٹ 4، سیکٹر III، ایئر پورٹ ہاؤسنگ سوسائٹی، راولپنڈی۔
سرور کامران	شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
آفتاب ثاقب	180، گلی نمبر 118، I-10/4، اسلام آباد
اختر عثمان	پی ایچ ڈی سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
اختر شاد	چیئرمین شعبہ کمپیوٹر سائنسز، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد۔
ڈاکٹر ملک سکندر حیات خیال	حرف اکادمی، راولپنڈی۔
کرنل سید مقبول حسین	برین نیٹ، کلب روڈ، سرگودھا۔
ارشد ملک	35، ریج روڈ، راولپنڈی۔
نور فاطمہ نور	دستاویز پبلشرز، لاہور۔
اشرف سلیم	شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
میجر غلام نبی اعوان	

ڈاکٹر نجمہ خان	صدر شعبہ فرانسیسی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
محمد ادریس چیمہ	ایم فل سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
محمد افضال بٹ	ایم فل سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
جاوید اقبال راجا	ڈپلوما (انگریزی)، NUML، اسلام آباد۔
عابد سیال	شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
سجاد حیدر ملک	شعبہ انگریزی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔
خواجہ غلام ربانی مجال	گلی نمبر 2۔ گلستان کالونی، راولپنڈی۔

Scanned by CamScanner

Takhliqi Adab

Issue - 1

National University of Modern Languages
Islamabad

Scanned by CamScanner